المملكة العربية السعودية
وزارة الشؤون الإسلامية والدعوة والإرشاد
وكالة المطبوعات والبحث العلمي

مختصر زاد المعاد

تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب

اردو

وزارة الشؤون الإسلامية والدعوة والإرشاد
وكالة المطبوعات والبحث العلمي

المكتبة الإلكترونية الإسلامية
Islamic Electronic Library

أكثر من ٣٠٠٠ مادة مقروؤة ومسموعة ومرئية بـ٤٦ لغة
More than 3000 readable,audible,and visual materials in 46 languages

تم تحميل الكتاب من موقع
المكتبة الإلكترونية الإسلامية

The book had been downloaded from
Islamic Electronic Library site

www.islamic-ebook.com
islamic.ebook@moia.gov.sa

وزارت اسلامی امور و دعوت وارشاد کی شائع کردہ
علامہ ابن القیم کی مشہور تصنیف ''زاد المعاد'' کی تلخیص

مختصر زاد المعاد

تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب

رحمہ اللہ تعالی

وزارت اسلامی امور ودعوت وارشاد کی شائع کردہ

علامہ ابن القیم کی مشہور تصنیف ''زاد المعاد'' کی تلخیص

مختصر زاد المعاد

تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب

رحمہ اللہ تعالی

ترجمہ

سعید احمد قمر الزماں

نظر ثانی

اسد اللہ عثمان مدنی

وزارت کے شعبۂ مطبوعات ونشر کی زیر نگرانی طبع شدہ

۱۴۳۸ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اس اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے

لقد كان لكم

في

رسول الله

أسوة حسنة

فہرست مضامین

عناوین | صفحات

۱-مقدمہ سعید احمد قمر الزمان ۲۰

۲-شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے مختصر حالات زندگی ۲۵

۳-علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف ۲۸

۴-مقدمہ امام ابن القیم ۳۳

۵-اللہ تعالی کو پاکیزہ وطیب چیزیں پسند ہیں ۳۸

۶-معرفت سنت کی ضرورت ۴۳

۷-نبی کریم ﷺ کے وضو کا طریقہ ۴۴

عناوین	صفحات
۸- نبی کریم ﷺ کی نماز کا طریقہ	۴۹
۹- نبی کریم ﷺ کا نمازوں میں قراءت کا طریقہ	۵۵
۱۰- نبی کریم ﷺ کے رکوع کا طریقہ	٦۰
۱۱- نبی کریم ﷺ کے سجدے کا طریقہ	٦۴
۱۲- نبی کریم ﷺ کے تشہد کا طریقہ	٦۸
۱۳- نبی کریم ﷺ کے سجدہ سہو کا طریقہ	۷۷
۱۴- نبی کریم ﷺ کی نماز کی سنتوں کا طریقہ	۸۳
۱۵- نبی کریم ﷺ کی نماز تہجد کا طریقہ	۸۷

عناوین	صفحات
۱۶- نبی کریم ﷺ کی نماز چاشت اور سجدہ تلاوت کا طریقہ	۹۶
۱۷- نبی کریم ﷺ کا یوم جمعہ میں اسوہ حسنہ	۱۰۰
۱۸- یوم جمعہ کی فضیلت وعظمت کا بیان	۱۰۶
۱۹- نبی کریم ﷺ کے نماز عیدین کا طریقہ	۱۱۰
۲۰- نبی کریم ﷺ کا سورج گرہن کے موقع پر اسوہ حسنہ	۱۱۴
۲۱- نبی کریم ﷺ کے نماز استسقاء کا طریقہ	۱۱۸
۲۲- نبی کریم ﷺ کا دوران سفر عبادتوں کا طریقہ	۱۲۳
۲۳- نبی کریم ﷺ کے تلاوت قرآن کا طریقہ	۱۲۹

عناوین | صفحات

۲۴- نبی کریم ﷺ کا مریضوں کی عیادت کا طریقہ ۱۳۲
۲۵- نبی کریم ﷺ کا صلاۃ خوف کا طریقہ ۱۴۷
۲۶- نبی کریم ﷺ کے اداء زکوۃ کا طریقہ ۱۵۰
۲۷- نبی کریم ﷺ کا اموال زکوۃ کی تقسیم کا طریقہ ۱۵۴
۲۸- نبی کریم ﷺ کا ادائے صدقات کا طریقہ ۱۵۸
۲۹- نبی کریم ﷺ کا رمضان میں روزے رکھنے کا طریقہ ۱۶۲
۳۰- نبی کریم ﷺ کا روزے کے بارے میں اسوہ حسنہ ۱۶۲
۳۱- نبی کریم ﷺ کا نفلی روزے رکھنے کا طریقہ ۱۶۹

عناوین صفحات

۳۲- نبی کریم ﷺ کے اعتکاف کا طریقہ ۱۷۳
۳۳- نبی کریم ﷺ کے حج اور عمرہ کا طریقہ ۱۷۸
۳۴- نبی کریم ﷺ کا قیام منی کے دروان معمولات واسوہ حسنہ ۲۱۴
۳۵- نبی کریم ﷺ کا سفر حج سے واپسی کا طریقہ ۲۱۷
۳۶- نبی کریم ﷺ کے قربانی اور عقیقہ کا طریقہ ۲۲۰
۳۷- نبی کریم ﷺ کے قربانی کے جانور کے انتخاب میں اسوہ حسنہ ۲۲۴
۳۸- نبی کریم ﷺ کے عقیقہ کا طریقہ ۲۲۷
۳۹- نبی کریم ﷺ کا نام وکنیت رکھنے کے متعلق سنت طیبہ ۲۲۹

عناوین | **صفحات**

۴۰- نبی کریم ﷺ کے انداز بیان اور گفتگو کا طریقہ ۲۴۳
۴۱- نبی کریم ﷺ کے ذکر و اذکار کا طریقہ ۲۵۶
۴۲- نبی کریم ﷺ کا گھر میں داخل ہونے کا طریقہ ۵۵۸
۴۳- نبی کریم ﷺ کا اذان میں اسوہ حسنہ ۲۵۹
۴۴- نبی کریم ﷺ کا کھانا کھانے کا طریقہ ۲۶۲
۴۵- نبی کریم ﷺ کے سلام اور اس کے جواب کا طریقہ ۲۶۹
۴۶- نبی کریم ﷺ کا اہل کتاب کو سلام کرنے کا طریقہ ۲۷۸
۴۷- نبی کریم ﷺ کا اجازت طلبی کا طریقہ ۲۸۰

عناوین	صفحات
۴۸- نبی کریم ﷺ کا چھینکنے میں اسوہ حسنہ	۲۸۵
۴۹- نبی کریم ﷺ کا دوران سفر اسوہ حسنہ	۲۹۰
۵۰- نبی کریم ﷺ کا خطبۃ الحاجہ میں سنت طیبہ	۲۹۷
۵۱- نبی کریم ﷺ کا خواب دیکھنے کے متعلق اسوہ حسنہ	۳۰۱
۵۲- نبی کریم ﷺ کی وساوس کے متعلق سنت طیبہ	۳۰۳
۵۳- نبی کریم ﷺ کا غصہ کے وقت کی تعلیمات حسنہ	۳۰۸
۵۴- نبی کریم ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ الفاظ وکلمات	۳۱۲
۵۵- نبی کریم ﷺ کا جہاد وغزوات میں اسوہ حسنہ	۳۱۶

عناوین	صفحات

٥٦- جہاد فی سبیل اللہ کے درجات ومراتب ٣٢٢

٥٧- جہاد میں مومن کامل کا امتحان ٣٢٦

٥٨- نبی کریم ﷺ کا دعوت اسلام اور صحابہ کا قبول اسلام ٣٣٥

٥٩- نبی کریم ﷺ کو ایذا رسانی اور آپ کا سفر طائف ٣٤٤

٦٠- نبی کریم ﷺ کے معراج کا واقعہ ٣٥١

٦١- نبی کریم ﷺ کی ہجرت مدینہ کا واقعہ ٣٦٠

٦٢- نبی کریم ﷺ کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری کی کیفیت ٣٧٦

٦٣- نبی کریم ﷺ کا مسجد نبوی کی تعمیر کا طریقہ ٣٨٢

عناوین	صفحات

۶۴- نبی کریم ﷺ کا مدینہ میں قیام اور جہاد کی مشروعیت ۳۹۱

۶۵- نبی کریم ﷺ کا جہاد میں اسوہ حسنہ ۴۰۳

۶۶- نبی کریم ﷺ کا قیدیوں کے ساتھ معاملہ کا طریقہ ۴۱۶

۶۷- نبی کریم ﷺ کا غنیمت کی زمین کی تقسیم کا طریقہ ۴۱۹

۶۸-امان، صلح میں اہل کتاب اور منافقین کے ساتھ معاملہ ۴۲۲

۶۹- نبی کریم ﷺ کا عقد ذمہ اور جزیہ وصول کرنے کا طریقہ ۴۳۸

۷۰- نبی کریم ﷺ کا تاحیات کفار و منافقین کے ساتھ معاملہ کا طریقہ ۴۴۵

۷۱- نبی کریم ﷺ کا صحابہ کرام کے ساتھ معاملہ کا طریقہ ۴۴۹

عناوین | صفحات

۷۲- نبی کریم ﷺ کے غزوات کا بیان	۴۵۱
۷۳-غزوہ بدر کا عظیم اور تاریخی معرکہ	۴۵۷
۷۴-غزوہ احد سے مستنبط مسائل	۴۶۶
۷۵-حمراء الاسد کا واقعہ	۴۹۱
۷۶-واقعہ افک کا بیان	۴۹۸
۷۷-غزوہ خندق کا بیان	۵۰۴
۷۸-صلح حدیبیہ کا بیان	۵۰۷
۷۹-صلح حدیبیہ سے مستنبط احکام ومسائل	۵۱۰

عناوین	صفحات
۸۰-غزوہ خیبر کا بیان	۵۲۳
۸۱-غزوہ خیبر سے مستنبط احکام ومسائل	۵۲۷
۸۲-غزوہ فتح مکہ کے عظیم واقعہ کا بیان	۵۳۵
۸۳-فتح مکہ سے مستنبط احکام ومسائل	۵۳۶
۸۴-غزوہ حنین کا بیان	۵۴۳
۸۵-غزوہ حنین سے مستنبط احکام ومسائل	۵۴۵
۸۶-غزوہ طائف کا بیان	۵۵۰
۸۷-غزوہ طائف سے مستنبط احکام ومسائل	۵۵۷

عناوین | صفحات

عناوین	صفحات
۸۸-غزوہ تبوک کا بیان	۵۶۲
۸۹-منافقین کی ایک سازش	۵۷۶
۹۰-مسجد ضرار کی تعمیر	۵۷۸
۹۱-مدینہ میں شاندار استقبال	۵۷۹
۹۲-غزوہ تبوک سے مستنبط مسائل	۵۸۱
۹۳-حضرت کعب بن مالک اوران کے رفقا کا واقعہ	۵۸۸
۹۴-واقعہ حضرت کعب سے مستنبط احکام ومسائل	۶۰۲
۹۵-غزوہ تبوک سے واپسی پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج	۶۱۳
۹۶-نبی کریم ﷺ کا طریقہ جسمانی علاج میں	۶۱۵

عناوین | صفحات

۹۷-نظر بد کا علاج	۶۱۵
۹۸-خود اپنی نظر لگنے کا علاج	۶۲۵
۹۹- نبی کریم ﷺ کا شدت مصیبت کے علاج کا طریقہ	۶۲۹
۱۰۰- نبی کریم ﷺ کا حزن وغم کے علاج کا طریقہ	۶۳۳
۱۰۱- نبی کریم ﷺ کا بے خوابی اور گھبراہٹ کے علاج کا طریقہ	۶۴۱
۱۰۲- نبی کریم ﷺ کا حفظان صحت کے سلسلہ میں اسوہ حسنہ	۶۴۴
۱۰۳- نبی کریم ﷺ کا کھانے پینے میں اسوہ حسنہ	۶۴۷
۱۰۴- نبی کریم ﷺ کا خوشبو کے استعمال میں اسوہ حسنہ	۶۵۱

عناوین | صفحات

۱۰۵- نبی کریم ﷺ کا فیصلوں اوراحکام میں اسوہ حسنہ ۶۵۳
۱۰۶- نبی کریم ﷺ کا تقسیم غنائم سے متعلق اسوہ حسنہ ۶۶۱
۱۰۷- نبی کریم ﷺ کا ہدایا وتحائف قبول کرنے کا طریقہ ۶۶۳
۱۰۸- نبی کریم ﷺ اموال واملاک کے تقسیم کا طریقہ ۶۶۵
۱۰۹- نبی ﷺ کا ایفائے عہد اور قاصدوں کے ساتھ معاملہ کا طریقہ ۶۷۲
۱۱۰- غیر مسلموں کو امان دینے اور پناہ دینے میں اسوہ حسنہ ۶۷۵
۱۱۱- نبی کریم ﷺ کا غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا طریقہ ۶۷۷
۱۱۲- نبی کریم ﷺ کا نکاح کے متعلق اسوہ حسنہ ۶۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

سرور کائنات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ایسا سدا بہار موضوع ہے جس پر بے شمار لوگوں نے مختلف زبانوں میں لکھا ہے اور قیامت تک اس سعادت عظمیٰ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ چونکہ یہ موضوع ایسا دل آویز اور جاذب نظر ہے کہ ان گنت سیرت نگاروں کی تحریریں، مختصر اور کئی ضخیم تالیفات سامنے آچکی ہیں، اس کے باوجود کبھی مضمون کی خشکی اور عدم دلچسپی کی شکایت پیدا نہ ہوسکی اور نہ کبھی پیدا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے اتنے گوشے ہیں اور ہر گوشے کے اتنے پہلو ہیں کہ کبھی کوئی یہ دعوی نہیں کرسکتا کہ اس موضوع کا حق ادا کردیا گیا اور اس بحر نا پیدا کنار سے سارے موتی نکال لئے گئے ہیں، چنانچہ ان خدمات وجذبات کے نتیجے میں ایسا گرانقدر ذخیرہ تیار ہوگیا، جس کی نظیر سیرت وسوانح کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس بے انتہا کثرت کے باوجود ایسی کتابیں معدودے چند ہی تھیں، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو ایسے انداز سے پیش کیا گیا ہو جو ایک مسلمان کے لئے اسوہ حسنہ ولائحہ عمل ثابت ہو، کیونکہ آپ کی ذات گرامی ہر مسلمان کے لئے اسوہ حسنہ، دلیل منزل، شمع راہ، اسلامی تعلیمات اور ہدایات کا مکمل نمونہ ہے اور جب

تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے نہ ہو اس وقت تک نہ ہم اسلام کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ صحیح طور پر اس پر عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہی سعادت وہدایت اور کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ خود قرآن حکیم نے اپنے اس فرمان سے اس کی نشاندہی کی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب:۲۱]

درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

اس لئے اسوہ حسنہ کے ہم اس وقت تک رمز شناس نہیں ہو سکتے جب تک آپ کی حیات طیبہ کے تمام پہلو ہمارے سامنے نہ ہوں۔

اور سیرت نبویہ علیہ الصلاۃ والسلام کے اس بحر ذخار میں امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''زاد المعاد فی هدي خير العباد '' سرفہرست رکھی جانے والی عظیم الشان کتاب ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ کو بطور اسوہ ونمونہ پیش کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور جس میں پوری جامعیت اور پوری تحقیق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی توضیح کی گئی ہے۔

چنانچہ مذکورہ کتاب کو آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ، اسوہ حسنہ، شب وروز کے معمولات، عادات، اخلاق، خصائل وشمائل، صفات وغزوات پر مشتمل انسائکلو پیڈیا

(ENCYCLOPAEDIA) قرار دیا جائے، تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔اس میں قرآن کی تفسیر بھی ہے، حدیث کی تشریح بھی، اور راویان حدیث پر جرح وتعدیل بھی اوران سے مستنبط فقہی مسائل بھی۔

اس وسیع تر معنویت، افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے زادالمعاد واقعتاً زادالمعاد ہی ہے، یعنی توشۂ آخرت۔ یہ کتاب اپنے انہی مجموعی محاسن کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کے حلقوں میں محبوب ومقبول رہی ہے۔

پیش نظر کتاب کی اس اہمیت وافادیت کی وجہ سے ایک عرصہ سے دل میں آرزو تھی کہ اردو میں بھی کوئی ایسی ہی کتاب سیرت نبویہ پر قلمبند کی جائے جس میں داعی اسلام کی حیات طیبہ کو اس طور سے پیش کیا جائے کہ ہر پڑھنے والے کے سامنے آپ ﷺ کی مجموعی زندگی آجائے کیونکہ ہمارے عوام نبی کریم ﷺ سے عقیدت ومحبت تو بہت زیادہ رکھتے ہیں مگر ان کی اکثریت آپ کے اسوۂ حسنہ کے خصوصاً ان پہلوؤں سے بالکل ناآشنا ہے جن کے بارے میں ایک مسلمان کو شب وروز ضرورت پڑتی ہے اور جن پرعمل کئے بغیر کوئی شخص سچا مومن نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی تلافی اس کتاب کے ترجمہ سے پوری ہوسکتی ہے۔اگرچہ اردو زبان میں اسلامی علوم ومعارف کا بیش بہا خزانہ موجود ہے، لیکن اس

کتاب کے ترجمہ سے ایک قابل قدر اور قیمتی سرمائے کا اضافہ ممکن ہے۔

یہ کتاب (زادالمعاد) چونکہ اپنی ضخامت وطوالت کے باعث ہر شخص کے مطالعہ میں بآسانی نہیں آسکتی اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کو مختصر کیا جائے اور وہ تمام مباحث نکال دیئے جائیں جو زیادہ تر علماء و محققین کے اختصاصات میں سے ہیں تاکہ براہ راست عوام بھی اس سے فیضیاب ہوسکیں۔

تاہم خوشگوار امر یہ ہے کہ اس ضرورت کو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے پورا کر رکھا تھا، اب محض اس کو اردو میں منتقل کرنے کا مرحلہ باقی تھا، چنانچہ میں نے اللہ تعالی پر بھروسہ کر کے اس مختصر مگر جامع انتخاب جو ''مختصر زادالمعاد'' کے نام سے متعدد بار شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے اور امام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے حسن انتخاب اور حسن ترتیب کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدہ وعقیدت اور نبی اکرم ﷺ کے حضور ان کی محبت واطاعت کا بے مثل شاہکار ہے نیز اصل ماخذ ہی کی طرح مقبول عام رہی ہے، پورے عزم وحوصلے اور عقیدت ومحبت کے جذبے سے سرشار ہوکر شروع کر دیا، اور آج بحمداللہ میں بجا طور پر فخر ومسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس معرکۃ الآراء ومفید کتاب کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ یہ کاوش عام قارئین کے ساتھ ساتھ علمی وفکری

حلقوں میں بھی قدر وعزت اوراعتراف وقبولیت کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔
میں اپنی اس حقیر کوشش کو محسن انسانیت ﷺ کی جناب میں خراج عقیدت تصور کرتا ہوں اوردلی تمنا رکھتا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے آپ کے سوانح نگاروں کی فہرست میں کسی جگہ اس خاکسار کا نام آجائے۔" گر قبول افتد زہے عزوشرف"۔
نیز اس ذہنی کاوش اور علمی خدمت سے قوی امید رکھتا ہوں کہ یہ میرے لئے سرمایہ حیات، صدقہ جاریہ اور۔" زادالمعاد" یعنی توشہ آخرت ثابت ہوجائے گی۔
آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے اوراسے ہماری اخروی زندگی کے لئے بہترین زادراہ وشمع ہدایت بنائے۔آمین!

رَبَّنَا تَقَبَّلُ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ.

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان التمیمی رحمۃ اللہ علیہ شہر عیینہ میں، جو مملکت سعودی عرب کے دارالسلطنت ریاض کے شمال کی طرف واقع ہے، ۱۱۱۵ھ میں خانوادۂ علم وفضل میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔

آپ کے والد ماجد علم وفضل، تقوی، طہارت، خلق وحیا اور بے شمار صفات حسنہ سے متصف تھے اور قاضی شہر تھے۔ آپ کے دادا شیخ سلیمان علاقہ کے مفتی اعظم تھے اور ان کا شمار اکابر علماء میں ہوتا تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد سے حاصل کی، پھر تحصیل علوم اسلامیہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ اور بصرہ وغیرہ کے سفر کیئے اور وہاں کے علماء ومشائخ سے مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اپنے وطن واپس آ کر دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتدریس میں پوری طرح مشغول ہوئے۔

آپ کو بچپن ہی سے علماء سلف کی کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ خاص طور پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا بڑے شوق وانہماک سے مطالعہ کرتے تھے۔

عہد طفولیت ہی سے آپ پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جذبہ غالب تھا، چنانچہ آپ لوگوں کو کتاب وسنت پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کی تاکید کرتے تھے اور خاص طور پر ان بدعات اور رسومات کو چھوڑنے کی ترغیب دیتے تھے جنہیں بدعقیدہ لوگوں نے عوام میں دین کے نام سے پھیلا رکھا تھا۔

امام موصوف نے مسائل توحید اور اس زمانے میں رواج پا جانے والی شرکیہ رسوم کے متعلق علماء عصر سے مباحثے کئے، لہذا متعدد علماء آپ کے قائل اور ہم خیال ہوئے، اس طرح وعظ وتبلیغ اور خطبات سے عوام الناس میں دینی بیداری پیدا فرمائی اور اتباع سنت کا جذبہ پیدا کیا۔

نیز مختلف امراء اور حکام کو اصلاحی خطوط لکھے جن میں دعوت الی اللہ کی وضاحت فرمائی اور شرک وبدعات کی برائیاں بیان کی، دلائل وبراہین سے اسلام کی حقانیت کو ثابت فرمایا اور احکام شریعت کے نفاذ اور اس سلسلہ میں جہاد کرنے پر معاہدہ فرمایا، اور پوری طرح دعوت وتبلیغ اور شرک وبدعت کو ختم کرنے میں مشغول ہوگئے، آپ کی ان کوششوں کے نتیجہ میں نجد کی سرزمین توحید سے منور ہوئی اور عوام توحید سے سرشار اور شرک وبدعت سے بیزار نظر آنے لگے۔

تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی دعوت کے اثرات وبرکات جزیرۃ العرب، یمن،

مصروشام ومراکش اور برصغیر تک پہنچ گئے۔عام مسلمانوں میں اصلاح عقیدہ کے سلسلہ میں بیداری پیدا ہوئی اور صحیح العقیدہ لوگ آپ ہی کی طرف منسوب کئے جانے لگے۔

آپ نے بہت سی مفید کتابیں تالیف کیں،جن میں اکثر وبیشتر توحید کی دعوت اور شرک کی تردید پر زور دیا گیا ہے۔ان میں سے چند مشہو تصانیف یہ ہیں:

۱-کتاب التوحید۔

۲-مختصر سیرۃ الرسول ﷺ۔

۳-مختصرزادالمعاد(پیش نظر کتاب)۔

۴-الاصول الثلاثۃ وادلتہا۔

۵-المسائل الجاہلیۃ۔

۶-کشف الشبہات۔

۷-الخطب المنبریہ۔

۸-عقیدۃ الفرقۃ الناجیہ

۹-اوثق عری الایمان۔

۱۰-تفسیر آیات القرآن الکریم۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں اور رسائل وفتاوی ہیں،جوشائع ہو چکے ہیں۔

آپ کی وفات سعودی عرب کے شہر ریاض کے قریب مقام درعیہ میں ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف

علامہ ابن القیم کی سوانح عمری یا تعارف کے لئے چند اوراق ناکافی ہیں، تاہم یہاں طوالت سے صرف نظر کرتے ہوئے مختصراً آپ کی حیات مبارکہ کے چند اہم اور روشن اوراق پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ کا پورا نام محمد بن ابوبکر بن ایوب بن سعد حریز الزرعی الدمشقی شمس الدین المعروف بابن القیم الجوزی ہے، جوزیہ ایک مدرسہ کا نام تھا، جو امام جوزی کا قائم کردہ تھا، اس میں آپ کے والد ماجد قیم یعنی نگراں اور ناظم تھے اور علامہ ابن القیم بھی اس سے ایک عرصہ منسلک رہے۔

علامہ ابن القیم ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور علم وفضل اور ادب واخلاق کے گہوارے میں پرورش پائی، آپ نے مذکورہ مدرسہ میں علوم وفنون کی تعلیم وتربیت حاصل کی، نیز دوسرے علماء سے استفادہ کیا جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام گرامی سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ ان کے شاگرد رشید کی حیثیت سے زندگی بھر رفیق صادق، قید خانہ کے ساتھی، میدان جہاد میں ان کے دوش بدوش اور استاذ کے بعد ان کے علوم کو نہایت قیمتی اضافہ کے ساتھ بہترین اسلوب پر شائع کرنے والے تھے۔

متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بعد ابن القیم کے پائے کا کوئی محقق نہیں

گزرا، آپ فن تفسیر میں اپنا جواب آپ تھے، اصول دین کے رمز شناس تھے، حدیث وفقہ میں نہایت گہری نظر رکھتے تھے، مصیبتوں اور ابتلاؤں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے، صبر وشکر کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے، شعر وادب کا اعلی اور عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ آپ ایک ماہر طبیب بھی تھے۔

علماء طب کا بیان ہے کہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب ''طب نبوی'' میں جو طبی فوائد، نادر تجربات اور بیش بہا نسخے پیش کئے ہیں، وہ طبی دنیا میں ان کی طرف سے ایک ایسا اضافہ ہیں کہ طب کی تاریخ میں ہمیشہ یادر کھے جائیں گے۔

قاضی برہان الدین کا بیان ہے کہ:

''اس آسمان کے نیچے کوئی بھی ان سے زیادہ وسیع العلم نہ تھا''

علامہ کے رفیق درس حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

'' ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی سماعت کی اور زندگی بھر علمی مشغلہ میں مصروف رہے، انہیں متعدد علوم میں کمال حاصل تھا۔ خاص طور پر علم تفسیر اور حدیث وغیرہ میں غیر معمولی دستگاہ تھی، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں یگانہ روزگار بن گئے، وہ اللہ کی عبادت وانابت کی صفت سے اس قدر متصف تھے کہ شاید ہی اس دور میں ان سے زیادہ کوئی عبادت گزار رہا ہو، استاد محترم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علوم کے صحیح وارث اور

ان کی مسند تدریس کے کماحقہ جانشین تھے“۔

چنانچہ علامہ موصوف نے اپنے استاد گرامی کی علمی خدمات اور علمی کارناموں کی توسیع واشاعت پر غیر معمولی حصہ لیا، ان کی طرف دعوت ودفاع کا فریضہ سرانجام دیا، اوراس کی تائید کے لئے تحقیق وتنقیح کی پوری کوشش کی، ان کی فقہی تحقیقات اوران کے فتاوی واصول کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا، بلکہ مزید تحقیق ومحنت سے قرآن وسنت کے دلائل سے مدلل کیا۔

اس طرح علامہ محترم نے بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جو ایک طرف علامہ ابن تیمیہ کے علم کا خلاصہ ہے اور دوسری طرف استاذ کی تحقیقات کے نتائج وثمرات میں علمی توجیہات کا بہترین لب لباب بھی۔ انہوں نے مختلف فنون وعلوم پر قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں فکر کی گہرائی، قوت استدلال، حسن ترتیب اور جوش بیان پورے طور پر نمایاں ہے، ان کتابوں میں کتاب وسنت کا نور اور سلف کی حکمت وبصیرت موجود ہے۔

ایک پہلو جو خاص طور پر ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کی شخصیت اور عقیدے کے متعلق واضح ہوتا ہے، وہ سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کی محبت، شیفتگی اور بدعت کی سخت مخالفت، جو چیز انہیں سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق نظر آتی ہے، اسے دل

وجان سے قبول کر لیتے ہیں، جو چیز سنت رسول کے خلاف نظر آتی ہے اسے جڑ سے اکھاڑ ڈالنے میں اپنی پوری توانائی صرف کر دیتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ نہ کسی کے ساتھ رعایت کرتے ہیں، نہ مصالحت اور نہ رواداری، ان کا دل حب رسول اللہ ﷺ کے نشہ سے سرشار تھا لیکن ان کی یہ محبت حدود سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ وہ کسی صورت اور کسی حیثیت میں بھی حب رسول کو جذبہ توحید سے متصادم نہیں ہونے دیتے تھے، ان کی توحید اتنی شدید، خالص اور واضح تھی کہ ان کے دشمنوں نے انہیں ہدف ستم بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، انہیں طرح طرح سے تکلیفیں دی گئیں، ان پر ناروا پابندیاں عائد کی گئیں، نظر بندی وجلا وطنی کے مصائب سے دو چار کیا گیا، انہیں قید وبند کی صعوبتوں سے گزارا گیا لیکن ان کے عزم واستقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

علامہ کی چند مشہور ومقبول تصانیف یہ ہیں:

(۱) تہذیب مختصر سنن ابی داؤد (۲) اعلام الموقعین (۳) مدارج السالکین (۴) زاد المعاد (۵) عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین (۶) مفتاح باب السعادۃ (۷) الفوائد (۸) الوابل الصیب (۹) تحفۃ المودود فی احکام المولود (۱۰) الصواعق المنزلۃ علی الجہمیۃ والمعطلۃ (۱۱) حادی الأرواح (۱۲) الصراط المستقیم (۱۳) جلاء الافہام فی ذکر الصلاۃ والسلام علی خیر الأنام (۱۴) شفاء العلیل (۱۵)

الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیہ(۱٦) إغاثۃ اللهفان من مصائد الشیطان (۱۷) الصلاۃ وحکم تارکہا (۱۸) التبیان فی أقسام القرآن (۱۹) أحکام اهل الذمۃ (۲۰) بدائع الفوائد (۲۱) الجواب الکافی (۲۲) تفسیر سورۃ الفاتحہ والمعوذتین (۲۳) أخبار النساء (۲۴) اجتماع الجیوش الاسلامیۃ (۲۵) زادالمعاد (جس کا اختصار اس کتاب کی شکل میں ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

ان کے علاوہ بھی کئی ایک گرانقدر تصنیفات ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

آپ کی وفات ۱۳ رجب ۷۵۱ھ میں ہوئی اور دمشق کے باب صغیر کے مقبرہ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کیئے گئے۔اللہ تعالی آپ کو درجات عالیہ اور رحمت ابدی سے نوازے۔آمین۔

بسم الله الرحمن الرحيم

مقدمہ امام ابن القیم

اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَالْقَائِلُ فِيهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾، وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ. أمابَعْدُ :

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تمام مخلوقات کی تنہا خالق اور مختار کل ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾[القصص:٦٨]

تمہارا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ان کا اس میں کوئی اختیار نہیں، اللہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

اس آیت کریمہ میں اختیار سے مراد منتخب اور برگزیدہ بنانا ہے اور ارشاد باری ﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اس اختیار میں بندوں کا کوئی دخل نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے تنہا مخلوقات کو پیدا کیا، اسی طرح وہ مقامات کو بھی بخوبی جانتا ہے،

جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

﴿ اللّٰہُ أَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَه﴾[الأنعام:١٢٤]

اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں نازل فرمائے۔

﴿وَقَالُوا لَوۡلَا نُزِّلَ هَـذَا الۡقُرۡآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيمٍ☆أَهُمۡ يَقۡسِمُونَ رَحۡمَةَ رَبِّكَ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُم مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِي الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجَاتٍ﴾[الزخرف:٣١،٣٢]

اوران لوگوں نے کہا کیوں نہیں نازل کیا گیا یہ قرآن ان دوشہروں کے کسی بڑے آدمی پر، کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنے والے ہیں، ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کررکھی ہے اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے درجوں کے اعتبار سے۔

یہاں اللہ تعالی نے مشرکین کے اختیار کی حیثیت کا انکار فرمایا ہے اور واضح کردیا ہے کہ یہ صفت انہیں حاصل نہیں بلکہ یہ صفت تو اس کی ہے جس نے ان کے معاش یعنی رزق کو تقسیم کررکھا ہے اور بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ارشاد باری تعالی ﴿سُبۡحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَى عَمَّا يُشۡرِكُونَ﴾ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ مشرکین کا شرک جس اختیار وتجویز کا متقاضی ہے اللہ تعالی کی ذات اس سے پاک وصاف ہے، اور چونکہ مشرکین کے اس طرح کے شرک سے کسی دوسرے خالق کا وجود نہیں ثابت ہوتا، اس لئے اس

آیت میں اس کی تردید نہیں کی گئی، اس کے بعد ایک اور آیت کریمہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَعَسَى أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ﴾

[القصص:٦٧]

البتہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کیا کرے تو امید ہے ایسے لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

جس طرح اللہ تعالی نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان میں سے انبیاء کرام کو منتخب فرمایا، یہ انتخاب واختیار اللہ تعالی کی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے مشوروں اور انتخاب واختیار کا کوئی دخل نہیں اور اللہ تعالی کا یہ انتخاب عام سارے عالم میں اس کی ربوبیت کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے اور اس کی وحدانیت، صفات کمال اور رسولوں کی سچائی کی کھلی دلیل ہے۔

اللہ تعالی نے فرشتوں میں بھی کچھ کو منتخب اور برگزیدہ بنایا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اے اللہ، جبرائیل ومیکائیل اور اسرافیل کے پروردگار، زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے، حاضر وغیب کے جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے اختلافات کا

فیصلہ کرے گا جس حق کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، تو اس میں میری رہنمائی فرما جس میں لوگوں کا اختلاف ہو گیا، تو جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔(۱)

اسی طرح اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کو منتخب فرمایا اور پھر ان انبیاء کرام سے رسولوں کو، ان رسولوں میں سے ان پانچ اولوالعزم کو منتخب فرمایا جن کا تذکرہ سورہ احزاب آیت ۷ اور سورہ شوری آیت ۱۳ میں موجود ہے، پھر ان میں سے اللہ تعالی نے بطور خاص حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما الصلاۃ والسلام کو خلیل منتخب فرمایا اور اس طرح اللہ تعالی نے بنی آدم کی اولاد میں اسماعیل علیہ السلام اور بنی کنانہ میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو، آخر میں بنی ہاشم میں سے سارے انسانوں کے سردار حضرت محمد ﷺ کا انتخاب فرمایا اور آپ کی امت کو ساری امتوں میں بہترین امت کے طور پر منتخب فرمایا ہے۔

مسند احمد میں معاویہ بن حیدہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ: ”تم سترویں امت ہو اور تم اللہ تعالی کے نزدیک سب سے بہتر اور باعزت ہو“ (۲)

(۱) دیکھئے: صحیح مسلم (۷۷۰)، ابوداود (۷۶۷)، ترمذی (۳۴۲۰) راویہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

(۲) صحیح۔ دیکھئے مسند احمد ۵/ ۵، اور مستدرک حاکم ۴/ ۸۴ حاکم اور امام ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

مسند بزار میں ابی الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ''اللہ تعالی نے عیسی بن مریم علیہ السلام سے فرمایا میں تمہارے بعد ایسی امت بھیجوں گا جو مسرت وخوشی کے وقت حمد وشکر سے، اور مصیبت وتکلیف کے وقت صبر واحتساب سے کام لے گی جب کہ کوئی علم وحلم نہ ہوگا، حضرت عیسی علیہ السلام نے سوال کیا کہ ایسا کس طرح ہوگا، اللہ تعالی نے فرمایا کہ میں انہیں اپنا علم اور حلم عطا کردوں گا''۔(۱)

(۱) حسن: دیکھئے مستدرک حاکم ۱/ ۳۴۸ اور شعب الایمان ۴۴۸۲ اور ۹۹۵۳.

فصل (۱)

اللہ تعالی کو اپنے لئے پاکیزہ چیزیں پسند ہیں

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالی نے ہر جنس میں سے زیادہ پاکیزہ چیز کا انتخاب فرمایا ہے اور اپنے لئے اسے مخصوص فرمالیا اور اختیار کرلیا۔ کیونکہ اللہ تعالی خود پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیزوں کو پسند کرتا ہے۔اس کی بارگاہ میں پاکیزہ وطیب ہی قول وعمل اور صدقہ وخیرات شرف قبولیت سے نوازے جاتے ہیں۔اسی سے بندہ کی سعادت وشقاوت کا فرق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ پاکیزہ شخص کے لئے پاکیزہ چیز ہی مناسب وموزوں ہوگی اور اسی سے اس کو سکون واطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔اسی طرح جو کلام بھی اللہ تعالی کے یہاں پیش ہوتا ہے،اس کا بھی طیب اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔وہ فحش کلام، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان طرازی، جھوٹی گواہی، اور بیہودہ کلام سے سخت متنفر ہوتا ہے۔

اور یہی حال اعمال کا ہے۔وہ اعمال حسنہ سے مانوس ہوتا ہے جن کے حسن وخوبی وپاکیزگی پر شریعت محمدی اور طبیعت سلیمہ وعقل صحیح مطمئن اور متفق ہوں، مثلا صرف خدائے واحد کی عبادت کی جائے، اس کا کسی کو شریک نہ مانا جائے، اپنی خواہشات کو اس کے تابع کیا جائے، اور پوری جدو جہد کے ساتھ اس کی رضامندی حاصل کی جائے۔ اس کی مخلوقات سے بقدر استطاعت احسان کیا جائے، اور دوسروں سے وہی سلوک

کرے جس سلوک کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔اسی طرح اخلاق بھی انتہائی پاکیزہ اور اعلی ہونا چاہیئے مثلا بردباری، وقار، صبر ورحم، وفا، سچائی، صفائی قلب، تواضع، خودداری، نرم مزاجی وغیرہ۔ یہ وہ صفات اخلاقیہ ہیں جو اللہ تعالی کو پسندیدہ ہیں۔ اسی طرح پاکیزہ خوردونوش کا اہتمام یعنی بندہ ایسی حلال وخوشگوار غذا استعمال کرے جس سے جسم وروح کو فائدہ حاصل ہو اور جذبہ بندگی سلامت رہے۔

اسی طرح مناکحت اور ازدواجی رشتے کو بھی پاکیزہ وطیب لوگوں کے ساتھ استوار کرے اور احباب اور ہم نشینوں کا انتخاب اسی اصول پر ہو۔

ان اعمال حسنہ اور پاکیزہ اخلاق وستودہ صفات سے متصف لوگوں کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾[النحل:۳۲]

وہ لوگ جنہیں فرشتے پاکیزگی کی حالت میں وفات دیں گے اور کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، اپنے نیک عمل کی وجہ سے تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اور قیامت کے دن جنت کے فرشتے خوش آمدید کہتے ہوئے کہیں گے:

﴿ سَلامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴾[الزمر:۷۳]

تم پر سلامتی ہو، خوش رہو، اور جنت میں ہمیشہ کی زندگی بسر کرو۔

آیت مذکورہ میں ﴿فَادْخُلُوهَا﴾ میں حرف ''فاء'' سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جنت میں دخول کا سبب ان کی پاکیزگی ہے۔ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّؤُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾[النور:٢٦]

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے، پلید مرد پلید عورتوں کے لئے، پاکیزہ عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو (منافق) بکتے پھرتے ہیں، ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم۔

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ خبیثوں کی باتیں بھی خبیث اور پاکیزہ لوگوں کی باتیں بھی پاک وصاف ہوتی ہیں اور یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ پاکیزہ عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک وپلید عورتیں ناپاک وخبیث مردوں کے لئے ہیں۔اس آیت کا مطلب عمومی حیثیت رکھتا ہے، کسی خاص معنی کے لئے تخصیص نہیں کی جاسکتی، پھر اللہ تعالی نے تمام پاکیزہ چیزوں کے لئے جنت اور تمام گندی وپلید چیزوں کے لئے جہنم

کومخصوص کیا ہے اور اس دنیا میں پاکیزہ اور ناپاک دونوں باہم مخلوط ہیں لیکن جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالی پاک اور ناپاک کو علیحدہ علیحدہ کردے گا اور صرف دوٹھکانے باقی رہ جائیں گے۔

الغرض اللہ تعالی نے نیکی و بدبختی کی علامت ونشان میں فرق بتایا ہے جس سے ان کو پہچانا جاتا ہے (یعنی پاک طینت کو اعمال صالحہ کے ذریعہ اور بد باطن کو اعمال بد کے ذریعہ) کبھی کبھی ایک انسان میں دونوں طرح کی عادتیں اور مادے ہوتے ہیں لہذا اس پر جس طرح کے مادے کا غلبہ ہوگا، وہ اسی قبیل سے ہوگا، اگر اللہ تعالی اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو موت سے پہلے اسے گناہوں سے پاک کردیتا ہے اور اسے پاک ہونے کی خاطر دوزخ میں جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی آدمی اس کے جوار رحمت (جنت) میں گناہوں کی نجاست لے کر نہ آئے گا، اس لئے وہ پاکیزگی کے لئے برے آدمی کو دوزخ میں داخل کردیتا ہے تاکہ اسے طہارت وصفائی وپاکیزگی حاصل ہوجائے اور اس قسم کے لوگوں کا دوزخ میں قیام ان کی معصیت اور گناہوں کی خباثت سے ان کو پاک کرنے کی مدت پر منحصر ہوگا۔

چونکہ مشرک نجس عین ہے لہذا اس کو آتش جہنم پاک وصاف نہیں کرسکے گی جس

طرح ایک کتا سمندر سے نکل کر بھی نجس ہی رہتا ہے، اور جب پاکیزہ صفت مومن نجاستوں سے پاک وصاف ہوجائے گا تو آگ اس پر حرام ہوگی کیونکہ اس میں کوئی خرابی نہیں جسے زائل کرنے کے لئے آگ کی ضرورت ہو۔

پاک ہے وہ ذات جس کی حکمت عقل ودانش کے لئے حیران کن ہے۔

فصل (۲)

معرفت سنت کی ضرورت

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی معرفت اور اطاعت کس قدر ضروری ہے۔ کیونکہ طیب اور خبیث کی پوری معرفت کا ذریعہ بجز آپ کے کوئی اور نہیں، بندے کی ضرورتوں میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ ناگزیر ضرورت یہی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ سے بخوبی واقف ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ کی زندگی وسیرت طیبہ ہماری نظروں سے ایک لمحہ کے لئے اوجھل ہوئی تو اس سے فساد شروع ہو جائے گا، لیکن اس کا احساس زندہ دل لوگوں ہی کو ہوتا ہے، مردہ دلوں کے لئے احساس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، چونکہ سعادت دارین کا دارومدار نبی کریم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر ہے، اس لئے نجات وسعادت کے خواہشمندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کی سیرت مبارکہ وسنت طیبہ سے واقف ہوں تاکہ جہالت کے دائرہ سے نکل سکیں اور کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو بالکل ہی محروم ہیں، کچھ وہ ہیں جو تھوڑے پر اکتفا کر رہے ہیں اور بعض خوب خوب سعادت سے بہرہ ور ہیں۔ یہ فضل وکرم اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا عظیم اور فضل والا ہے۔

فصل (۳)

آپ ﷺ کے وضو کا طریقہ

رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے لئے اکثر الگ وضو فرماتے تھے، کبھی ایک ہی وضو سے کئی کئی نماز پڑھ لیتے (۱) کبھی ایک مد (۲) سے کبھی دوتہائی مد سے اور کبھی اس سے زیادہ سے وضو فرماتے تھے، اور امت کو بھی ہمیشہ وضو میں اسراف سے منع فرماتے تھے، اور آپ بنفس نفیس وضو کا پانی کم سے کم خرچ فرماتے تھے۔ آپ نے وضو میں اعضا کو ایک مرتبہ، دو دو مرتبہ اور تین تین مرتبہ دھویا ہے اور بعض اعضا دو مرتبہ اور بعض کو تین مرتبہ بھی دھونا آپ سے ثابت ہے۔

کبھی آپ ایک ہی چلو سے کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے اور کبھی دو یا تین چلوؤں سے بھی ایسا فرمالیتے، آپ کلی اور ناک میں پانی دونوں ایک ساتھ ڈالتے تھے، دائیں ہاتھ سے ناک میں پانی ڈالتے اور بائیں ہاتھ سے ناک صاف کرتے۔

آپ پورے سر کا مسح فرماتے تھے اور کبھی دونوں ہاتھ آگے لے آتے اور پھر پیچھے

---

(۱) دیکھئے: مسلم ۲۷۷، ابوداود ۱۷۲ (رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ایک ہی وضو سے کئی نمازیں ادا فرمائی اور موزوں پر مسح کیا)

(۲) مد تقریباً ایک سیر وزن کا ہوتا ہے۔

لے جاتے۔ یہ ثابت نہیں کہ کبھی سر کے بعض حصہ پر مسح کیا ہو اور بعض کو چھوڑ دیا ہو، البتہ جب کبھی عمامہ بندھا ہونے کی وجہ سے اول سر کا مسح کرتے تو باقی سر کا عمامہ ہی پر سے ہاتھ پھیر کر مسح کر لیتے۔

ہر وضو میں آپ سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ثابت ہے۔ان دونوں چیزوں کو آپ نے کبھی ترک نہیں فرمایا۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں بہت سی جگہ پر کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کے وجوب کی وضاحت کی ہے، اور اس طرح سے وضو میں ترتیب اور پے در پے کرنا ضروری ہے، کبھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہے۔

جب پیروں پر چمڑے کے موزے یا عام موزے نہ ہوتے تو آپ انہیں دھوتے تھے اور سر کے مسح کے ساتھ آپ دونوں کانوں کے اندرونی اور بیرونی حصوں کا بھی مسح کرتے تھے۔

وضو کرنے کے دوران جو دعائیں نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہیں، سب غلط ہیں۔اس سلسلہ میں صرف یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ شروع میں بسم اللہ کہتے تھے اور آخر میں یہ دعا پڑھتے تھے:

” أَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ

وَرَسُولُهُ، اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ ".(۱)

اور سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں یہ دعا ہے:

" سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ "(۲)

رسول اللہ ﷺ یا کوئی صحابی وضو کے شروع میں "نَوَيْتُ" (میں نے نیت کی) نہیں کہتے تھے اور نہ تین مرتبہ سے زیادہ کوئی عضو دھوتے تھے، اور آپ ﷺ سے کہنی اور ٹخنے سے اوپر دھونا بھی ثابت نہیں، وضو کے بعد اعضا کو خشک کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔

اور کبھی کبھی آپ ﷺ داڑھی کا خلال کرتے تھے اور اس پر مداومت ثابت نہیں، اسی طرح آپ انگلیوں میں بھی خلال کرتے لیکن پابندی سے نہیں، اور وضو کے دوران انگوٹھی کو حرکت دینے کے بارے میں ایک ضعیف حدیث آئی ہے۔(۳)

---

(۱) ترمذی ۵۵ نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں (جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھول دئے جاتے ہیں کہ جس سے چاہے داخل ہو جائے) اور کہا کہ اس کی اسناد میں اضطراب ہے۔ مگر اس حدیث کی اصل مسلم میں حدیث ۲۳۴ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

(۲) نسائی فی عمل الیوم واللیلۃ ۱۸۱ اور موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا۔

(۳) مصنف نے ابن ماجہ ۴۴۹ کی معمر بن محمد بن عبید اللہ کی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے سفر و حضر میں موزوں پر مسح ثابت ہے۔اس کی مدت مقیم کے لئے ایک دن اور رات اور مسافر کے لئے تین دن اور تین راتیں ہوتی ہیں۔

آپ جرابوں یعنی کپڑے سے بنے ہوئے موزوں پر بھی مسح کرتے تھے(۱) اور آپ نے صرف عمامہ کا پیشانی کے ساتھ مسح کیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ضرورت کے ساتھ خاص ہو، یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حکم عام ہو اور یہی صورت زیادہ ظاہر ہے، پیروں کے سلسلہ میں آپ کسی تکلف سے کام نہ لیتے تھے۔اگر موزے پہنے ہوتے تو مسح کر لیتے اور موزے نہیں پہنے ہوتے تو دھو لیتے۔

اور تیمّم کرتے وقت آپ ایک ہی بار پاک مٹی پر ہاتھ مار کر چہرے اور ہتھیلیوں کا تیمّم کر لیتے تھے۔تیمّم اس زمین پر کر لیتے جس پر نماز جائز ہے خواہ وہ مٹی ہو یا ریت یا دلدل، آپ فرماتے تھے ''جہاں کہیں میری امت کے کسی آدمی کو نماز کا وقت آ جائے اس کے پاس اس کی مسجد اور اس کی طہارت کا سامان موجود ہے''۔(۲)

غزوہ تبوک میں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام صحرائی علاقے میں سفر

(۱)حسن درجہ کی حدیث ہے، دیکھئے: ابوداود۱۵۹، ترمذی۹۹، ابن ماجہ۵۵۹، مسند احمد۴/۲۵۲ مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے۔

(۲)ابوامامہ سے مروی اس کی سند صحیح ہے، دیکھئے مسند احمد۵/ ۲۴۸

کررہے تھے اورآپ کے ساتھ پانی بہت کم مقدار میں تھا،اورکسی سے یہ روایت نہیں کہ آپ اپنے ساتھ مٹی اٹھا کرلائے ہوں یا صحابہ کواس کا حکم دیا ہو،نہ کسی صحابی سے ایسا کرنا ثابت ہے،اس پرغوروفکر کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نے یقیناً ریت ہی سے تیمّم فرمایا تھا،اورآپ ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ ہر نماز کے لئے جداگانہ تیمّم فرماتے تھے اورنہ اس کا حکم دیا،بلکہ تیمّم کو بالکل وضوکا قائم مقام قراردیا ہے۔(۱)

(۱) آپ ﷺ نے فرمایا:(ایک مسلمان کا وضو پاک مٹی ہے گرچہ اس کودس سال تک پانی نہ ملے۔اورجب پانی مل جائے وہ اپنی جلدکو پانی سے دھولے یعنی وضوکرلے).دیکھئے ابوداود۳۳۲،۳۳۳،ترمذی ۱۲۴ابوذرکی روایت سے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

فصل (۴)

آپ ﷺ کی نماز کا طریقہ

نبی کریم ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے تھے۔اس سے پہلے کچھ نہ کہتے تھے حتی کہ زبان سے آپ نیت بھی نہ کرتے تھے۔تابعین یا ائمہ اربعہ میں سے بھی کسی نے اسے مستحب نہیں مانا ہے۔تکبیر تحریمہ میں آپ صرف اللہ اکبر کہتے تھے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر ان کو قبلہ کی طرف کر کے کان کی لو یا مونڈھے تک اٹھاتے تھے پھر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی اور بازو کے اوپر رکھ لیتے تھے۔

دونوں ہاتھوں کے رکھنے کی جگہ کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے (لیکن ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ ہتھیلی کو ہتھیلی پر ناف کے نیچے باندھا جائے)۔(۱)

تکبیر تحریمہ کے بعد آپ نماز کا آغاز کبھی اس دعا سے فرماتے تھے:

”اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ، اللّٰهُمَّ اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ،اللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الذُّنُوبِ

---

(۱) یہ مؤلف کی طرف سے اصل کتاب میں اضافہ ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھئے نیل الأوطار ۲/ ۲۰۷۔۲۱۱

وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّ نَس"(۱)

اے اللہ! میرے اور میری لغزشوں کے مابین اتنی ہی دوری کر دیجیے جتنی دوری مشرق ومغرب کے درمیان ہے، اے اللہ میری لغزشوں سے مجھے پانی، اولے اور ٹھنڈ سے دھودے، اے اللہ! مجھے خطاؤں اور گناہوں سے اس طرح پاک وصاف کردے جس طرح سفید کپڑا میل سے صاف ہوجاتا ہے:

اور کبھی یہ دعا پڑھتے تھے:

" إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفاً وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِين إِنَّ صَلاَتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ اللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْلِي ذُنُوبِي جَمِيعاً إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُفِي يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ "(۲)

(۱) صحیح، دیکھئے بخاری ۷۴۴، مسلم ۵۹۸۔
(۲) صحیح، دیکھئے مسلم ۷۷۱۔

میں صرف اس اللہ کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور بلاشبہ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔ اے اللہ! آپ بادشاہ ہیں، آپ کے علاوہ میرا کوئی رب نہیں اور میں آپ کا بندہ ہوں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ میرے گناہوں کو معاف کردیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور گناہوں کا معاف کرنے والا نہیں ہے اور حسن اخلاق کی طرف میری رہنمائی فرما کیونکہ آپ کے علاوہ کوئی اور اس کی رہنمائی کرنے والا نہیں۔ اور مجھے بداخلاقی سے دور فرما کیونکہ آپ کے علاوہ کوئی اور اس سے دور کرنے والا نہیں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں، بابرکت ہے آپ کی ذات، خیر کے خزانے تیرے ہاتھ میں ہیں، شر کی نسبت آپ کی طرف نہیں کی جاسکتی۔ میرا وجود آپ کے ہی سہارے ہے اور آپ کی طرف لوٹنا ہے۔ آپ کی ذات بابرکت اور عظیم الشان ہے اور آپ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

لیکن ثابت یہ ہے کہ یہ دعا قیام اللیل کے وقت پڑھنے کی ہے۔(۱)

(۱) دیکھئے صحیح ابن خزیمہ ۱/ ۳۰۷

اور کبھی کبھار آپ سے یہ دعا پڑھنا بھی ثابت ہے:

”اللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرِیلَ وَمِیکَائِیلَ وَإِسْرَافِیلَ...“

اور کبھی آپ ﷺ یہ دعا بھی پڑھتے تھے:

”اللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِیهِنَّ“(۱)

پھر علامہ ابن قیم نے دو اور دعاؤں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے، یہ تمام دعائیں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں۔

روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کا آغاز ان الفاظ سے بھی کرتے تھے:

”سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَ لَا إِلٰهَ غَیْرُكَ“

اس دعائے استفتاح کو اصحاب سنن(۲) نے ذکر کیا ہے لیکن پہلے والی دعائیں زیادہ ثابت ہیں البتہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے ثابت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہوکر بآواز بلند یہ دعا پڑھتے تھے اور لوگوں کو سکھلایا کرتے تھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرا مسلک حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی

---

(۱) صحیح، دیکھئے بخاری ۱۱۲۰، مسلم ۷۶۹

(۲) ابوداود ۷۷۶ اور ترمذی ۲۴۳، اور ابوداود نے ضعیف کہا ہے۔

روایت کے مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھی نماز کے افتتاح میں دوسری دعائیں جو آنحضرت ﷺ سے ثابت ہوں پڑھ سکتا ہے۔ دعائے استفتاح کے بعد آپ ﷺ " أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ،، پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور " بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ " کبھی بآواز بلند اور کبھی آہستہ پڑھتے تھے لیکن اکثر و بیشتر آہستہ پڑھتے تھے۔(۱)

آپ ﷺ ہر آیت پر ٹھہرتے تھے اور آخری حرف کو کھینچ کر پڑھتے تھے۔ آپ کی قراءت ٹھہراؤ کے ساتھ ہوتی تھی۔(۲)

جب سورہ فاتحہ ختم ہوجاتی تو اگر جہری قراءت ہوتی تو آمین بھی بآواز بلند کہتے ورنہ آہستہ سے کہتے اور صحابہ کرام بھی آپ کے پیچھے ایسا ہی کرتے تھے۔(۳)

آپ پہلی رکعت میں دو سکتے کرتے تھے۔ ایک تکبیر اولی اور قراءت کے درمیان، دوسرے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے خاتمہ پر دوسری روایت میں ہے کہ رکوع سے پہلے (۴)، ایک قول یہ ہے کہ پہلے سکتے کے علاوہ دو

(۱) دیکھئے بخاری ۵۸۴۶، مسلم ۳۹۹

(۲) دیکھئے بخاری ۵۰۴۶

(۳) دیکھئے ابوداود ۹۳۲، اور ترمذی ۲۴۸، اور اس کی سند جید ہے۔

(۴) دیکھئے ابوداود ۷۷۸، اور ان کی سند منقطع ہے۔

مزید سکتے تھے جہاں آپ ﷺ خاموش رہتے تھے لیکن صحیح یہ ہے کہ سکتے کے مقامات دو ہی تھے۔ تیسرے مقام پر معمولی سا سکتہ ہوتا جو بظاہر دم (سانس) لینے کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے معمولی اور مختصر ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے ذکر نہیں کیا ہے۔

جب آپ سورہ فاتحہ کی قراءت سے فارغ ہو جاتے تو کوئی سورہ شروع کر دیتے جو کبھی طویل ہوتی اور کبھی مختصر، لیکن عموماً متوسط درجے کی سورتیں پڑھتے تھے۔ الا یہ کہ سفر میں ہوتے یا اور کوئی عذر پیش آ جاتا تو مجبورا چھوٹی سورتیں تلاوت کرتے تھے۔

فصل (۵)

آپ ﷺ کا نمازوں میں قراءت کا طریقہ

نماز فجر: آپ ﷺ نماز فجر میں قرآن پاک کی ساٹھ سے سو آیتوں تک تلاوت فرماتے تھے۔ آپ سے سورہ ق، سورہ روم (۱)، سورہ الشّمس، اور معوذتین کا پڑھنا وارد ہے، سورۃ الزلزال آپ نے دونوں رکعتوں میں تلاوت فرمائی ہے۔

ایک دفعہ نماز سفر کے دوران فجر میں پہلی رکعت میں سورہ مومنون شروع کی، جب حضرت موسی وہارون علیہما السلام کے تذکرے والی آیات پر پہنچے تو آپ کو کھانسی آ گئی اور آپ رکوع میں چلے گئے۔

اور جمعہ کے دن اکثر سورہ سجدہ اور سورہ دہر ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے، کیونکہ ان دونوں سورتوں میں کائنات کی ابتدا و انتہا، آدم علیہ السلام کی پیدائش کی بات، جنت وجہنم کے داخلے کا ذکر، یوم آخرت اور جمعہ کے دن واقع ہونے والی چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح آپ بڑے اجتماعی موقعوں پر جیسے عیدین اور جمعہ کو سورہ ق اور سورہ قمر، سورہ الأعلی اور سورہ غاشیہ پڑھتے تھے۔

---

(۱) دیکھئے سنن نسائی ۲/۱۵۶۔ ابن کثیر نے حسن کہا ہے۔

نمازظہر: ظہر کی نماز میں آپ کبھی کبھی طویل قراءت کرتے تھے۔ابوسعید کی ایک روایت میں ہے کہ نمازظہر کی اقامت سن کر اس اثنا میں اگر کوئی چاہتا تو آسانی سے بقیع تک جا کر وہاں اپنی قضاء حاجت سے فارغ ہوکر گھر آتا، وضو کرتا اور نبی ﷺ کو پہلی رکعت میں پالیتا، کیونکہ آپ قراء ت طویل فرماتے تھے۔(مسلم نے روایت کیا ہے)۔(۱)

کبھی آپ ظہر میں الم تنزیل السجدہ، یا سبح اسم ربک الاعلی (۲)، یا واللیل اذا یغشی، یا والسماء ذات البروج کی قراءت کرتے تھے۔

نمازعصر: عصر کی نماز میں قراءت بقدر ظہر کے نصف ہوتی۔اگر اسے طویل کرتے تو ظہر کی مختصر نماز کے برابر ہوتی۔

نمازمغرب: مغرب کی نماز میں آج کل کے لوگوں کے برخلاف کبھی سورہ اعراف جیسی طویل سورت پڑھتے، کبھی سورہ طور اور کبھی سورہ مرسلات پڑھتے تھے، نماز مغرب میں ہمیشہ چھوٹی سورتیں پڑھنا مروان بن حکم کے دور سے شروع ہوا جس پر زید بن ثابت نے نکیر فرمائی ہے۔

---

(۱) دیکھئے: مسلم ۴۵۴۔یہ روایت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(۲) دیکھئے: صحیح ابن خزیمہ ۵۱۲۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز مغرب میں سورہ الأعراف، سورہ الصافات ،سورہ الدخان، سورہ سبح اسم ربک الاعلی، سورہ التین ، معوذتین اور مرسلات پڑھنا بھی ثابت ہے،اس طرح سے آپ کبھی کبھی چھوٹی سورتیں بھی پڑھتے تھےاور یہ تمام روایات صحیح ومشہور ہیں۔

نماز عشاء: عشاء کی نماز میں نبی کریم ﷺ نے سورہ التین پڑھی ہے،حضرت معاذ کے لئے آپ نے والشّمس وضحاھا، سبح اسم ربک الاعلی، واللیل اذا یغشی اور اس جیسی سورتیں متعین فرمائی تھیں۔

اسی لئے حضرت معاذ کوسورہ بقرۃ پڑھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا چاہتے ہو"۔(۱)

اس واقعہ کو بعض لوگ جو نماز پڑھنے میں جلد باز ہیں،بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور واقعہ کے سیاق وسباق کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

نماز جمعہ: جمعہ کی نماز میں آپ سورہ الجمعہ،سورہ المنافقون،سورہ الأعلی (۲)،اور سورہ الغاشیہ پڑھتے تھے(۳)۔

---

(۱) دیکھئے: صحیح بخاری ۷۰۰ اور ۶۱۰۶،اور صحیح مسلم ۴۶۵

(۲) دیکھئے: صحیح مسلم ۸۷۷

(۳) دیکھئے: صحیح مسلم ۸۷۸

نمازعیدین: عیدین کی نماز میں کبھی آپ پوری سورہ ق، سورہ اقترب پڑھتے اور کبھی سورہ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے اور وفات تک آپ کا یہی معمول رہا۔

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم بھی آپ ﷺ کی اس سنت پر پابندی سے عمل کرتے رہے چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز میں سورہ البقرہ پڑھی اور طلوع شمس سے قریب سلام پھیرا۔

ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالی نماز فجر میں سورہ یوسف، النحل، ہود اور سورہ بنی اسرائیل جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان گرامی کہ ''تم میں سے جو کوئی امامت کرے تو اس کو چاہیئے کہ ہلکی نماز پڑھایا کرے'' (۱) اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ''تخفیف'' ایک نسبتی وصف ہے اور اس کے تحدید و تعیین کے لئے نبی کریم ﷺ کے اعمال کی طرف رجوع کیا جائے گا اور مقتدیوں کی خواہشات کا خیال نہ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ کا طریقہ وسنت جس پر آپ نے ہمیشہ مواظبت فرمائی ہے، وہی سارے اختلافات کا حل وفیصلہ کن ہے۔

(۱) دیکھئے صحیح بخاری ۷۰۳ اور مسلم ۴۶۷

نبی کریم ﷺ جمعہ وعیدین کے علاوہ تمام نمازوں میں سورت متعین کر کے نہیں پڑھتے تھے کہ اس کے علاوہ کچھ نہ پڑھیں۔آپ کا معمول تھا کہ جوسورت پڑھتے ، پوری پڑھتے ،کبھی ایک سورت دو رکعتوں میں پوری کرتے لیکن ایک ہی سورت دو رکعتوں میں آپ کم پڑھتے تھے۔سورت کا آخری یا درمیانی حصہ پڑھنا ثابت نہیں۔ایک رکعت میں دوسورتیں بھی آپ پڑھ لیتے تھے،لیکن نفل نمازوں میں،فرض میں نہیں۔ ہر نماز میں پہلی رکعت دوسری رکعت سے زیادہ طویل ہوتی تھی، بسا اوقات آپ ﷺ قدموں کی آواز نہ آنے تک طویل کرتے تھے۔

فصل (٦)

آپ ﷺ کے رکوع کا طریقہ

نبی کریم ﷺ جب قراءت سے فارغ ہوتے تو رفع یدین کرتے اور تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں چلے جاتے، رکوع کی صورت یہ تھی کہ ہاتھوں کے دونوں پنجے گھٹنوں پر اس طرح رکھتے تھے گویا انہیں پکڑے ہوئے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کمان کی طرح سیدھا رکھتے۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے۔ پشت بالکل سیدھی رہتی تھی اور سر نہ بہت اٹھا ہوا ہوتا تھا اور نہ بہت جھکا ہوا بلکہ پیٹھ کی سیدھ میں رہتا تھا۔ رکوع میں (سبحان ربی العظیم)(۱) پڑھتے تھے اور کبھی اتنا اضافہ اور کر دیتے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي۔(۲)

آپ کا رکوع عام طور پر اتنا طویل ہوتا کہ آدمی بآسانی دس مرتبہ (سبحان ربی العظیم) کہہ سکے(۳) یہی کیفیت سجدہ کی بھی ہوتی تھی، کبھی رکوع اور سجدہ بقدر قیام ہوتا لیکن ایسا کبھی کبھار رات کی نفل نمازوں میں فرماتے تھے۔

---

(۱) دیکھئے: صحیح مسلم ۷۷۲

(۲) صحیح بخاری ۷۹۴ اور صحیح مسلم ۴۸۴

(۳) دیکھئے ابوداود ۸۸۸

آپ ﷺ کی اکثر و بیشتر نمازیں معتدل اور مناسب ہوتی تھیں، آپ رکوع میں یہ دعا بھی پڑھتے تھے۔"سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ " (۱)اور کبھی یہ دعا پڑھتے"اللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ ،خَشَعَ لَكَ سَمْعِي وَبَصَرِي وَمُخِّي وَعَظْمِي وَعَصَبِي "(۲)

یہ دعا قیام اللیل کے بارے میں ثابت ہے۔

پھر سر اٹھاتے اور رفع یدین کرتے ہوئے " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ"(۳) کہتے تھے۔(۲) آپ ہمیشہ رکوع سے اٹھنے کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان پیٹھ سیدھی کر لیتے اور یہ فرماتے تھے "اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرتا ہو"۔(۴)

رکوع سے فارغ ہو کر بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے اور یہ کہتے " رَبَّنَاوَ لَكَ الْحَمْدُ " اور کبھی " اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ "اور کبھی " رَبَّنَا لَكَ الْحَمْد کہتے

(۱) صحیح مسلم ۴۸۷
(۲) صحیح مسلم ۷۷۱
(۳) بخاری ۷۹۵، مسلم ۳۹۲
(۴) صحیح دیکھئے ابوداود ۸۵۵، ترمذی ۲۶۵

اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ " ثابت نہیں ہے۔(۱) رکوع کے بعد آپ کا قیام بھی بقدر رکوع طویل ہوتا تھا، چنانچہ آپ سے قیام کے دوران یہ دعا ثابت ہے:

"اللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْءَ الْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ ، وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ ،لَامَانِعَ لِمَاأَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ،وَلَا يَنْفَعُ ذَالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ "(۲)

اس میں آپ ﷺ سے یہ دعا بھی ثابت ہے:

"اللّٰھُمَّ اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ،وَ نَقِّنِي مِنَ الذُّنُوبِ وَالْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَایَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ "(۳)

آپ ﷺ سے یہ مروی ہے کہ آپ "لِرَبِّي الْحَمْدُ" (۴) کے کلمے کو اتنی بار

---

(۱) بلکہ یہ بخاری میں ثابت ہے، دیکھئے صحیح بخاری ۷۹۵

(۲) صحیح مسلم ۴۷۷

(۳) صحیح مسلم ۴۷۶

(۴) صحیح دیکھئے ابوداود ۸۷۴

دہراتے تھے کہ قومہ بقدر رکوع ہو جاتا تھا۔

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَه" کہتے تو اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ ہمیں خیال ہوتا کہ آپ کو سہو ہو گیا ہے (۱) اور یہی آپ کی معروف سنت تھی لیکن اموی حکام نے ان رکنوں کو مختصر کر دیا اور لوگوں نے اسی کو سنت سمجھ لیا ہے۔

(۱) صحیح مسلم ۴۷۳

فصل (۷)

آپ ﷺ کے سجدے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ تکبیر کہتے ہوئے بغیر رفع یدین کئے سجدے میں چلے جاتے تھے، سجدے کے وقت پہلے آپ دونوں گھٹنے زمین پر رکھتے پھر دونوں ہاتھ، اس کے بعد پیشانی اور ناک (۱) احادیث صحیحہ سے یہی ثابت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ سجدے میں جاتے وقت زمین پر وہ عضور کھتے تھے جو اس سے زیادہ قریب ہو پھر اس سے قریب تر، اسی طرح سے زمین سے اٹھتے وقت سب سے پہلے اوپر والا حصہ اٹھاتے تھے پھر اس کے بعد کا حصہ، اس طور کہ سب سے پہلے سر اٹھاتے، پھر دونوں ہاتھ، پھر دونوں گھٹنے اور اس صورت میں اونٹ کے اٹھنے سے مشابہت نہیں ہوتی جیسا کہ ہمیں جانوروں کی مشابہت سے نماز میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ ایک اونٹ کی طرح بیٹھنے، لومڑی کی طرح ادھر ادھر دیکھنے، درندوں کی طرح پھیلنے، کتے کی طرح چپکنے، کوؤں کی طرح چونچ مارنے (۲) اور سلام کے وقت سرکش گھوڑوں کی دم کی طرح ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے۔ (۳)

---

(۱) اس کی سند حسن ہے، دیکھئے ابوداود ۸۳۸، ترمذی ۲۶۸

(۲) دیکھئے ابوداود ۸۶۲ اور نسائی ۲/۲۱۴

(۳) صحیح مسلم ۴۳۰

نبی کریم ﷺ پیشانی اور ناک پر سجدہ کرتے تھے اور عمامہ کے کور پر سجدہ کرنا ثابت نہیں ہے۔آپ زیادہ تر زمین پر سجدہ کرتے تھے اور پانی، گیلی مٹی، کھجور کی چٹائی اور دباغت دیئے ہوئے چمڑے پر بھی سجدہ کرنا آپ ﷺ سے ثابت ہے۔

سجدے کی حالت میں آپ کی عادت یہ تھی کہ پیشانی اور ناک اچھی طرح زمین پر ٹکا دیتے تھے۔

دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے اس طرح جدا رکھتے تھے کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں اور کانوں کی سیدھ میں رکھتے اور سجدہ میں معتدل ہوتے۔دونوں پیروں کی انگلیوں کے سرے قبلہ کی طرف ہوتے، ہتھیلیاں اور انگلیاں پھیلا دیتے، انگلیاں نہ باہم ملی ہوتیں نہ بالکل الگ ہوتیں۔

حالت سجدہ میں آپ ﷺ یہ پڑھا کرتے تھے ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلَى “(۱)اور اس کا حکم بھی دیا ہے۔آپ نے یہ دعا بھی پڑھی ہے۔

”سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وِبِحَمْدِكَ ، اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي سُبُّوحٌ (۲)قُدُّوسٌ رَبُّ

(۱) صحیح مسلم ۷۷۲

(۲) صحیح بخاری ۷۹۴

الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ "(۱)

اے میرے رب میں تیری پاکی اور حمد بیان کرتا ہوں، تو مجھے بخش دے، تو سب عیوب سے بالکل بری ہے، پاک ہے فرشتوں اور روح کا مالک ہے۔

اور یہ فرماتے:

" اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ "

اے اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا، تجھ پر ایمان لے آیا، تیرا فرماں بردار ہوا، میرے چہرے نے سجدہ کیا اس کو جس نے اسے پیدا کیا اور شکل بنائی اور اس میں آنکھ اور کان بنائے، بڑا ہی برکتوں والا اللہ ہے جو بہترین تخلیق کرنے والا ہے۔

اور فرماتے:

" اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي ذَنْبِي كُلَّهٗ، دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ وَأَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ وَعَلَانِيَّتَهٗ وَسِرَّهٗ "(۲)

اے اللہ! میرے تمام چھوٹے بڑے، پچھلے اور بعد کے، ظاہر اور پوشیدہ گناہوں کو معاف فرمادے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۴۸۷

(۲) صحیح مسلم ۴۸۳

اورفرماتے:

”اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي خَطِيْئَتِي وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي فِي أَمْرِي وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي،اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي جِدِّي وَهَزْلِي،وخَطْئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِي اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي مَا قَدَّمْتُ، وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ، وَمَا أَعْلَنْتُ، أَنْتَ إِلٰهِي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ “(١)

اے اللہ! میرے گناہوں، نادانیوں، معاملات میں زیادتی اور گناہوں کو جنہیں مجھ سے زیادہ تو جانتا ہے، بخش دے۔ اے اللہ مذاق وسنجیدگی اور دانستگی ونادانستگی کے تمام گناہوں کو بخش دے۔

اے اللہ! میرے اگلے پچھلے، ظاہر وپوشیدہ گناہوں کو بخش دے۔ تو میرا معبود ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

سجدے میں دعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ یہ حکم دیتے تھے کہ خوب اچھی طرح گڑگڑا کر دعا مانگا کرو اور فرماتے تھے کہ اس کی قبولیت کا یقین ہے۔(٢)

(١) صحیح بخاری ٦٣٩٨
(٢) صحیح مسلم ٤٧٩

فصل (۸)

آپ ﷺ کے تشہد کا طریقہ

نبی کریم ﷺ تکبیر کہتے ہوئے سر اٹھاتے اور رفع یدین نہ کرتے ، پھر بایاں پاؤں بچھا دیتے اور اس پر بیٹھ جاتے ، داہنا پاؤں کھڑا رکھتے ، رانوں پر ہاتھ یوں رکھتے کہ کہنیاں رانوں پر لگ جاتیں اور پنجے گھٹنوں پر ہوتے ، دو انگلیوں کو سمیٹ کر حلقہ بنا لیتے پھر انگلی اٹھا کر دعا کرتے اور اسے ہلاتے (۱) اور یہ دعا پڑھتے :

" اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي ، وَارْحَمْنِي وَاجْبُرْنِي وَاهْدِنِي وَارْزُقْنِي " (۲)

اے اللہ! مجھے بخش دے ، مجھ پر رحم فرما، میرے نقصانات کی تلافی فرما، مجھ کو ہدایت دے اور رزق دے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے مروی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ (رب اغفرلي) کہتے تھے (۳)، دوسجدوں کے بعد پھر آپ رانوں کا سہارا لیتے ہوئے قدموں اور گھٹنوں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور فوراً قراءت شروع کر دیتے ، پہلی رکعت کی طرح کچھ وقفہ نہیں فرماتے

(۱) اصل کتاب میں (نہ ہلاتے) کے الفاظ ہیں اور صحیح احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں، دیکھئے: ابوداود ۹۸۸ اور نسائی ۳/ ۳۸

(۲) صحیح دیکھئے ابوداود ۸۵۰ و ترمذی ۲۸۴

(۳) صحیح دیکھئے ابوداود ۸۷۴ ونسائی ۲/ ۲۳۱

تھے، پھر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت بھی ادا فرماتے تھے۔ بس فرق اتنا ہوتا تھا کہ اس میں پہلی کی طرح قراءت سے پہلے نہ تو وقفہ ہوتا نہ دعائے استفتاح، نہ تکبیر تحریمہ اور نہ وہ طوالت ہوتی تھی۔

اور جب آپ تشہد کے لئے بیٹھتے تو بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور دہنا ہاتھ داہنی ران پر رکھتے تھے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے۔ اس انگلی کو نہ تو آپ بالکل کھڑی رکھتے اور نہ سیدھی بلکہ تھوڑی جھکائے رکھتے اسے حرکت نہ دیتے تھے، چھنگو انگلی اور برابر والی انگلی سے گھٹنے کو پکڑتے اور درمیان والی انگلی کو انگوٹھے کے ساتھ ملا کر حلقہ بناتے، شہادت کی انگلی کو اٹھا کر دعا پڑھتے اور اس کی جانب اپنی نگاہ رکھتے۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھتے، تشہد کے لئے آپ اس طرح بیٹھتے تھے جس طرح دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے تھے۔

مسلم شریف میں عبداللہ بن زبیر کی حدیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تھے تو بائیں پیر کو ران اور پنڈلی کے درمیان کر لیتے تھے اور دائیں پیر کو بچھا لیتے تھے، اور یہ آخری تشہد میں ہوتا تھا۔(۱)

---

(۱) صحیح مسلم ۵۷۹

حضرت ابن زبیر نے داہنا پیر بچھانے اور ابوحمید نے کھڑا کرنے کا ذکر کیا ہے، لیکن دونوں روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ اس پر بیٹھتے نہیں تھے بلکہ دائیں جانب نکال دیتے تھے اور وہ کھڑے ہونے اور بچھانے کی درمیانی کیفیت میں رہتا تھا۔ اور یا یہ کہا جائے کہ کبھی کھڑا رکھتے اور کبھی بچھا لیتے تھے اور یہ توجیہ زیادہ قابل اطمینان ہے۔

جلسہ میں آپ تشہد ہمیشہ پڑھتے تھے اور صحابہ کرام کو یہ پڑھنے کی تعلیم دیتے تھے:

" التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ، وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ ، السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ ،السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِينَ ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ "(۱)

تمام کی تمام عبادتیں (حمدوثنا، قولی وفعلی عبادتیں اور پاکیزہ چیزیں) اللہ کے لئے ہیں، اے نبی! سلام ہو آپ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں، ہم پر اور اللہ کے سب نیک بندوں پر سلام ہو۔ اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

آپ ﷺ اس تشہد کو بہت جلد ختم کرتے گویا آپ گرم پتھر پر کھڑے ہوں، کسی

(۱) صحیح بخاری ۱۲۰۲ اور صحیح مسلم ۴۰۲

حدیث میں منقول نہیں کہ اس تشہد میں درود پڑھا ہو یا عذاب قبر و عذاب جہنم، موت وحیات اور دجال کے فتنے سے پناہ مانگی ہو، جن لوگوں نے اسے مستحب سمجھ لیا ہے، ان کو آخری تشہد کے سلسلے میں جو احادیث عمومی طور پر آتی ہیں، ان سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

تشہد کے بعد (تین یا چار رکعت والی نماز میں) اللہ اکبر کہتے ہوئے رانوں کا سہارا لیتے ہوئے گھٹنوں اور قدموں کی مدد سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

صحیح مسلم میں اور صحیح بخاری کی بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشہد اول سے اٹھنے کے بعد رفع یدین کرتے تھے اور پھر صرف سورہ فاتحہ پڑھتے تھے اور اس کے بعد آپ سے کچھ مزید پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

نماز کے دوران آپ ادھر ادھر متوجہ نہیں ہوتے تھے، صحیح بخاری میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس طرح شیطان بندے کی نماز چراتا ہے"(۱) آپ نے بعض مرتبہ ضرورت کے تحت ایسا کیا ہے لیکن یہ معمول نہ تھا جس طرح آپ ایک وادی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جہاں آپ نے لشکر بھیجا تھا(۲) اور آپ تشہد کے بعد سلام سے پہلے جو دعا پڑھتے تھے، اس کا حکم

(۱) صحیح بخاری ۷۵۱

(۲) سنن ابو داود ۹۱۶

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ اور فضالہ کی حدیث میں ہے۔

سلام کے بعد قبلہ رخ ہوکر یا مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوکر دعا کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے، نماز سے متعلق تمام دعائیں آپ نماز کے اندر ہی پڑھتے تھے اور اسی کا حکم دیتے تھے اور یہی مصلی کے شایان شان ہے، کیونکہ نماز میں وہ اللہ تعالی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور سلام پھیرنے کے بعد یہ کیفیت ختم ہوجاتی تھی۔ پھر اپنے داہنی طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے سلام پھیرتے تھے اور بائیں طرف بھی اسی طرح کرتے تھے۔ جس روایت میں آپ سے ایک سلام کا ذکر ہے وہ ثابت نہیں ہے۔ (۱) اس سلسلہ میں سب سے اچھی حدیث سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے لیکن وہ قیام اللیل کے متعلق ہے اور یہ حدیث بھی معلول ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور نہیں ہے کہ آپ نے ایک سلام پر اکتفا کیا ہے۔

نماز میں (تشہد میں) یہ دعائیں پڑھا کرتے تھے:

" اللّٰھُمَّ إِنِّی أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ ، وأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّال

(۱) یہ حدیث ترمذی ۲۹۶ اور ابن ماجہ ۹۱۹ میں اور دیگر کتب میں بھی وارد ہے جو دوسرے شواہد کی وجہ سے حسن کے درجہ کی ہے۔

وأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحيَا وَالْمَمات، اللّٰهُمَّ أَعُوذُبِكَ مِنَ المَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ "(۱)

اے اللہ میں عذاب قبر سے پناہ مانگتا ہوں اور دجال کے فتنے اور زندگی اور موت کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔اے اللہ میں گناہ اور قرض سے پناہ مانگتا ہوں۔

اس طرح آپ یہ دعا بھی پڑھتے تھے:

" اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْأَمْرِ وَالْعَزِيمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَأَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَأَسْأَلُكَ قَلْبًا سَلِيمًا وَأَسْأَلُكَ لِسَانًا صَادِقًا وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَاتَعْلَمُ وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ "(۲)

اے اللہ! میں تجھ سے ثابت قدمی اور نیکی پر پختہ ارادے کا سوال کرتا ہوں۔اور نعمتوں کے شکرادا کرنے کا سوال کرتا ہوں، تیری اچھی عبادت کا سوال کرتا ہو،قلب سلیم اور سچی زبان مانگتا ہوں،جس خیر کو تو جانتا ہے،اس کا سوال کرتا ہوں اور جس شر کو تو جانتا ہے اس سے پناہ مانگتا ہوں،اور جن گناہوں کا تجھے علم ہے، ان کی مغفرت کا سائل ہوں۔

(۱) صحیح بخاری ۸۳۲ وصحیح مسلم ۵۸۹
(۲) ترمذی ۳۴۰۴ونسائی ۳/۵۴

آپ یہ بھی پڑھتے تھے:

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي وَوَسِّعْ لِي دَارِي وَبَارِكْ لِي فِيمَا رَزَقْتَنِي "(۱)

اے اللہ! میرے گناہ بخش دے، میرا گھر میرے لئے کشادہ کردے اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔

ساری دعائیں جو نماز میں پڑھنے کے سلسلہ میں آئی ہیں، وہ صیغہ مفرد سے آئی ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو سر جھکا کر کھڑے ہوتے تھے اور تشہد کی حالت میں آپ کی نگاہ شہادت کی انگلی پر رہا کرتی تھی۔ اللہ تعالی نے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت نماز میں رکھی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے "اے بلال! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ" نماز میں اس قدر اور غیر معمولی دلچسپی کے باوجود آپ ہمیشہ مقتدیوں کی رعایت فرماتے تھے، بعض مرتبہ نماز کو طویل پڑھنے کی غرض سے شروع فرماتے لیکن بچہ کے رونے کی آواز سن کر مختصر کردیتے تاکہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، اسی طرح آپ بعض مرتبہ اپنی نواسی امامہ کو کندھے پر

---

(۱) ترمذی ۳۴۹۶ امام نووی نے صحیح کہا ہے، دیکھئے الأذکار (٦٦).

اٹھا کر فرض نماز پڑھتے تھے، قیام کی حالت میں اٹھا لیتے اور سجدہ اور رکوع کی حالت میں اتار دیتے تھے، نماز کی حالت میں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آتے اور آپ کی پشت پر سوار ہو جاتے تھے۔

آپ سجدہ طویل کر دیتے تا کہ انہیں اتارنا نہ پڑے۔ آپ جب نماز پڑھتے ہوتے تو اس دوران اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا آجاتیں تو آپ چل کر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتے اور پھر مصلے پر آجاتے اور نماز کی حالت میں آپ سلام کا جواب اشارہ سے دیتے تھے۔(۱)

جس حدیث میں مذکور ہے کہ جس نے نماز میں اشارہ کیا تو چاہیئے کہ وہ نماز دہرائے، وہ باطل ہے۔(۲) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے(۳) کہ آپ ﷺ نماز میں بوقت حاجت پھونکتے اور کھنکھار لیتے تھے(۴)، نماز میں آپ کبھی روتے بھی تھے، نیز آپ کبھی ننگے پاؤں نماز پڑھتے اور کبھی جوتے ہی میں نماز پڑھ لیتے تھے۔(۵)

---

(۱) صحیح مسلم ۵۴۰

(۲) ابوداود ۹۴۴

(۳) مسند احمد ۲/۱۵۹

(۴) صحیح ابن خزیمہ ۹۰۲

(۵) ابوداود ۶۵۳، اس کی سند جید ہے۔

یہودیوں کی مخالفت کی غرض سے جوتوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔کبھی آپ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی اورزیادہ تر دو کپڑوں میں ادا فرمائی۔

فجر کی نماز میں رکوع کے بعد ایک ماہ تک دعائے قنوت پڑھی پھر چھوڑ دی۔آپ کسی ناگہانی مشکل کی وجہ سے دعائے قنوت پڑھتے تھے، جب دور ہوجاتی تو ترک کردیتے تھے،مصیبتوں کے وقت دعائے قنوت پڑھنا اوراس کے دور ہوجانے کے بعد ترک کردینا آپ کی سنت تھی،فجر کی نماز میں خصوصیت سے قنوت نہ پڑھتے تھے۔البتہ اس میں زیادہ قنوت پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ نماز طویل ہوتی تھی۔اوراس کا وقت تہجد سے قریب ہوتا ہے جو کہ قبولیت دعا اورنزول رحمت الٰہی کی گھڑی ہے۔

فصل (۹)

آپ ﷺ کے سجدۂ سہو کا طریقہ

نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ''میں تم جیسا ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں، جب میں بھول جایا کروں تو مجھے یاد دلایا کرو''۔(۱)

آپ کا سہو دراصل امت کے لئے ایک نعمت اور کمال دین کا سبب ہے تاکہ سہو میں آپ کی اقتدا کریں، چنانچہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ چار رکعت والی نماز میں دوسری رکعت کے بعد کھڑے ہو گئے اور دونوں کے درمیان قعدہ نہیں کیا، جب آپ نے نماز ختم کر لی تو سلام سے پہلے دو سجدے کئے، پھر سلام کیا، اس طرح اس سے ایک مسئلہ معلوم ہو گیا کہ جو آدمی نماز کے ارکان کے علاوہ باقی اجزاء میں سے کچھ حصہ سہواً چھوڑ دے تو وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔

بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ایک رکن کے علاوہ کوئی حصہ سہواً چھوڑ دیا اور دوسرا رکن شروع کر دیا تو متروک حصہ کی طرف نہ لوٹے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے مغرب یا عشاء کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا،

(۱) صحیح بخاری ۱/۶۶۷ اور صحیح مسلم ۲/۵۷

پھر بات چیت کی، پھر اسے پورا کیا، پھر آپ نے سلام پھیر کر سجدہ کیا اور اس کے بعد پھر سلام پھیرا۔

ایک مرتبہ آپ نے نماز پڑھائی اور ایک رکعت باقی تھی کہ آپ نے سلام پھیر دیا، اتنے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہا آپ ایک رکعت بھول گئے ہیں، یہ سن کر آپ واپس مسجد لوٹے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اقامت کہیں، پھر آپ نے ایک رکعت نماز پڑھائی، اس روایت کو امام احمد نے ذکر کیا ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھا دی، لوگوں نے یاد دلایا تو آپ نے سلام کے بعد سجدہ سہو کیا۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز تین رکعتیں پڑھائیں، پھر آپ گھر چلے گئے۔ لوگوں نے یاد دلایا تو آپ باہر تشریف لے آئے اور مزید ایک رکعت پڑھا کر سلام پھیرا، پھر سجدہ سہو کیا اور سلام پھیرا۔

یہ سجدہ سہو سے متعلق مجموعی طور پر پانچ واقعات مروی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نماز کی حالت میں اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے تھے، امام احمد نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ یہودیوں کی عادت تھی، ایک جماعت نے اسے مباح قرار دیا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اگر آنکھیں کھولنا نماز کے خشوع میں مخل نہیں ہے تو کھولنا افضل ہے اور اگر آنکھ کھولنے سے قبلہ کی طرف کے نقش ونگار خلل انداز ہوتے ہیں تو یہ مکروہ نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ استغفراللہ کہنے کا معمول تھا اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

" اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ "(۱)

اے اللہ! تو سلامتی والا ہے اور تجھ ہی سے سلامتی ہے۔تو برکت والا ہے، اے بزرگی اور تعظیم والے۔

آپ قبلہ رخ صرف اتنی دیر بیٹھتے کہ استغفار اور مذکورہ دعا پڑھتے، پھر فورا اپنا رخ مقتدیوں کی طرف کر لیتے اور اپنے دائیں اور بائیں جانب سے (رخ انور) پھیر لیتے تھے پھر اپنا چہرہ مقتدیوں کی سمت کے علاوہ کوئی دوسری سمت متعین نہ کرتے تھے اور جب آپ صبح کی نماز پڑھ لیتے تو جائے نماز پر بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ سورج اچھی طرح نکل آتا۔

نبی کریم ﷺ ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

(۱) صحیح مسلم ۵۹۱

” لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَـيْءٍ قَـدِيْـرٌ، اَللّٰهُـمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْـجَـدِّ مِـنْكَ الْـجَـدُّ ،وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ “(۱)

اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی حکومت ہے، اسی کے لئے سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو تو نے عطا کیا ہے، اسے کوئی روکنے والا نہیں، اور جو تو نے روک دیا ہے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی عزت دار دولت والے کو تیرے مقابلے میں دولت نفع نہیں دیتی، گناہ سے باز رہنا اور اطاعت کی قوت اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اس کے لئے ساری نعمتیں اور ساری بڑائیاں اور اچھی تعریفیں ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم خالص اس کی بندگی کرتے ہیں، اگرچہ کافروں کو یہ بات بری معلوم ہو۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے لئے یہ مستحب قرار دیا ہے کہ ہر فرض نماز کے

(۱) صحیح مسلم ۵۹۳، ۵۹۴

بعدسبحان اللہ۳۳ مرتبہ،الحمدللہ۳۳ مرتبہ،اللہ اکبر۳۳ مرتبہ اور آخرمیں ایک مرتبہ " لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ وَحْـدَهٗ لَا شَـرِيْكَ لَـهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر"

کہہ کرسوکا عدد پورا کیا جائے۔(۱)

صحیح ابن حبان میں حضرت حارث بن مسلم سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ: جب تم صبح کی نماز پڑھ لوتو بات کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لو:

" اَللّٰهُمَّ أَجِرْنِي مِنَ النَّارِ "

اے اللہ! تو مجھے جہنم کی آگ سے بچا!

اگر تم اس دن مرجاؤ تو اللہ تعالی آگ سے تمہاری نجات لکھ دے گا اور جب تم مغرب کی نماز کے بعد بات کرنے سے پہلے یہی کلمات سات مرتبہ پڑھ لو اور پھر اسی رات تمہارا انتقال ہو گیا تو جہنم سے محفوظ رہو گے۔(۲)

نبی ﷺ جب دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تو اپنے اور اس کے درمیان بکری کی گزرگاہ کا فاصلہ چھوڑ دیتے اور اس سے دور نہ رہتے بلکہ سترہ کے قریب ہونے کا

(۱) صحیح مسلم ۵۹۴

(۲) صحیح ابن حبان ۲۰۲۲

حکم فرماتے تھے اور جب آپ لکڑی یا ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو اسے دائیں بائیں جانب کر لیتے اور بالکل سامنے نہ کرتے ، سفر میں آپ نیزہ کا سترہ بنالیتے تھے اور سواری اور کجاوے کی لکڑی کا بھی سترہ بنالیتے تھے اور مصلی کے آگے تیر یا لاٹھی کا بھی سترہ بنانے کا حکم فرمایا ہے۔اگر کوئی چیز نہ ملے تو زمین پر ایک لکیر ہی کھینچ کر سترہ بنالینا کافی ہے۔

اگر سترہ نہ ہو تو صحیح روایت میں مذکور ہے کہ عورت ، گدھے اور کتے کے گزرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے(۱)، اس روایت کی مخالف روایت اگر صحیح ہے تو اس میں صراحت نہیں ہے اور جو روایت صریح ہے تو اس میں صحت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ اس حالت میں نماز پڑھتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے قبلہ کی جانب سوئی ہوتی تھیں لیکن یہ صورت سامنے سے گزرنے والے سے مشابہ نہیں ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنا حرام ہے اور اس کے سامنے ٹھہرنا مکروہ نہیں ہے۔

(۱) صحیح مسلم بروایت ابوذر رضی اللہ عنہ ۵۱۰ اور اس کے مخالف روایات نے لئے دیکھئے صحیح مسلم ۵۱۲ اور ۵۰۴.

فصل (۱۰)

آپ ﷺ کی نماز میں سنتوں کا طریقہ

نبی کریم ﷺ حالت اقامت میں ہمیشہ دس رکعتوں کا اہتمام کرتے تھے اور وہ رکعتیں وہی ہیں جن کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دس رکعتیں محفوظ کی تھیں، دو رکعتیں ظہر سے پہلے، دو اس کے بعد، دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشاء کے بعد گھر میں اور دو رکعتیں فجر کی نماز سے پہلے۔ظہر کے بعد کی دو رکعتیں اگر چھوٹ جائیں تو انہیں آپ عصر کے بعد ممنوع وقت میں ادا کرلیا کرتے تھے،آپ کبھی ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ ”مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیا کرو“ تیسری بار فرمایا کہ ”جس کا جی چاہے“(۱) تا کہ لوگ اسے سنت موکدہ نہ سمجھ لیں اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہیں،سنت موکدہ نہیں۔

نبی کریم ﷺ عام سنتیں اور نوافل جس کا کوئی مخصوص سبب نہ ہو، خاص طور پر مغرب کی سنت گھر ہی میں ادا فرماتے تھے، یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کبھی مسجد میں پڑھی

(۱) صحیح بخاری ۱۱۸۳،۷۳۶۸

ہولیکن مسجد میں پڑھی جاسکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ فجر کی سنت کا تمام دیگر نوافل سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور اسے اور نماز وتر کو کبھی سفر وحضر میں نہیں چھوڑتے تھے۔حالت سفر میں ان دونوں سنتوں کے علاوہ کوئی دوسری سنت پڑھنا ثابت نہیں ہے۔

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ فجر کی سنتوں اور وتروں میں کونسی زیادہ ضروری ہے۔فجر کی سنت سے عمل کی ابتدا ہوتی ہے اور وتر کی نماز سے اعمال اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں،اس وجہ سے آپ فجر کی سنتوں اور نماز وتر میں سورہ کافرون اور سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور یہ سورتیں توحید علمی وعملی،توحید معرفی وارادی،اور توحید اعتقادی وقصد پر مشتمل ہیں۔

سورہ اخلاص میں ایسی توحید کامل کا بیان ہے جو شرک کی تمام صورتوں کے قطعی منافی ہے،پھر اس میں اثبات صمدیت ہے جو تمام صفات کمال اس کی طرف منسوب کرتی ہے جس میں کسی طرح کا کوئی نقص نہیں پایا جاتا اور ابوت بنوت کی نفی سے بے نیازی اور وحدانیت ثابت ہوتی ہے اور اس میں کفو ونظیر کی بھی نفی ہے جس سے ہر قسم کی تشبیہ وتمثیل کی نفی ہوتی ہے۔

اس سورت میں اللہ کے لئے ہر کمال کا اثبات ہے اور ہر نقص کی نفی ہے اور اس کے

کمال میں اس کے مثیل وشبیہ کی نفی بھی ہے اور اس کے ساتھ کسی کے شریک ہونے کا مطلقاً انکار بھی ہے۔

غرض سورۂ اخلاص میں عقیدہ توحید کے وہ بنیادی اصول آ گئے ہیں جن کے تسلیم کر لینے کے بعد انسان تمام گمراہ فرقوں سے دور ہو کر توحید کامل کا قائل ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کے برابر ہے، کیونکہ قرآن کریم کا دارومدار خبر اور انشاء پر ہے اور انشاء میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔(۱) امر (۲) نہی (۳) اباحت، اور خبر کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی اللہ تعالی کی ذات اور اس کے اسماء وصفات اور احکام کی خبر۔ دوسری اپنی مخلوق کے بارے میں خبر، چنانچہ سورہ اخلاص محض اس کی ذات اور اس کے اسماء وصفات کی خبر پر مشتمل ہے، اسی وجہ سے یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور اس کا پڑھنے والا جب کہ اس کا اس پر ایمان بھی ہو، شرک اعتقادی سے بری ہو جاتا ہے، جس طرح سورہ الکافرون شرک عملی اور شرک ارادی سے انسان کو الگ کر دیتا ہے۔

چونکہ علم عمل پر مقدم اور اس کا امام وقائد ہے، اس لئے سورہ اخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورہ الکافرون ایک چوتھائی کے برابر ہے۔

چونکہ شرک عملی اپنی خواہشات کی اتباع کے باعث لوگوں پر غالب ہو جاتا ہے اور

اکثر لوگ باوجود اس کے مضرت وبطلان سے واقف ہونے کے اس کے مرتکب ہوجاتے ہیں اوراس کوزائل کرنا شرک علمی سے زیادہ مشکل ودشوارہوجاتا ہے، کیونکہ یہ دلیل سے زائل ہوجاتا ہے، اس لئے سورہ الکافرون میں تاکیداورتکرار سے کام لیا گیا ہے۔اسی وجہ سے آپ ان دونوں سورتوں کوطواف کی دورکعتوں میں پڑھا کرتے تھے کہ حج توحید کا شعار ہے اوراس وجہ سے ان کے ذریعہ دن کے کام کی ابتدااوررات کے کام کا اختتام فرماتے تھے۔

آپ ﷺ فجر کی سنتوں کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔(۱)اس سلسلہ میں دو جماعتوں نے قدرے غلو سے کام لیا ہے۔ظاہریہ نے اسے واجب قرار دیا ہے اور ایک دوسری جماعت نے اسے بدعت ومکروہ بتایا ہے،لیکن امام مالک نے معتدل اور درمیانی مسلک اختیار کیا ہے،وہ یہ کہ آرام کی غرض سے لیٹ جائے تو حرج نہیں اوراگر سنت سمجھ کرکیا جائے تو یہ فعل مکروہ ہے۔

(۱) صحیح بخاری ۱۱۶۰ ، صحیح مسلم ۷۴۳

فصل (۱۱)

آپ ﷺ کے قیام لیل کا طریقہ

نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز سفر وحضر کسی حال میں نہیں چھوڑتے تھے۔ جب کبھی آپ پر نیند کا غلبہ ہوجاتا یا کوئی تکلیف ہوجاتی تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے۔

ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس دلیل کے متعلق فرماتے سنا کہ وتر اپنے محل سے قضا ہوجانے کے بعد قضا نہیں ہوتی جس طرح تحیۃ المسجد، نماز کسوف اور نماز استسقاء وغیرہ ہے، کیونکہ اس سے مقصود یہ کہ رات کی آخری نماز وتر ہو۔

آپ ﷺ نماز تہجد میں گیارہ یا تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے (۱)، گیارہ رکعتوں پر اتفاق ہے اور آخری دو رکعتوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ فجر کی دو سنتیں تھیں یا کوئی اور نماز تھی، اسی طرح جب فرائض اور ان سنن موکدہ کو جمع کیا جائے، جن پر آپ مواظبت کرتے تھے تو مجموعی طور پر چالیس رکعتیں ہوتی ہیں، اس کے علاوہ کوئی نماز پڑھی تو پابندی سے نہیں پڑھی۔

لہذا ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ تاحیات اس طرح معمول رکھے، اس لئے کہ جو شخص

---

(۱) صحیح بخاری ۱۱۴۷، صحیح مسلم ۷۳۶

دن اور رات میں چالیس مرتبہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بات کس قدر جلد سن لی جائے گی۔

نبی کریم ﷺ جب رات کے وقت جاگتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

”لا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ أَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِي، وَأَسْأَلُكَ رَحْمَتَكَ، اللّٰهُمَّ زِدْنِي عِلْماً وَلَاتُزِغْ قَلْبِي بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنِي، وَهَبْ لِي مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ “(۱)

تیرے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں، تو پاک ہے، اے اللہ! میں تجھ سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت طلب کرتا ہوں، اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما اور ہدایت کے بعد میرے دل کو ٹیڑھا نہ کر، مجھ کو اپنی رحمت سے نواز، تو بہت نوازنے والا ہے۔

جب آپ سو کر اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے:

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورِ “(۲)

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو موت (نیند) کے بعد زندگی عطا

---

(۱) ابوداود ۲۵۶۱

(۲) صحیح بخاری ۶۳۱۲

کی اوراسی کے پاس جمع ہونا ہے۔

پھراس کے بعد آپ ﷺ مسواک فرماتے۔بسا اوقات سورہ آل عمران کی آخری دس آیتیں ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾سے آخرسورہ تک تلاوت فرماتے تھے،پھر وضوکرتے اور مختصر دورکعت نماز پڑھتے،حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت سے اسے پڑھنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔(۱)

جب رات آدھی گزر جاتی اوراس سے قبل یا اس کے بعد آپ اٹھتے اوراکثر اوقات اس وقت اٹھتے جب آواز دینے والے یعنی مرغ کی آواز سنتے اور وہ اکثر نصف ثانی (رات کے آخری نصف) میں آواز لگاتا تو آپ اپنا ورد(نماز) کئی حصوں میں کردیتے اورکبھی مسلسل جاری رکھتے اوریہی زیادہ تر ہوتا،کئی حصوں میں ادا کرنے کی صورت حضرت ابن عباس نے یہ بتائی ہے کہ" دو رکعت نماز ادا کرکے آپ ﷺ سوجاتے تھے،اس طرح تین مرتبہ میں چھ رکعتیں ادا فرماتے تھے اور ہر مرتبہ اٹھ کر مسواک اوروضوکرتے ،پھرتین رکعت وترادا کرتے"۔(۲)

آپ ﷺ وترکئی طرح پڑھتے تھے۔ایک کیفیت کاذکرابھی ہوا،دوسری صورت

---

(۱) صحیح مسلم ۷۶۸

(۲) صحیح بخاری ۶۳۱۶،مسلم ۷۶۳

یہ کہ آپ آٹھ رکعتیں اس طور پر پڑھتے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے، پھر مسلسل پانچ رکعت بطور وتر پڑھتے۔ صرف آخر میں تشہد کے لئے بیٹھتے تھے۔

تیسری صورت: نو رکعت اس طرح پڑھتے تھے کہ آٹھ رکعت مسلسل پڑھتے اور صرف آٹھویں رکعت کے آخر میں بیٹھتے اور اللہ تعالی کی حمد وثنا کرتے، دعا مانگتے اور پھر بغیر سلام پھیرے کھڑے ہوجاتے، پھر نویں رکعت میں تشہد پڑھتے اور سلام پھیر دیتے، سلام پھیرنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے۔ (۱)

چوتھی صورت: یہ کہ مذکورہ ہی طریقے سے سات رکعتیں پڑھتے پھر اس کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

پانچویں صورت: دو دو رکعت پڑھ کر آخر میں اکٹھی تین رکعت وتر پڑھ لیتے جن میں قعدہ یا تشہد کا فاصلہ نہ ہوتا۔ (۲) اس کو امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور ان کے درمیان وقفہ نہیں کرتے تھے، تاہم یہ روایت محل نظر ہے، کیونکہ صحیح ابن حبان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "تین رکعت وتر نہ پڑھو، پانچ یا سات پڑھو، وتر کو مغرب کی

(۱) صحیح مسلم ۷۴۶

(۲) مسند احمد ۶/ ۱۵۵، اس کی سند ضعیف ہے

نماز کے مشابہ نہ بناؤ‘‘(۱) امام دارقطنی کہتے ہیں کہ اس روایت کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

حرب کہتے ہیں کہ امام احمد سے وتر کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا، دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے، اگر سلام نہ پھیر سکا تو میرا خیال ہے کہ کوئی نقصان دہ بات نہیں ہے لیکن سلام پھیرنا نبی ﷺ سے زیادہ مستند طریقے سے ثابت ہے۔ ابوطالب کی روایت میں ایک قول مذکور ہے کہ زیادہ قوی روایت ایک رکعت والی ہے اور میں اسی کا قائل ہوں۔

چھٹی صورت: جیسا کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو رکوع میں قیام کے بقدر یہ دعا پڑھی ’’ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ ‘‘ اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ابھی چار رکعتیں پڑھی تھیں کہ حضرت بلال صبح کی نماز کے لئے آپ کو بلانے آگئے (۲) آپ نے رات کے ابتدائی، درمیانی اور آخری حصہ میں وتر پڑھی، ایک رات قیام میں

---

(۱) صحیح ابن حبان ۲۴۲۹

(۲) سنن نسائی ۳/۲۲۶ یہ مرسل روایت ہے۔

صبح تک صرف ایک ہی آیت پڑھتے رہ گئے،اوروہ یہ تھی:

﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(۱)

اگرتو ان کوعذاب دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اوراگران کوبخش دے تو غالب حکمت والا ہے۔

رات میں آپ کی نمازتین طرح کی ہوتی تھی،ایک یہ کہ آپ زیادہ تر کھڑے ہوکر نماز پڑھتے تھے،دوسرے بیٹھ کرنماز پڑھتے اور رکوع بھی بیٹھ کرکرتے،تیسرے یہ کہ آپ ﷺ بیٹھ کرنماز پڑھتے اور جب تھوڑی سی قراءت باقی رہ جاتی تو کھڑے ہوجاتے اورپھررکوع فرماتے۔

نبی کریم ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ وتر کے بعدکبھی دورکعت بیٹھ کر پڑھتے اور کبھی بیٹھ کر ہی قراءت کرتے (۲)اور رکوع کے وقت کھڑے ہوجاتے پھر رکوع کرتے۔

اس حدیث سے بہت لوگوں کواشکال ہوااورانہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس ارشادکو''رات کی آخری نماز وتر بناؤ'' کا معارض سمجھ لیا۔امام احمدفرماتے ہیں کہ میں ان

(۱)سورۃالمائدۃ:۱۱۸

(۲)صحیح مسلم ۷۳۸

دو رکعتوں کو نہ پڑھتا ہوں اور نہ کسی کو پڑھنے سے منع کرتا ہوں۔امام مالک نے تو ان دونوں رکعتوں کا انکار کیا ہے۔

لیکن صحیح صورت یہ ہے کہ نماز وتر مستقل عبادت ہے اور وتر کے بعد دو رکعتیں مغرب کی سنتوں کی طرح ہیں۔اس طرح مذکورہ دونوں رکعتیں وتر کی تکمیل کا درجہ رکھتی ہیں،کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں۔

وتر میں نبی کریم ﷺ سے قنوت ثابت نہیں۔صرف ابن ماجہ کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے۔(۱) امام احمد کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ سے کچھ ثابت نہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے سال دعاءقنوت پڑھا کرتے تھے۔

اصحاب سنن نے قنوت پڑھنے کے سلسلہ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو روایت کیا ہے(۲) امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور کہا کہ ہم اس کو صرف ابوالحوراء السعدی کے طریقے سے جانتے ہیں۔

نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا حضرت عمر،حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔امام ابوداؤد اور امام نسائی نے ابی بن کعب سے

(۱) بروایت ابی بن کعب

(۲) ابوداود ۱۴۲۵ اور ترمذی ۴۶۴

روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر میں سورہ اعلی، سورہ الکافرون اور سورہ اخلاص پڑھا کرتے تھے اور سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ "سبحان الملک القدوس" کہا کرتے تھے۔ تیسری مرتبہ قدرے آواز کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔(۱)

نبی کریم ﷺ سورت ترتیل سے پڑھتے تھے خواہ وہ بڑی سے بڑی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم پڑھنے کا مقصد بھی یہ ہے کہ غور اور تدبر سے کام لیا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اس کی تلاوت اور اس کا حفظ اس کے مفہوم ومعانی کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

بعض سلف کا قول ہے کہ قرآن عمل کے لئے نازل کیا گیا اس لئے اس کی تلاوت کو عمل بنالو۔ حضرت شعبہ کہتے ہیں کہ ہمیں ابوحمزہ نے بتایا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں جلدی پڑھنے کا عادی ہوں اور بسا اوقات ایک رات میں ایک یا دو قرآن ختم کرتا ہوں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں ایک سورت پڑھوں بجائے اس کے کہ جو تم کرتے ہو۔ اگر تم کو تیز ہی پڑھنا ہے تو اس طرح پڑھو کہ تمہارے اپنے کان سن سکیں اور دل یاد کر سکے۔

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضرت علقمہ نے حضرت ابن مسعود کے سامنے تلاوت فرمائی تو

---

(۱) ابوداود ۱۴۳۳ ونسائی ۳/۲۴۴، اس کی سند صحیح ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، ترتیل سے پڑھو کیونکہ یہ قرآن مجید کی زینت ہے۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ قرآن کو شعر کی طرح نہ گا کر پڑھو اور نہ فضول کلام کی طرح پڑھو بلکہ اس کو پڑھتے وقت اس کے عجائب پر ٹھہرو اور اس کے ذریعہ دلوں کو حرکت دو اور دھیان محض سورت کو جلد ختم کر دینے پر نہ لگا ہوا ہو۔ مزید فرماتے ہیں جب تم سنو کہ اللہ تعالی یہ فرما رہا ہے: ﴿يَـاأَيُّهَـا الَّـذِيْنَ آمَنُوا﴾ (اے ایمان والو) تو تم سراپا گوش ہو جاؤ کیونکہ یا تو تمہیں نیکی کا حکم دیا جائے گا یا برائی سے منع کیا جائے گا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے پاس آئی، میں اس وقت ''سورہ ہود'' پڑھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی، اے عبدالرحمٰن! تو اس طرح سورہ ہود پڑھ رہا ہے، بخدا میں اسے چھ مہینے سے پڑھ رہی ہوں لیکن ابھی تک اسے ختم نہ کر سکی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز میں کبھی آہستہ سے تلاوت فرماتے تھے اور کبھی باآواز بلند، دونوں طرح قراءت فرماتے تھے اور قیام کبھی مختصر کرتے تھے اور کبھی طویل۔ نفل نمازیں حالت سفر میں دن ہو یا رات، سواری پر پڑھ لیتے تھے، خواہ اس کا رخ جس طرف ہو، رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرتے تھے اور سجدہ رکوع سے زیادہ جھک کر کرتے تھے۔

فصل (۱۲)

آپ ﷺ کی نماز چاشت اور سجدہ تلاوت کا طریقہ

امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو چاشت کی نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا لیکن میں اسے پڑھتی ہوں۔(۱)

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھ کو میرے خلیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی کہ ہر ماہ تین دن کے روزے رکھوں، اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھوں، اور سونے سے پہلے نماز وتر پڑھوں۔(۲) امام مسلم نے زید بن ارقم سے مرفوعا روایت کی ہے کہ اوابین کی نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب اونٹنی کے بچے کے پیر گرم ہونے لگیں کی گرمی بڑھ جائے (۳) اور جسم میں دوپہر کی گرمی اور اونٹنی کے بچے گرم ریت کو محسوس کرنے لگیں اور اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اسے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے لیکن آپ نے خود بنفس نفیس تہجد کی وجہ سے نہیں پڑھی۔

حضرت مسروق کہتے ہیں کہ ہم مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن

(۱) صحیح بخاری ۱۷۷ و صحیح مسلم ۷۱۸

(۲) صحیح بخاری ۱۱۷۸ و صحیح مسلم ۷۲۱

(۳) صحیح مسلم ۷۴۸

مسعود کے اٹھنے کے بعد ہم وہیں رہتے تھے اور پھر اٹھتے اور چاشت کی نماز پڑھتے تھے۔ان کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو فرمایا کہ کیوں بندوں پر وہ بوجھ ڈالتے ہو جسے اللہ تعالی نے نہیں ڈالا ہے۔اگر تم واقعی اس کو پڑھنا چاہتے ہو تو اپنے گھروں میں پڑھ لیا کرو۔حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ میں چاشت کی نماز خواہش کے باوجود اس ڈر سے چھوڑ دیتا ہوں کہ مجھ پر لازمی (عائد) نہ ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت طیبہ یہ تھی جب آپ کو کسی مسرت ونعمت کے حصول یا کسی مصیبت کے ٹلنے کی اطلاع ملتی تو اللہ تعالی کی جناب میں سجدہ شکر ادا کرتے تھے،اور جب کسی سجدہ والی آیت کی تلاوت فرماتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے تھے اور اکثر سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے:

”سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ، وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ “(١)

میرے چہرہ نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی تصویر بنائی اور قوت وقدرت سے اس میں کان اور آنکھ بنائے۔

نبی کریم ﷺ سے یہ کہیں منقول نہیں ہے کہ آپ اس سجدے سے اٹھتے وقت تکبیر کہتے تھے یا تشہد پڑھتے یا سلام پھیرتے تھے۔اور یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے

(١) ابوداود ١٤١٤ وترمذی ٥٨٠،اس کی سند جید ہے۔

سورہ ''الم تنزیل'' اور ''ص'' اور ''اقرا'' اور ''النجم'' اور ''اذ السماء انشقت'' میں سجدہ کیا ہے۔

ابوداؤد نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کے پندرہ مقامات بتائے ہیں، ان میں سے تین مفصل (چھوٹی سورتوں) میں ہیں اور دو سجدے سورہ حج میں ہیں۔(۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد مفصل سورتوں میں سجدہ نہیں کیا، وہ ضعیف ہے۔اس حدیث کی سند میں ابوقدامہ الحارث ابن عبید نامی ایک راوی ہے جو غیر معتبر ہے۔نیز اس حدیث کو ابن قطان نے مطر الوراق کی وجہ سے نا قابل اعتبار بتایا ہے اور کہا ہے کہ وہ خرابی حافظہ میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلی کے مشابہ ہیں اور امام مسلم نے ان کی حدیث لینے کو معیوب بتایا۔

امام مسلم کا ان احادیث کا ذکر کرنا کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ امام صاحب نے انہی احادیث کا ذکر کیا ہے جن کے محفوظ ہونے کا یقین ہوا،جس طرح بہت سے ثقہ ومعتبر راویوں کی ان حدیثوں کو چھوڑ دیا جن میں غلطی کا علم ہو گیا تھا، کچھ لوگ ثقہ راویوں

---

(۱) ابوداود ۱۴۰۱ وابن ماجہ ۱۰۵۷

کی تمام احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں، اسی طرح بعض لوگ کمزور حافظہ والوں کی تمام روایتوں کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا طریقہ کار امام حاکم وغیرہ کا ہے اور دوسرا طریقہ ابن حزم وغیرہ کا ہے لیکن امام مسلم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ائمہ فن حدیث کا طریقہ کار ہے۔

فصل (۱۳)

آپ ﷺ کا یوم جمعہ میں اسوہ حسنہ

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”ہم سے پہلی قومیں یوم جمعہ کے متعلق بھٹک گئیں۔ یہودیوں نے سنیچر کا دن اور عیسائیوں نے اتوار کا دن اپنے لئے اختیار کرلیا پھر اللہ تعالی ہمیں لایا اور جمعہ کے دن کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی۔اس طرح ترتیب یوں ہوگئی۔ جمعہ، سنیچر اور اتوار، چنانچہ وہ لوگ قیامت کے دن ہم سے پیچھے ہوں گے۔ ہم دنیا میں بعد میں ہیں لیکن قیامت کے دن آگے آگے ہوں گے اور ہمارے فیصلے تمام مخلوق سے پہلے ہوں گے“۔(۱)

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث مرفوعا روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”سب سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے، اس دن اللہ تعالی نے حضرت آدم کو پیدا فرمایا، اسی دن وہ جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن نکالے گئے اور قیامت بھی جمعہ کے دن ہی آئے گی“(۲) اسے موطا نے روایت کیا ہے، امام ترمذی نے ان الفاظ کے ساتھ بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے ”وہ سب سے بہتر دن ہے، اسی

(۱) صحیح مسلم ۸۵۶

(۲) ترمذی ۴۹۱، ابوداود ۱۰۴۶، ترمذی نے حسن کہا ہے۔

دن آدم علیہ السلام پیدا کیئے گئے، زمین پر اتارے گئے، ان کی توبہ قبول ہوئی اور ان کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت آئے گی، جنات اور انسان کے سوا کوئی جاندار ایسا نہیں جو جمعہ کے دن قیامت کے ڈر سے خائف وترساں نہ ہو۔اس میں ایسی مبارک گھڑی بھی آتی ہے کہ جب کوئی مسلمان نماز کی حالت میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہے تو وہ اسے عطا کرتا ہے" کعب نے دریافت کیا کہ کیا یہ ہر سال ہوتا ہے تو میں نے کہا نہیں بلکہ ہر جمعہ کو ، پھر انہوں نے تورات کھول کر پڑھی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں، پھر میں عبداللہ بن سلام سے ملا تو میں نے ان کے سامنے حضرت کعب کی مجلس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں، وہ کون سی گھڑی ہے، میں نے عرض کیا، پھر مجھے بھی بتادیجیئے، چنانچہ انہوں نے فرمایا، یہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے۔ میں نے عرض کیا: وہ کس طرح جب کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اس گھڑی میں کوئی مسلمان نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالی سے دعا کرے گا تو اللہ تعالی اس کی دعا ضرور قبول کرے گا"۔حضرت ابن سلام نے فرمایا، کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ "جو کسی جگہ بیٹھے اور نماز کا انتظار کر رہا ہو تو نماز پڑھنے تک گویا وہ نماز ہی میں مشغول رہا"۔

مسند احمد میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں: نبی کریم ﷺ سے

کہا گیا کہ کس وجہ سے اس دن کا نام جمعہ رکھا گیا، آپ نے فرمایا: اس لئے کہ اس دن تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو شکل دی گئی اور اسی دن فنا اور حشر ہوگا اور گرفت ہوگی، اسی میں تین آخری گھڑیاں ہیں، جن میں سے ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس میں جو دعا بھی کی جائے گی، قبول ہوگی‘‘۔(۱)

ابن اسحاق نے عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے کہا کہ میرے والد جب نابینا ہوگئے تو میں ان کو لے کر نماز جمعہ کے لئے جاتا تھا، جب وہ جمعہ کی اذان سنتے تو اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے لئے دعائے استغفار کرتے، میں نے دریافت کیا کہ آپ ہر جمعہ کی اذان سنتے ہیں تو اسعد بن زرارہ کے لئے دعائے استغفار کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے! اسعد بن زرارہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ہم لوگوں کو ہزم النبیت کے بنی بیاضہ کے محلے میں جمعہ پڑھایا جو کہ نقیع خضمات کے نام سے معروف تھا، میں نے پوچھا آپ کی تعداد کتنی تھی؟ انہوں نے کہا چالیس۔ امام بیہقی کہتے ہیں، یہ حدیث حسن اور صحیح الاسناد ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے

---

(۱) مسند احمد ۲/ ۳۱۱ اور اس کی سند ضعیف ہے۔

اور قباء میں دوشنبہ، منگل، بدھ اور جمعرات تک قیام پذیر ہو کر مسجد قباء کی بنیاد ڈالی۔ پھر وہاں سے جمعہ کے دن روانہ ہوئے اور جب بنی سالم بن عوف کے علاقے میں پہنچے تو جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا، آپ نے وادی کے اندر واقع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ جمعہ اس مسجد کی تعمیر سے قبل پڑھا گیا تھا۔

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جو پہلا خطبہ دیا وہ مجھے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کے واسطے سے پہنچا، ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کریں جو آپ نے نہ فرمائی ہو، آپ نے خطبہ دیتے ہوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا: لوگو! اپنے لئے عمل کا ذخیرہ آگے بھیجو، تمہیں ضرور علم ہوگا، جب تم پر اچانک موت آئے گی اور بندہ اپنی بکریوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ جائے گا پھر اس سے اللہ تعالیٰ بغیر ترجمان اور بغیر واسطے کے فرمائے گا: کیا ہمارے رسول نے تیرے پاس آکر ہمارے احکام نہیں سنائے تھے؟ اور کیا ہم نے تمہیں مال نہیں دیا تھا؟ اور تم پر احسان نہیں کیا تھا؟ پھر تم نے اپنے لئے کیا آگے بھیجا ہے؟ وہ دائیں بائیں نظر ڈالے گا تو کچھ نہ دیکھ سکے گا پھر آگے دیکھے گا تو جہنم کے علاوہ کچھ نہ دیکھے گا۔ اس لئے جو شخص اپنے آپ کو جہنم سے بچا سکے خواہ کھجور کے ٹکڑے ہی سے تو ضرور بچا لے۔ جس کے پاس یہ بھی نہ ہو تو اچھی بات ہی بولے، اس لئے کہ اس سے بھی نیکی کا دس گنا سے

سات سو گنا تک ثواب ملتا ہے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔(۱)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے دوسری مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں، اور اپنے نفوس کے شر سے اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بے شک سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے، جس کے دل کو اللہ نے قرآن سے مزین کیا اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل کیا وہ یقیناً کامیاب رہا، اور اپنی بات کو دوسروں کی باتوں کے مقابلے میں منتخب کرلیا کیونکہ یہ بہترین کلام ہے اور سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ جس سے اللہ محبت رکھے، تم بھی اس سے محبت کرو، اپنے دل کی ساری محبت اللہ کے لئے کردو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ، تمہارے قلوب اس کے متعلق کھوٹے نہ ہو جائیں، کیونکہ اللہ تعالی نے اسے بہترین عمل اور صالح

(۱) یہ خطبہ سیرت ابن ہشام ۱/۵۰۰ میں مذکور ہے۔

ترین کلام کا نام دیا ہے اوراس میں تمام حلال وحرام جوانسانوں کو بتلائے گئے،موجود ہیں۔

لہذا اللہ تعالی کی عبادت کرو اوراس کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کرو اوراس سے کما حقہ ڈرو اور جو بات تم اپنے منہ سے نکالتے ہو،اس کے بہتر الفاظ سے اللہ کی تصدیق کرو،اوراللہ کی رحمت سے آپس میں محبت کرو۔بے شک اللہ تعالی اس پر ناراض ہوتا ہے کہ اس کا وعدہ توڑا جائے۔والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔(۱)

(۱) دیکھئے سیرت ابن ہشام ۲/۵۰۰

فصل (۱۴)

یوم جمعہ کی عظمت اور فضیلت کا بیان

نبی کریم ﷺ اس دن (یوم جمعہ) کو بڑی عظمت وشرف کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور اسے چند خصوصیات سے مخصوص کیا کرتے تھے، چنانچہ پہلی خصوصیت: اس دن کی فجر کی نماز میں (الم سجدہ اور ھل اتی علی الانسان) پڑھا کرتے تھے کیونکہ یہ سورتیں ایسے مضامین پر مشتمل ہیں جو اس دن ہوئے یا آئندہ اس دن میں واقع ہوں گے۔

دوسری خصوصیت: یہ ہے کہ جمعہ کے دن اور اس کی شب میں نبی کریم ﷺ پر کثرت سے درود وسلام بھیجنا مستحب ہے کیونکہ اس امت کو دینی ودنیوی ہر طرح کی بھلائی آپ ہی کے ذریعہ ملی ہے اور سب سے بڑی عزت بھی انہیں اسی دن ملے گی کیونکہ امت کو جنت میں اسی دن ان کے محلات اور منازل کی طرف بھیجا جائے گا اور داخلہ کے بعد اسی دن مزید نعمتوں سے نوازے جائیں گے۔ قیامت کے دن اللہ کا قرب اور انعام میں کثرت جمعہ کے دن امام سے قرب اور نماز جمعہ میں سبقت حاصل کرنے والوں کے لئے ہے۔

تیسری خصوصیت: جمعہ کے دن غسل کرنا ہے اور اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ عضو خاص کو چھونے، نکسیر پھوٹنے اور قے ہونے پر وضو کے وجوب اور آخری تشہد میں نبی

کریم ﷺ پر درود پڑھنے کے وجوب سے زیادہ واجب جمعہ کا غسل ہے۔

چوتھی خصوصیت : جمعہ کے دن خوشبو لگانا، مسواک کرنا ہے۔ جمعہ کے دن ان کا اہتمام دوسرے دنوں سے زیادہ افضل ہے۔اس طرح نماز جمعہ کے لئے سویرے نکلنا، اللہ کے ذکر میں مشغول ہونا اور امام کے آنے تک نماز وغیرہ میں مصروف رہنا اس دن کی خصوصیات ہیں۔

پانچویں خصوصیت : خطبہ کے دوران خاموشی اختیار کرنا ،چھٹی خصوصیت : سورہ الجمعہ، المنافقون، سورہ الأعلی، اور سورہ الغاشیہ کی قراءت کرنا ہے۔

ساتویں خصوصیت: جمعہ کے دن اچھا لباس زیب تن کرنا ہے۔

آٹھویں خصوصیت: جمعہ کے لئے پیدل جانے والے کو ہر قدم کے بدلے ایک سال کے روزے اور قیام اللیل کا اجر ملتا ہے۔

نویں خصوصیت: یہ ہے کہ اس دن گناہ معاف کئے جاتے ہیں۔

دسویں خصوصیت: یہ ہے کہ اس دن ایک ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ جمعہ کا خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور آپ پر جلال کی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے کوئی حملہ سے ڈرا رہا ہو اور

کہہ رہا ہو کہ لوگو! دشمن صبح وشام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے، نیز آپ کی عادت مبارکہ خطبہ مختصر دینے اور نماز طویل کرنے کی تھی، اور امابعد کہنے کے بعد خطبہ شروع فرماتے اور صحابہ کرام کو اسلام کی بنیادیں اور شریعت کے قوانین سکھلاتے اور جب کبھی کسی کام کے حکم یا ممانعت کی ضرورت ہوتی تو آپ خطبہ میں بتا دیتے یا منع کر دیتے جیسا کہ خطبہ دیتے وقت ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا ''دو رکعت نماز پڑھ لو''۔

خطبہ میں وقت کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق تقریر فرماتے، جب کسی کو آپ ضرورت مند یا بھوکا دیکھتے تو صحابہ کرام کو صدقے کا حکم دیتے اور اس کی ترغیب دیتے تھے۔

خطبہ میں آپ دعا میں یا اللہ تعالی کا ذکر کرتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ جب بارش کی ضرورت ہوتی تو خطبہ میں اس کے لئے دعا کرتے تھے۔ جمعہ کے لئے جب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تو آپ تشریف لاتے اور سلام کر کے منبر پر تشریف لے جاتے پھر اپنا چہرہ مبارک لوگوں کی طرف کر لیتے اور لوگوں کو سلام کرتے پھر حضرت بلال اذان دیتے، اذان کے بعد آپ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور کمان یا عصا کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے۔

آپ ﷺ کے منبر میں تین سیڑھیاں تھیں۔منبر بننے سے پہلے آپ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے تھے اور یہ منبر مسجد کے درمیان میں نہیں بلکہ مغربی سمت میں اس طرح رکھا گیا تھا کہ اس کے اور دیوار کے بیچ بکری گزرنے بھر کی جگہ تھی۔ جب جمعہ کے علاوہ اس پر بیٹھتے یا جمعہ کے دن خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تو صحابہ کرام اپنا رخ آپ کی طرف کر لیتے تھے۔آپ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے پھر کچھ دیر بیٹھ جاتے ، پھر کھڑے ہو کر دوسرا خطبہ دیتے ۔ جب آپ خطبہ سے فارغ ہو جاتے تو حضرت بلال اقامت کہتے تھے۔

آپ ﷺ لوگوں کو قریب ہو جانے اور خاموش رہنے کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس بیٹھے ساتھی سے یہ کہے کہ خاموش ہو جاؤ تو اس نے بھی ایک لغو حرکت کی اور اپنا جمعہ خراب کیا۔

جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر آپ گھر تشریف لے جاتے تھے اور دو رکعت سنت ادا فرماتے تھے۔

آپ نے جمعہ کے بعد چار رکعت سنت کا بھی حکم دیا ہے۔علامہ ابن تیمیہ کا قول ہے کہ جب مسجد میں پڑھے تو چار رکعت اور اگر گھر میں پڑھے تو دو رکعت پڑھے۔

فصل (۱۵)

آپ ﷺ کی نمازعیدین کا طریقہ

نبی کریم ﷺ عیدین کی نمازعیدگاہ میں پڑھتے تھے۔ یہ عیدگاہ مدینہ کے مشرقی دروازے پر ہے جہاں حاجیوں کے اونٹوں کے کجاوے رکھے جاتے تھے۔مسجدنبوی میں عیدکی نمازصرف ایک مرتبہ بارش ہوجانے کی وجہ سے پڑھی تھی جیسا کہ سنن ابوداود کی روایت سے پتہ چلتا ہے۔(۱)

عید میں آپ بہترین لباس زیب تن فرماتے تھےاورعیدالفطر میں نکلنے سے پہلے چندکھجوریں کھالیتے تھےجن کی تعداد طاق ہوتی تھی لیکن عیدالاضحیٰ میں عیدگاہ سے واپس آجانے تک کچھ نہ کھاتے بلکہ عیدگاہ سے واپسی پرقربانی کا گوشت تناول فرماتے ۔ عیدین کے دن آپ ﷺ غسل کرتے تھے۔اس سلسلہ میں دوضعیف حدیثیں ہیں لیکن حضرت ابن عمررضی اللہ عنہما کے عمل سے ثابت ہے جو غیرمعمولی طورپرمتبع سنت تھے۔آپ عیدگاہ پیدل تشریف لے جاتے ۔ وہاں پہنچنے پر نیزہ بطورسترہ آپ کے سامنےنصب کردیا جاتا کیونکہ ان عیدگاہ میں کوئی عمارت نہ تھی۔عیدالفطرکی نمازقدرے تاخیرسےاورعیدالاضحیٰ کی نمازجلدی ادا فرماتے تھے۔ابن عمررضی اللہ عنہما اپنے غیر

(۱)اس کے ثابت ہونے میں اختلاف ہے۔

معمولی متبع سنت ہونے کے باوجود سورج نکلنے سے پہلے عیدگاہ کے لئے روانہ نہیں ہوتے تھے اور گھر سے عیدگاہ تک تکبیر کہتے جاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ جب عیدگاہ پہنچ جاتے تو بغیر اذان واقامت یا (الصلاۃ جامعۃ) جیسے کلمات کہے بغیر نماز شروع فرمادیتے تھے۔ نماز عیدین سے پہلے یا بعد آپ یا صحابہ کرام کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔

خطبہ سے پہلے آپ دو رکعت نماز عید پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت میں تکبیر اولی سمیت سات تکبیریں مسلسل کہتے ۔ ہر دو تکبیروں کے درمیان معمولی سا وقفہ کرتے اور ان تکبیروں کے درمیان آپ سے کوئی مخصوص ذکر مروی نہیں ہے لیکن ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے مذکور ہے کہ وہ حمد وثنا اور درود پڑھتے تھے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ جب تکبیریں ختم فرماتے تو قراءت شروع کرتے، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ "ق" اور دوسری رکعت میں سورۃ القمر پڑھتے ۔ بسا اوقات دو رکعتوں میں سورہ الاعلی اور سورہ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ صحیح روایات میں کچھ اور مروی نہیں ہے، اور جب آپ قراءت سے فارغ ہوجاتے تو تکبیر کہتے اور رکوع میں چلے جاتے ، پھر دوسری رکعت میں آپ مسلسل پانچ تکبیریں کہتے اور قراءت شروع کردیتے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اٹھ کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے اور

لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ۔آپ انہیں وعظ ونصیحت فرماتے اور اچھی باتوں کا حکم دیتے ، بری باتوں سے منع کرتے ۔اگر کہیں کوئی لشکر بھیجنا ہوتا تو اس وقت بھیجتے ، کسی اور بات کا حکم دینا ہوتا تو حکم دیتے ،عیدگاہ میں کوئی منبر نہ تھا ، زمین پر کھڑے ہوکر خطبہ دیتے تھے ۔صحیحین کی حدیث میں جو ذکر ہے کہ پھر آپ اتر کر خواتین کی طرف تشریف لے گئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی اونچی جگہ پر کھڑے تھے جہاں سے اتر کر تشریف لے گئے ۔(۱)

مدینہ کا منبر (عیدگاہ میں) تو سب سے پہلے مروان بن حکم نے ایجاد کیا تھا اور لوگوں نے اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور پختہ منبر کی تعمیر سب سے پہلے کثیر بن صلت نے مدینہ میں مروان کی گورنری کے زمانہ میں کی تھی ۔

نبی کریم ﷺ نے خطبہ عید کے موقع پر لوگوں کو بغیر خطبہ سنے گھر چلے جانے کی بھی اجازت دی ہے ۔اسی طرح جب جمعہ کے دن عید پڑ جائے تو اس کی رخصت دی ہے کہ جمعہ کی نماز میں شریک نہ ہوں اور صرف عید کی نماز پر اکتفا کرلیں اور ظہر کی نماز ادا کریں ۔

(۱) صحیح بخاری ۹۷۸، وصحیح مسلم ۸۸۵

نبی کریم ﷺ عید کے دن عیدگاہ جاتے وقت مختلف راستوں سے آتے جاتے تھے۔

آپ سے مروی ہے کہ عرفہ کے دن (نویں تاریخ) فجر کی نماز سے ایام تشریق کے آخری دن عصر تک یہ تکبیر کہتے تھے "اللّٰهُ أَكبَرُ، اللّٰهُ أَكبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، واللّٰهُ أَكبَرُ، اللّٰهُ أَكبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ "

فصل (١٦)

آپ ﷺ کا سورج گرہن کے موقع پر اسوہ حسنہ

سورج گرہن کے موقع پر نبی کریم ﷺ تیزی اور گھبراہٹ میں چادر گھسیٹتے ہوئے ایک مرتبہ مسجد تشریف لائے۔کسوف شمس کی کیفیت یہ تھی کہ دن کے شروع میں دو یا تین نیزے تک آفتاب بلند ہوا تھا کہ گہن میں آ گیا۔مسجد میں آنے کے بعد آپ نے فوراً دو رکعت نماز ادا فرمائی۔پہلی رکعت میں سورۃ الفاتحہ اور ایک طویل سورہ بآواز بلند تلاوت فرمائی اور پھر طویل رکوع کیا اور پھر رکوع سے سر اٹھایا اور دیر تک کھڑے رہے لیکن یہ قیام پہلے قیام سے کم تھا۔رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے ''سمع اللہ لمن حمدہ ربنا ولک الحمد'' کہا پھر قراءت شروع کی پھر طویل رکوع کیا جو پہلے رکوع سے مختصر تھا، پھر آپ نے سجدہ کیا جو طویل تھا اور دوسری رکعت بھی اسی طرح ادا فرمائی۔یعنی آپ ﷺ نے دو رکعت میں چار رکوع اور چار سجدے کئے۔

آپ ﷺ نے اس نماز میں جنت اور جہنم کا مشاہدہ کیا اور جنت سے انگور کا ایک خوشہ توڑنے کا ارادہ کیا کہ صحابہ کرام کو دکھا سکیں اور دوزخ میں دوزخیوں کو دیکھا، اس میں ایک عورت کو دیکھا کہ اسے ایک بلی نوچ رہی ہے، جسے عورت نے باندھ دیا تھا اور وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے مر گئی تھی۔عمرو بن مالک کو دیکھا کہ وہ آگ میں اپنی

آنتوں کوگھسیٹ رہا ہے۔ یہ پہلا شخص تھا، جس نے حضرت ابراہیم کے دین میں تبدیلی پیدا کی تھی ، اوراس میں حاجیوں کے ایک چور کوبھی عذاب میں مبتلا دیکھا۔نماز سے فراغت کے بعد آپ نے ایک فصیح وبلیغ خطبہ دیا۔امام احمد سے مروی ہے کہ آپ نے حمد وثنااورکلمہ طیبہ کی گواہی دینے کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کی تبلیغ میں کوئی کوتاہی کی ہے" کچھ لوگوں نے کھڑے ہوکر عرض کیا: ہم لوگ گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور آپ نے امت کونصیحت فرمائی اوراپنے فرائض منصبی کوبحسن وخوبی ادافرمادیا، پھر آپ نے فرمایا: "امابعد: بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سورج یا چاند کا گہن میں آنا یاان ستاروں کا اپنے برجوں سے ہٹ جانا اہل زمین کے بڑے بڑے لوگوں کی موت کے باعث ہوتا ہے، یقیناً ان کا یہ عقیدہ غلط اور باطل ہے۔ یہ تو اللہ تعالی کی نشانیاں ہیں جن سے اس کے بندے عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اللہ تعالی دیکھتا ہے، ان میں سے کون توبہ کرتا ہے ، بخدا میں نے کھڑے ہوکر وہ چیزیں دیکھیں جوتم کو دنیا اور آخرت میں پیش آنے والی ہیں اور خدا کی قسم قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک تیس کذاب نہ آجائیں گے۔ان میں آخری کا نام دجال ہوگا، جس کی بائیں آنکھ مسخ ہوگی گویا کہ ابو یحی (ایک انصاری

بوڑھے جو آپ کے اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے درمیان موجود تھے) کی آنکھ ہو۔ یہ دجال نکلنے کے بعد خدائی کا دعوی کرے گا۔ جو شخص اس کو سچا سمجھ کر ایمان لے آئے گا اور اس کی اتباع کرے گا تو اسے اس کا کوئی عمل صالح کام نہ دے گا اور جو اس کا انکار اور اس کی تکذیب کرے گا اس کو اس کے گزشتہ برے عمل کی سزا نہیں ملے گی۔ وہ حرم اور بیت المقدس کے علاوہ ساری سرزمین پر غالب آجائے گا اور مسلمانوں کو بیت المقدس میں محصور کردے گا۔ وہ اس وقت شدید دہشت زدہ ہوجائیں گے تب اللہ تعالی دجال اور اس کے لشکر کو ہلاک کردے گا، دیواروں کی بنیادیں اور درختوں کی جڑیں پکار پکار کر کہیں گی کہ اے مسلمان! اے مومن! یہ یہودی، یہ کافر ہے، اسے قتل کردے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ یہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک تم بھیانک اور خطرناک چیزوں کو دیکھو گے اور تم لوگ آپس میں پوچھو گے کہ نبی کریم ﷺ نے ان چیزوں میں سے کس کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد پہاڑ اپنی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور ہر چیز فنا ہوجائے گی"۔ (۱)

ایک دوسری روایت میں آیا کہ: آپ نے ہر رکعت تین رکوع یا چار رکوع سے پڑھی

(۱) مسند احمد ۵/۱۶ بروایت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ

یا ہر رکعت ایک رکوع سے ادا فرمائی لیکن ائمہ کبار اس کی صحت کے قائل نہیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے سورج گرہن کے موقع پر ذکر اللہ، نماز، دعا، استغفار، صدقہ اور غلاموں کی آزادی کا حکم دیا ہے۔

فصل (۱۷)

آپ ﷺ کی نماز استسقاء کا طریقہ

نبی کریم ﷺ سے بارش طلب کرنے کے متعدد طریقے ثابت ہیں:

پہلا طریقہ: جمعہ کے دن منبر پر دوران خطبہ آپ نے بارش کے لئے دعا فرمائی۔

دوسرا طریقہ: نبی ﷺ نے لوگوں سے عیدگاہ چلنے کا وعدہ کیا، چنانچہ سورج طلوع ہونے کے بعد آپ انتہائی تواضع، انکساری، عاجزی اور خشوع وخضوع کی کیفیات کے ساتھ نکلے اور وہاں پہنچ کر منبر پر چڑھے۔ (اس روایت کی صحت میں کچھ تردد ہے) اور اللہ تعالی کی حمد وثنا بیان فرمائی پھر آپ نے درج ذیل خطبہ دیا:

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے اور روز جزا کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اے اللہ! تو ہی معبود برحق ہے، تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو جو چاہتا ہے کرتا ہے، تو بے نیاز اور ہم محتاج ہیں، ہمارے لئے بارش نازل فرما اور بارش کو ہمارے لئے قوت اور سہارا بنا دینا"۔ (۱)

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور تضرع وعجز وانکساری سے دعا میں مشغول

---

(۱) ابوداود ۱۱۷۳

ہوگئے اور ہاتھ اتنا اونچا اٹھالیا کہ دونوں بغلوں کی سفیدی ظاہر ہوگئی پھر آپ لوگوں کی طرف پشت کر کے قبلہ رخ ہوگئے اور اپنی چادر کو پلٹ دیا۔ چنانچہ دائیں طرف کو بائیں اور بائیں کو دائیں طرف کرلیا۔ آپ کے بدن پر سیاہ چادر تھی اور اس طرح قبلہ رخ ہوکر آپ ﷺ اور صحابہ کرام دعاؤں میں مشغول ہوگئے۔

پھر آپ نے منبر سے اتر کر اذان واقامت کے بغیر عید کی طرح دو رکعت نماز ادا فرمائی جس کی پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورۃ الاعلی اور دوسری رکعت میں سورہ الغاشیہ پڑھی۔

تیسرا طریقہ: یہ منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے منبر پر جمعہ کے دن کے علاوہ صرف بارش کے لئے دعا فرمائی۔ اس موقع پر آپ سے کوئی نماز منقول نہیں ہے۔

چوتھا طریقہ: یہ منقول ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئی ہاتھ اٹھا کر آپ ﷺ نے بارش کے لئے دعا فرمائی۔

پانچواں طریقہ: یہ منقول ہے کہ آپ نے زوراء کے قریب دعا مانگی جو مسجد کے دروازے سے باہر ہے اور جسے آج کل باب السلام کہتے ہیں۔ (۱)

چھٹا طریقہ: یہ مذکور ہے کہ آپ نے کسی غزوہ میں اس وقت دعا کی جب مشرکین

---

(۱) ابوداود ۱۱۶۸، ترمذی ۵۵۷

نے سبقت کر کے پانی پر قبضہ کرلیا تھا اور مسلمان پیاس کی شدت سے بے حال ہو رہے تھے، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی فریاد کی۔ اس موقع پر بعض منافقین کہنے لگے، جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا مانگی تھی اگر یہ نبی برحق ہیں تو یہ بھی اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا کریں۔ آپ کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا، کیا انہوں نے یہ کہا ہے، اب امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور پانی دے گا۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ اللہ کی جناب میں دعا کرنے کے لئے اٹھائے۔ ابھی ہاتھ نہ ہٹائے تھے کہ بادلوں نے سایہ کرلیا اور بارش شروع ہوگئی۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے جب بارش کی دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا اور بارش ضرور ہوئی۔

ایک مرتبہ آپ نے بارش کے لئے دعا فرمائی تو ابولبابہ صحابی نے کھڑے ہوکر عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کھجوریں کھلیانوں میں پڑی ہیں، آپ نے فرمایا، اے اللہ! ہمیں سیراب کر یہاں تک کہ ابولبابہ ننگے ہوکر اپنے کھلیان کے راستوں کو اپنے ازار سے بند کرنے لگے، چنانچہ بارش ہونے لگی اور لوگ ابولبابہ کے پاس آئے، کہنے لگے جب تک آپ ننگے کھڑے ہوکر اپنے کھلیان کے راستے کو ازار سے بند نہ کریں گے، بارش

بند نہ ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو بارش بند ہوگئی۔

جب بارش کبھی زیادہ ہونے لگتی تو صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے اس کے بند ہونے کے لئے دعا کی درخواست کرتے تھے، اس وقت آپ یہ دعا فرماتے تھے:

" اَللّٰھُمَّ حَوَالَیْنَا وَلَا عَلَیْنَا، اَللّٰھُمَّ عَلَی الظِّرَابِ والْاٰکَامِ والجِبَالِ، وَبُطُوْنِ الْأَوْدِیَةِ، وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ "

اے اللہ! ہمارے اردگرد ہو اور ہمارے اوپر نہ ہو، اے اللہ! ٹیلوں اور پہاڑوں اور وادیوں کے علاقے میں اور درختوں کی جڑوں پر بارش کر۔

نبی کریم ﷺ جب بارش دیکھتے تو یہ فرماتے تھے: "اَللّٰھُمَّ صَیِّبًا نَّافِعًا" (۱)

اے اللہ! بارش کو نفع بخش بنا۔

اور اپنا کرتا اتار دیتے تھے تاکہ جسم مبارک پر بارش کا پانی پڑے۔ آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے تازہ ترین نعمت ہے۔ (۲)

امام شافعی کا بیان ہے کہ مجھے ایک معتبر شخص نے یزید بن الہاد کے واسطے سے خبر دی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ جب سیلاب آتا تھا تو

---

(۱) صحیح بخاری ۱۰۳۲

(۲) صحیح مسلم ۸۹۸

آپ فرماتے تھے "آؤ ہمارے ساتھ اس پانی کی طرف، جسے اللہ تعالیٰ نے طاہر بنایا ہے ہم اس سے طہارت حاصل کریں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کریں" (۱) امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے ایک معتبر شخص نے اسحاق بن عبداللہ کے واسطے سے خبر دی ہے کہ جب سیلاب آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کے ساتھ سیلاب تک گئے اور فرمایا کہ ہم میں سے ہر ایک اس سے طہارت حاصل کرے۔

رسول اللہ ﷺ جب بادل یا آندھی دیکھتے تو چہرے سے اس کے آثار ظاہر ہوجاتے اور آپ بے چینی سے ٹہلنے لگتے تھے۔ جب بارش ہوجاتی تو گھبراہٹ کے آثار دور ہوجاتے کیونکہ آپ کو خطرہ محسوس ہوتا کہ کہیں یہ عذاب نہ ہو۔

(۱) دیکھئے بیہقی: ۳/۳۵۹ اور یہ سند منقطع ہے۔

فصل (۱۸)

آپ ﷺ کا دوران سفر عبادتوں کا طریقہ

نبی کریم ﷺ کے سفر چار طرح کے ہوئے تھے:

(۱) سفر ہجرت (۲) سفر جہاد، یہ سفر اکثر وبیشتر ہوتے رہتے تھے (۳) سفر عمرہ (۴) سفر حج۔

جب آپ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی کرتے اور جس کا نام نکل آتا اس کو ساتھ لے جاتے، اور سفر حج میں تمام ازواج مطہرات کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

جب آپ سفر کرتے تو دن کے پہلے پہر میں نکلتے۔ جمعرات کے دن نکلنا زیادہ پسند کرتے اور آپ اللہ تعالی سے یہ دعا فرماتے کہ ''اے اللہ امت کے سویرے کے کاموں میں برکت عطا فرما''۔

جب آپ کوئی لشکر یا وفد بھیجنا چاہتے تو اسے بھی دن کے پہلے پہر بھیجتے۔ مسافروں کو آپ تاکید فرماتے کہ اگر وہ تین ہوں تو ایک کو امیر بنالیں۔ آپ نے تنہا سفر کرنے سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ ''ایک سوار شیطان ہے، دوسوار دو شیطان ہیں اور تین مسافر ہیں جن سے دراصل قافلہ بنتا ہے''۔(۱)

(۱) ابوداود ۲۶۰۷ اور اس کی سند حسن ہے۔

اور ثابت ہے کہ جب آپ سفر کے لئے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے:

" اللّٰھُمَّ إِلَيْكَ تَوَجَّھْتُ ،وَبِكَ اعْتَصَمْتُ، اللّٰھُمَّ اكْفِنِي مَاأَھَمَّنِي وَمَالَاأَھْتَمُّ لَهُ،اللّٰھُمَّ زَوِّدْنِي التَّقْوَى وَاغْفِرْلِي ذَنْبِي وَوَجِّھْنِي لِلْخَيْرِ أَيْنَمَا تَوَجَّھْتُ "

اے اللہ! تیری ہی طرف متوجہ اور تیری ہی پناہ پکڑا ہوں۔ اے اللہ! میرے لئے اہم اور غیر اہم ہر چیز میں میری کفایت کر، تقوی کو میرا توشہ بنا، میرے گناہ بخش دے، جدھر توجہ کروں بھلائی کی طرف میرا رخ کر۔(۱)

جب سواری حاضر کی جاتی تو رکاب میں پیر رکھتے ہوئے بسم اللہ کہتے اور جب جم کے بیٹھ جاتے تو فرماتے:

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ "

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمارے لئے اسے مسخر کر دیا، ورنہ ہم خود اسے زیر نہ کر سکتے تھے، ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

---

(۱) ابن السنی نے عمل الیوم واللیلۃ ۲/ ۴۹۵ میں ذکر کیا ہے، اور یہ ضعیف ہے۔

پھر تین مرتبہ ''الحمدللہ'' اور تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہتے اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

" سُبْحَانَكَ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْلِي، إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ "(۱)

تو سارے عیوب سے پاک ہے، بلاشبہ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا، تو مجھے بخش دے تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا۔

آپ یہ بھی پڑھتے تھے:

" اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ فِي سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى، وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْأَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ "

اے اللہ! ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی وتقوی اور اس پر عمل کا سوال کرتے ہیں جس سے تو راضی ہو، اے اللہ! ہم پر ہمارا سفر آسان کردے اور ہمارے لئے اس کی دوری لپیٹ دے، اے اللہ! سفر میں تو ہی آقا ہے اور گھر میں تو ہی محافظ ہے، اے اللہ!

(۱) ابوداود: ۲۶۰۲، ترمذی ۳۴۴۳

میں سفر کی تکلیف اور برے منظر سے اور گھر اور مال و دولت میں تکلیف دہ واپسی سے پناہ چاہتا ہوں۔

جب آپ سفر سے واپس آتے تو مذکورہ دعا میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیتے:

”آ ئِبُو نَ، تَائِبُو نَ، عَابِدُو نَ لِرَبِّنَا حَامِدُو نَ“

ہم لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، بندگی کرنے والے، اور اپنے پروردگار کی تعریف کرنے والے ہیں۔(۱)

نیز آپ اور صحابہ کرام جب بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نیچے وادیوں میں اترتے تو تسبیح کہتے، اور جب کسی بستی کے پاس آتے اور اس میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

”اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبعِ وَمَا أَظْلَلْنَ، وَرَبَّ الْأَرَضِينَ السَّبعِ وَمَا أَقْلَلْنَ، وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا أَضْلَلْنَ، وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ. أَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ أَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا، وَشَرِّ أَهْلِهَا، وَشَرِّ مَا فِيْهَا “

اے ساتوں آسمانوں اور ان کے زیر سایہ چیزوں کے پروردگار! ساتوں زمینوں

(۱) صحیح مسلم:۱۳۴۲

اور ان کی اٹھائی چیزوں کے پروردگار! شیاطین اور ان کے گمراہ کردہ لوگوں کے پروردگار، !ہواؤں اوران کی پراگندہ کی ہوئی چیزوں کے پروردگار! میں تجھ سے اس بستی کی اوراس میں رہنے والے لوگوں کی اوراس کی تمام چیزوں کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں، اوراس بستی کی اوراس کے تمام رہنے والوں کی اوراس میں موجود تمام چیزوں کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔(۱)

نبی کریم ﷺ سفر کی حالت میں چار رکعت والی نماز کو دو رکعت پڑھتے تھے۔ حضرت امیہ بن خالد، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کرتے ہیں ہم حضر اور حالت خوف کی نماز کا تذکرہ قرآن کریم میں پاتے ہیں لیکن سفر کی نماز کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے کہا کہ اے ہمارے بھائی! اللہ تعالی نے حضرت محمد ﷺ کو ہمارے پاس اس وقت مبعوث فرمایا جب ہم لوگ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔اب ہم اسی طریقے سے عمل کرتے ہیں، جس طرح آپ کو کرتے دیکھا ہے۔

سفر کے دوران نبی کریم ﷺ کی سنت یہ تھی کہ آپ فرض پر اکتفا کرتے تھے، سنتوں میں فجر کی سنت اور نماز وتر کے علاوہ سفر میں کچھ اور پڑھنا ثابت نہیں، لیکن آپ

---

(۱) صحیح ابن حبان ۲۷۰۹ اس کے اور بھی شواہد ہیں۔

نے نوافل پڑھنے سے منع نہیں فرمایا ہے لیکن اس کی حیثیت سنت موکدہ کی نہیں بلکہ محض نفل ہی کی رہتی ہے، آپ سے یہ ثابت ہے کہ فتح کے دن چاشت کے وقت آپ نے آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔

سفر میں نبی کریم ﷺ نفل نمازیں سواری پر پڑھتے تھے خواہ اس کا رخ کسی طرف بھی ہو، رکوع آپ اشارہ سے کرتے تھے۔ جب آپ زوال سے پہلے سفر شروع کرنے کا ارادہ رکھتے، ظہر کو عصر تک موخر کردیتے، اگر زوال کے بعد سفر کرتے تو ظہر پڑھ کر سوار ہوتے تھے۔ اگر کسی سفر میں جلدی ہوتی تو مغرب کی نماز موخر کر کے عشاء کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اور سواری پر یا سواری سے اتر کر دو نمازوں کو جمع کرنا آپ کی سنت مطہرہ نہیں ہے۔

فصل (۱۹)

آپ ﷺ کے تلاوت قرآن کا طریقہ

نبی کریم ﷺ اپنے معمول کی پابندی کرتے تھے، آپ قرآن پاک ترتیل سے (ایک ایک حرف واضح کرکے) پڑھا کرتے تھے، ایک ایک آیت پر وقفہ کرتے، مد کے حروف کو کھینچ کر پڑھتے مثلا (الرحمٰن الرحیم) کو کھینچ کر پڑھتے تھے اور تلاوت کے آغاز میں آپ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھتے اور کبھی یہ کہتے تھے:

" اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ مِنْ هَمْزِهِ وَنَفْخِهِ وَنَفْثِهِ "

میں شیطان رجیم اور اس کے وسوسہ، اس کی پھونک اور اس کے جادو سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

آپ ﷺ دوسروں کی زبان سے قرآن سننا بھی پسند فرماتے تھے، آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کو حکم فرمایا تو انہوں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، آپ کو سنتے وقت اس قدر خشوع طاری ہوا کہ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو جاری ہو گئے۔

آپ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، باوضو اور بغیر وضو ہر حالت میں قرآن پڑھتے تھے لیکن حالت جنابت میں قرآن نہیں پڑھتے تھے۔

آپ کبھی کبھی آواز کھینچ کر بہترین انداز میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ آپ کی آواز کی کیفیت تین مرتبہ آ۔آ۔آ کی صورت میں بیان کی ہے جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کیا ہے۔

جب آپ سے منقول مندرجہ ذیل احادیث کو جمع کیا جائے:

”زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ“

قرآن پاک کو اپنی آوازوں سے زینت بخشو۔(۱)

”مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْءٍ كَإِذْنِهِ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنَّى بِالْقُرْآنِ“

اللہ تعالیٰ اچھی آواز والے نبی کے قرآن کا نغمہ کے ساتھ پڑھنے کو جس طرح سنتا ہے اس طرح کسی اور چیز کو نہیں سنتا۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی آواز کو قصداً اور اختیار سے کھینچتے تھے جیسا کہ عبداللہ بن مغفل سے مروی ہے۔

نغمہ وترنم دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک جو بلا تکلف ہو، یہ جائز ہے خواہ قصداً تزیین کی جائے کیونکہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ

(۱) صحیح بخاری:۵۰۲۴ وصحیح مسلم ۷۹۲

میرا قرآن آپ سن رہے ہیں تو میں اور اچھی طرح پڑھتا۔(۱) سلف اسی طرح کی تحسین کیا کرتے تھے اور اسی مفہوم پر تمام دلیلوں کو محمول کیا جائے گا۔

غنا کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسے فن کی طرح الحان اور اوزان کی قسموں کے ساتھ سیکھا جائے اس کو سلف نے مکروہ قرار دیا ہے اور کراہت کی دلیلوں سے یہی صورت مراد ہے۔

(۱) مجمع الزوائد: ۷/ ۱۷۰

فصل (۲۰)

آپ ﷺ کا مریضوں کی عیادت کا طریقہ

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب صحابہ کرام میں کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک یہودی خادم اور اپنے مشرک چچا کی عیادت کے لئے بھی تشریف لے گئے اور ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ یہودی نے اسلام قبول کر لیا۔

آپ مریض کے قریب تشریف لے جاتے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر حال دریافت فرماتے تھے۔

دائیں ہاتھ سے مریض کو سہلاتے اور یہ دعا پڑھتے تھے:

"اللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ أَذْهِبِ الْبَأْسَ وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَائُكَ شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا"

اے اللہ لوگوں کے پروردگار! دکھ دور فرما، اور شفا عطا فرما، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا کے سوا کہیں سے کوئی شفا نہیں۔ ایسی شفا جو کسی بیماری کو رہنے نہ دے۔ (۱)

اور آپ مریض کے لئے تین بار دعا فرماتے تھے، جیسا کہ آپ حضرت سعد رضی

(۱) صحیح بخاری: ۵۷۴۳، صحیح مسلم: ۲۱۹۱

اللہ عنہ کے لئے دعا کی: ''اللّٰهُمَّ اشْفِ سَعداً'' (اے اللہ سعد کو شفا دے)۔(۱)

مریض کی عیادت کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے ''لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللّٰه''(۲)

کبھی ''کفارة وطهورة'' فرماتے تھے یعنی کوئی فکر کی بات نہیں۔ ان شاء اللہ یہ بیماری گناہوں سے پاک کرنے والی ہے۔(۳)

اور جس کو زخم یا کوئی اور تکلیف ہوتی تو آپ اس پر دم کیا کرتے، چنانچہ شہادت کی انگلی زمین پر رکھ دیتے پھر اسے اٹھا لیتے اور یہ دعا پڑھتے:

'' بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا يُشْفَى سَقِيْمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا ''

اللہ کے نام سے ہماری زمین کی مٹی ہم میں سے بعض کے لعاب سے ہمارے بیمار کو شفا دے گی، ہمارے رب کی اجازت سے۔(۴)

یہ صحیحین کی روایت ہے، اس سے ستر ہزار والی حدیث میں (لا یرقون)(۵) (جو دم نہیں کریں گے) کا لفظ بالکل باطل ہو جاتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ راوی کی غلطی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری:۵۶۵۹، صحیح مسلم:۱۶۲۸

(۲) صحیح بخاری:۳۶۱۶، ۵۶۵۶

(۳) ابن السنی فی عمل الیوم واللیلۃ ۵۳۵ اور اس کی سند حسن ہے۔

(۴) (ا) صحیح بخاری:۵۷۴۵، صحیح مسلم ۲۱۹۴

(۵) صحیح بخاری:۵۷۵۲، صحیح مسلم:۲۲۰

نبی کریم ﷺ مریض کی عیادت کے لئے کوئی دن یا کوئی وقت مقرر نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ دن اور رات کے تمام اوقات میں (حسب ضرروت) مریضوں کی عیادت فرماتے تھے اور امت کے لئے اسی کو مشروع فرمایا ہے۔

آپ آنکھ کے مریضوں کی بھی عیادت فرماتے، کبھی مریض کی پیشانی پر دست مبارک رکھتے پھر اس کے سینے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور دعا فرماتے" اے اللہ! اسے شفا دے" اور آپ چہرے پر بھی ہاتھ پھیرتے اور جب مریض کی صحت سے مایوس ہو جاتے تو یہ پڑھتے:" إناالله وإنا إليه راجعون "(۱)

جنازے کے سلسلے میں آپ کا طریقہ انتہائی کامل اور تمام دوسری قوموں سے بالکل مختلف تھا، اس میں میت اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، اور مردے کے ساتھ معاملہ کرنے میں زندہ شخص اللہ کے ساتھ اپنی بندگی وعاجزی کا اظہار کرتا ہے۔

جنازوں میں آپ کی سنت طیبہ اللہ تعالی کی پوری اطاعت وعبدیت کا اظہار تھی اور میت کو بہتر طریقے سے اللہ تعالی کی طرف بھیجتے تھے۔آپ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ صف بستہ کھڑے ہو کر اللہ تعالی کی حمد وثنا کرتے اور میت کے لئے دعائے مغفرت

(۱) مجمع الزوائد۲/۳۳۱

فرماتے اور اس کے آگے چل کر قبر میں دفن کرتے ، پھر آپ اور صحابہ کرام کھڑے ہو کر اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا فرماتے ۔ گاہے گاہے اس کی قبر پر تشریف لے جاتے اور سلام کر کے اس کے لئے دعا فرماتے تھے۔

مریض کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا شروع سے ہی سلوک ذکر آخرت ، وصیت اور توبہ واستغفار کرنے کی ہدایت پر مبنی ہوتا ، اور اس کے پاس موجود لوگوں کو حکم دیتے کہ قریب الموت مریض کو کلمہ شہادت ''لا الہ الا اللہ'' کی تلقین کرتے رہیں تا کہ کلمہ طیبہ ہی اس کا آخری کلام ہو ، پھر ان اقوام کی عادات اور طور طریقے اختیار کرنے سے منع فرماتے ، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتیں یعنی ایسے مواقع پر جو منہ پیٹتی ، چیختی چلاتی اور بے حد واویلا مچاتی ہیں۔

آپ نے میت کے لئے رونے اور اظہار رنج وافسوس کی اجازت دی ہے جس میں چیخنا وچلانا نہ ہو ، دل سے غمگین رہنے کی اجازت دی ہے ، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ ''آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین رہتا ہے اور ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا پروردگار راضی ہو''(۱) آپ نے اپنی امت کے لئے اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا مسنون قرار دیا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری:۱۳۰۳، صحیح مسلم:۲۳۱۵

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میت کی تجہیز وتدفین میں جلدی کرتے تھے۔ اوراسے غسل دیتے، خوشبو لگاتے اور سفید کپڑوں میں کفن دیتے اور پھر جنازے کی نماز پڑھتے، اوراس کے بعد قبر تک ساتھ ساتھ جاتے تھے، جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ یہ کام نبی کریم ﷺ کو تکلیف دے رہا ہے تو وہ خود میت کی تیاری کرتے پھر میت کو اٹھاتے، اور نماز جنازہ مسجد کے باہر پڑھتے اور کبھی مسجد کے اندر بھی پڑھ لیتے، جیسا کہ آپ نے سہیل بن بیضاء اوران کے بھائی کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھائی۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب کوئی انتقال کرجائے تو اس کا چہرہ اور بدن چھپادیا جائے۔اس کی آنکھیں بند کردی جائیں۔ بسا اوقات میت کوخود بوسہ دیتے جیسا کہ آپ حضرت عثمان بن مظعون کو بوسہ دے کر رو پڑے۔

آپ میت کو تین یا پانچ مرتبہ یا غسل دینے والے کے خیال کے مطابق (حسب ضرورت) زیادہ غسل دینے کا حکم دیتے تھے اور آخری مرتبہ کافور استعمال کرنے کو کہتے تھے۔

میدان جنگ کے شہداء کو غسل نہیں دیتے تھے اور ہتھیار وزرہ وغیرہ اتار کر اسی لباس میں تدفین کردیتے تھے اور نماز جنازہ بھی نہیں پڑھتے تھے، اور حالت احرام میں فوت ہوجانے والے کو آپ نے پانی اور بیری سے غسل دیا اور احرام ہی کے کپڑے میں اسے

کفن دینے کا حکم دیا اور اسے خوشبو لگانے اور سر چھپانے سے منع فرمایا۔

میت کے متعلقین کو اچھے اور سفید کپڑے کا کفن پہنانے کا حکم دیتے اور زیادہ مہنگے کفن سے منع فرماتے تھے اور اگر کفن چھوٹا ہوتا اور پورے بدن کو چھپانے سے قاصر ہوتا تو اس کا سر چھپا دیتے اور پاؤں پر گھاس ڈال دیتے تھے۔

نماز جنازہ کے لئے جب کوئی میت نبی کریم ﷺ کے سامنے لائی جاتی تو آپ دریافت فرماتے، کیا اس پر قرض ہے یا نہیں؟ اگر اس پر قرض نہ ہوتا تو اس پر نماز جنازہ پڑھ دیتے اور اگر قرض ہوتا تو خود نہ پڑھتے بلکہ صحابہ کو نماز پڑھنے کا حکم دے دیتے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعا (نماز) حصول مغفرت اور وجوب شفاعت کا حکم رکھتی ہے اور ادھر مقروض کا قرض دخول جنت کے لئے مانع ہے۔

چنانچہ جب کثرت فتوحات کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس دولت آ گئی تو آپ قرضدار پر نماز جنازہ پڑھنے لگے کیونکہ آپ اس مال کے ذریعہ اس کا قرض ادا فرما دیتے تھے اور اس کا ترکہ اس کے ورثاء کو دے دیتے تھے۔

جب آپ ﷺ نماز جنازہ شروع فرماتے تو تکبیر کہتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے پر نماز پڑھی تو پہلی تکبیر کے بعد بلند آواز سے سورہ فاتحہ پڑھی اور (بعد میں) فرمایا تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ

یہ سنت ہے۔

ہمارے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں بلکہ سنت ہے اور حضرت ابوامامہ بن سہل نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے نماز جنازہ میں درود شریف پڑھنا نقل کیا ہے۔

یحیی بن سعید انصاری نے سعید بن مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت سے نماز جنازہ کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں، ابتدا میں تکبیر کہو، پھر رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجو اور یہ دعا پڑھو:

" اللّٰهُمَّ إِنَّ عَبدَكَ فُلَانًا كَانَ لَا يُشْرِكُ بِكَ ، وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ، إِنْ كَانَ مُحسِنًا فَزِدْ فِي إِحْسَانِهِ،وَإِنْ كَانَ مُسِيْئًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ، اللّٰهُمَّ لَا تَحرِمْنَا أَجْرَهُ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَهُ "

اے اللہ! بے شک تیرا فلاں بندہ تیرے ساتھ شرک نہ کرتا تھا اور تو ہی حقیقت کو زیادہ جاننے والا ہے، اگر وہ نیک تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر برا تھا تو اس سے درگزر فرما، اے اللہ ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کرنا اور اس کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرنا۔

مردے پر نماز جنازہ کا مقصد دعائے خیر ہے، اسی وجہ سے آپ سے یہ ثابت ہے اور دعا اور آپ ﷺ پر درود کا جتنا ذکر ملتا ہے اتنا سورہ فاتحہ کا ذکر نہیں ملتا۔ آپ ﷺ سے یہ دعا بھی ثابت ہے۔

" اَللّٰھُمَّ إِنَّ فُلَانَ بْنِ فُلَانٍ فِيْ ذِمَّتِكَ، وَحَبْلِ جِوَارِكَ، فَقِهِ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ، وَأَنْتَ أَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَقِّ، فَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. "

اے اللہ! فلاں بن فلاں تیری پناہ اور تیری ہمسائیگی کی امان میں ہے، تو اسے قبر کے فتنہ اور جہنم کی آگ سے نجات دے، تو وفا اور حق والا ہے، اے اللہ! تو اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما، بیشک تو بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔(۱)

اور یہ دعا بھی منقول ہے:

" اللّٰھُمَّ أَنْتَ رَبُّھَا وَأَنْتَ خَلَقْتَهَا وَأَنْتَ رَزَقْتَهَا، وَأَنْتَ هَدَيْتَهَا لِلْإِسْلَامِ وَأَنْتَ قَبَضْتَ رُوحَهَا تَعْلَمُ سِرَّهَا وَعَلَانِيَّتَهَا، جِئْنَا شُفَعَاءَ فَاغْفِرْ لَهَا"

اے اللہ! تو اس میت کا رب ہے، تو نے اسے پیدا کیا، رزق دیا، اسلام کی توفیق

---

(۱) ابوداود: ۳۲۸۲ اس کی سند حسن ہے۔

دی، اوراس کی روح قبض کی، تو اس کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، ہم سفارش بن کر آئے ہیں، تو اسے بخش دے۔(۱)

نبی کریم ﷺ میت کے لئے اخلاص سے دعا کرنے کا حکم دیتے تھے۔نماز جنازہ میں آپ چار تکبیریں کہتے تھے، اور پانچ تکبیریں بھی آپ سے ثابت ہیں۔صحابہ کرام سے چار، پانچ اور چھ تکبیریں تک بھی ثابت ہیں۔علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے کچھ ساتھی شام سے آئے ہیں، انہوں نے میت پر نماز جنازہ میں پانچ تکبیریں کہی ہیں۔انہوں نے فرمایا کہ میت پر تکبیر کہنے کی کوئی عدد نہیں ہے، امام جتنی تکبیریں کہے، اتنی تکبیریں کہو اور جب ختم کرے تب ختم کردو۔

امام احمد سے پوچھا گیا کہ صحابہ کرام میں سے کسی کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ وہ نماز جنازہ میں دو سلام پھیرتے تھے انہوں نے کہا نہیں، لیکن چھ صحابیوں کے بارے میں منقول ہے کہ وہ دائیں طرف ایک مختصر سا سلام پھیرتے تھے۔انہوں نے حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا نام لیا۔نماز جنازہ میں رفع یدین کے متعلق امام شافعی سے منقول ہے کہ ایک صحابی کی پیروی اور نماز میں سنت پر

(۱) ابوداود: ۳۲۰۰ اس کی سند حسن ہے۔

قیاس کرتے ہوئے رفع یدین کیا جائے گا۔صحابی کی پیروی سے ان کی مراد یہ ہے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ وہ نماز جنازہ کی ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے تھے۔

نماز جنازہ فوت ہو جانے پر رسول اللہ ﷺ قبر پر نماز جنازہ پڑھتے تھے۔چنانچہ آپ نے ایک بار ایک رات کے بعد نماز جنازہ پڑھی، ایک بار تین رات کے بعد اور ایک بار ایک ماہ کے بعد پڑھی اور اس سلسلہ میں کسی مدت کی تحدید نہیں کی گئی ہے۔

امام مالک کے یہاں ولی کے علاوہ کسی کو بعد میں نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، اگر ولی نماز جنازہ میں موجود نہ ہو۔

نماز جنازہ میں آپ کا معمول یہ تھا کہ مرد کے سر کے قریب اور عورت کے وسط میں کھڑے ہوتے تھے، اور بچے کی نماز جنازہ بھی پڑھنا آپ سے ثابت ہے اور خودکشی کرنے والے اور مال غنیمت میں خیانت کرنے والے پر آپ نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسروں کو پڑھنے کے لئے کہہ دیتے تھے۔

حد زنا وغیرہ میں قتل کئے جانے والے پر نماز جنازہ پڑھنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے، چنانچہ آپ سے ثابت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی عورت کو رجم کیا گیا تھا، اس پر آپ نے نماز جنازہ پڑھی تھی، البتہ ماعز کی نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف ہے، ان دونوں

روایتوں میں تطبیق کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا، کیونکہ اس میں صلاۃ سے مراد دعا ہے اور ماعز کی نماز جنازہ ازراہ تادیب چھوڑ دی تھی یا پھر یوں کہا جائے کہ جب الفاظ میں تعارض ہو تو پھر دوسری حدیث کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ نماز جنازہ کے بعد قبرستان تک پیدل تشریف لے جاتے تھے۔سواری والے لوگوں کو پیچھے چلنے کا حکم دیا ہے اور پیدل چلنے والوں کو قریب رہنے کا حکم دیا ہے۔چاہے وہ پیچھے ہوں یا آگے، دائیں ہوں یا بائیں۔آپ میت کو تیز لے جانے کا حکم دیتے، چنانچہ صحابہ تقریبا دوڑتے ہوئے لے جاتے تھے اور آپ خود بنفس نفیس پیدل چلتے تھے اور فرماتے تھے، میں کیسے سوار ہوسکتا ہوں جب کہ فرشتے پیدل چل رہے ہیں۔(۱) جب فارغ ہوجاتے تو بسا اوقات سواری پر واپس آتے۔

جنازے کو رکھنے سے پہلے آپ نہیں بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے، جب تم جنازہ کے ساتھ چلو تو اس کو رکھ دینے سے پہلے نہ بیٹھو۔(۲)

ہر مرنے والے کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا آپ کی سنت نہیں ہے اور آپ سے

---

(۱)ابوداود:۳۱۷۷ اور یہ صحیح ہے۔

(۲) صحیح بخاری:۱۳۰۹،صحیح مسلم:۹۵۹۔

نجاشی پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا ثابت ہے(۱) اس طرح غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا اور چھوڑ دینا دونوں آپ کی سنت طیبہ ہے۔اگر کوئی شخص ایسی جگہ انتقال کر گیا جس پر نماز نہ پڑھی گئی ہو تو اس پر نماز پڑھی جائے گی۔اس وجہ سے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھی گئی، کیونکہ ان کی وفات کافروں کے درمیان ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ کے سامنے سے جب جنازہ گزرا تو اس کے لئے کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہونے کا حکم دیا، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ بیٹھے رہے۔اسی وجہ سے بعض لوگوں کا قول ہے کہ کھڑا ہونا منسوخ ہو گیا ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔اور آپ کا کھڑا ہونا استحباب کو واضح کرتا ہے اور کھڑا نہ ہونا جواز کو ظاہر کرتا ہے اور یہی توجیہ بہتر ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت اور زوال کے وقت مردے کو دفن نہ کیا جائے، اور یہ بھی سنت تھی کی قبر بغلی اور گہری کھدواتے اور مردے کے سرہانے اور پائتانے کی جگہ کشادہ کرواتے تھے اور آپ سے منقول ہے کہ جب مردے کو قبر میں رکھا جاتا تو یہ دعا پڑھتے تھے:

(۱) صحیح بخاری:۱۲۴۵،صحیح مسلم:۹۵۱۔

" بِسْمِ اللّٰهِ و بِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ "

اورایک روایت میں یہ الفاظ ہیں" بِسْمِ اللّٰهِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ "یعنی اللہ کے نام سے اوراللہ کی راہ میں اوررسول اللہ ﷺ کے طریقے پر۔(۱)

اورآپ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ میت کی قبر پردفن کے وقت سر کی جانب تین بار چلوبھرکرمٹی ڈالتے اور جب دفن سے فارغ ہوجاتے تو آپ اورآپ کے صحابہ قبر کے پاس کھڑے ہوکر مردے کی ثابت قدمی کے دعا فرماتے اوراس کا آپ نے حکم بھی دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے قبر کے پاس بیٹھ کر پڑھنا اور تلقین کرنا ثابت نہیں ہے۔قبروں کو بلند کرنا، پکی بنانا، لیپنا، ان پرقبہ بنانا، یہ سب چیزیں نبی کریﷺ کی سنت نہیں بلکہ سنت کے صریح خلاف ہیں۔ایک دفعہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ جس تصویر کو دیکھیں اس کو مٹا دیں، جواونچی قبر دیکھیں اس کو برابر کردیں، اس وجہ سے تمام بلنداوراونچی قبروں کوہموار اور برابر کرنا سنت طیبہ ہے۔

نیز آپ نے قبر پر چونا لگانے اوراس پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا ہے اوران پر کتبے تحریر کرنے کی مخالفت کی ہے۔علامت کے طور پر صرف پتھر رکھنے کی اجازت دی ہے۔

---

(۱)ابوداود:۲۲۳۱،اس کی سند صحیح ہے۔

نبی کریم ﷺ نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے سے ممانعت فرمائی ہے اور ایسا کرنے والوں پر لعنت کی ہے، اور قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے اور اپنی قبر پر میلہ وعید منانے سے بھی منع کیا ہے۔

اور آپ کی سنت یہ تھی کہ قبروں کی توہین نہ کی جائے اور نہ انہیں روندا جائے اور نہ ان پر بیٹھا جائے اور نہ ٹیک لگائی جائے۔ اور نہ اس شدت سے تعظیم کی جائے کہ انہیں سجدہ گاہ بنالیا جائے اور ان کے پاس یا ان کی طرف نماز پڑھی جانے لگے، میلے شروع ہو جائیں اور انہیں بت بنالیں گویا ان کی عبادت ہو رہی ہو۔

نبی کریم ﷺ صحابہ کی قبروں کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے اور ان کے لئے دعا واستغفار کرتے تھے۔ یہی زیارت قبور ہے جو امت کے لئے مشروع اور مسنون ہے۔ زیارت کے وقت مسلمانوں کو یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا ہے:

” اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ “

مومنوں اور مسلمانوں کے اہل دیار! تم پر سلامتی ہو، اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم تم سے ملنے والے ہیں، ہم اللہ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔ (۱)

(۱) صحیح مسلم: ۹۷۵

نبی کریم ﷺ قبروں کی زیارت کے وقت وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے جو نماز جنازہ کے وقت کرتے اور کہتے تھے، لیکن اہل شرک نے مردوں کو پکارنا، ان کو شریک کرنا، اس سے حاجتیں مانگنا، مدد چاہنا، اوران کی طرف توجہ ایسے کرنے لگے جو آپ کی سنت اور شریعت کے صریحاً خلاف ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ توحید اور مردوں کے ساتھ حسن سلوک پر مبنی ہے۔ آپ میت کے گھر والوں کی تعزیت کرتے تھے لیکن وقت مقرر کرکے اجتماع کرنا اور قبر پر یا کسی جگہ جمع ہوکر قرآن پڑھنا آپ کا اسوہ حسنہ نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ میت کے گھر والے لوگوں کے لئے کھانے وغیرہ کا انتظام نہ کریں، بلکہ لوگ میت کے اہل خانہ کے لئے کھانا تیار کریں اور ان کو کھلائیں، اور میت کے لئے باقاعدہ اعلان ومنادی سے آپ منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا کرنا جاہلی دور کا عمل ہے۔

فصل (۲۱)

آپ ﷺ کی نماز خوف کا طریقہ

آپ ﷺ نے خوف وسفر جمع ہونے کی حالت میں ارکان نماز اور تعداد رکعات میں کمی کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ جب سفر میں خوف نہ ہو تو تعداد رکعات میں قصر کرنے اور جب صرف خوف ہو سفر نہ ہو تو تنہا ارکان میں کمی کی اجازت عطا کی ہے، یہ نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ تھی اور اس سے سفر وخوف کی حالت میں آیت قرآنی کو قصر کے ساتھ مقید کرنے کی حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

نماز خوف میں نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب دشمن آپ کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا تو تمام مسلمان آپ کی اقتدا کرتے اور آپ اپنے پیچھے مسلمانوں کو دو صفوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ تکبیر کہتے تو وہ سب تکبیر کہتے، آپ رکوع کرتے تو وہ سب رکوع کرتے، پھر آپ سر اٹھاتے وہ بھی آپ کے ساتھ سر اٹھا لیتے، پھر پہلی صف کے لوگ آپ کے ساتھ سجدہ کرتے اور دوسری صف والے دشمن کے مقابل کھڑے رہتے۔ جب آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جاتے تو دوسری صف والے اپنے دونوں سجدے کرتے، پھر کھڑے ہو کر پہلی صف کی جانب بڑھتے اور پہلی صف والے پیچھے آ کر دوسری صف والوں کی جگہ لے لیتے تا کہ پہلی صف کی فضیلت دونوں کو حاصل

ہو جائے اور دوسری صف والے بھی آپ کے ساتھ دوسجدے پا جائیں۔ یہ آپ کا غیر معمولی عدل وانصاف کی علامت ہے۔

اسی طرح جب آپ دوسری رکعت میں رکوع کرتے تو دونوں صف والے پہلی رکعت کی طرح عمل کرتے اور جب آپ تشہد کے لئے قعدہ کرتے تو دوسری صف والے دوسجدے کر لیتے اور پھر آپ کے ساتھ تشہد میں شریک ہو جاتے۔اس طرح سب کے ساتھ سلام پھیرتے۔

اگر دشمن قبلہ کے بجائے کسی دوسری سمت ہوتا، اس وقت کبھی آپ دو جماعتیں بنا لیتے۔ایک جماعت دشمن کے مقابلہ میں کھڑی رہتی اوردوسری جماعت کے ساتھ آپ نماز پڑھتے۔ یہ گروہ ایک رکعت نماز پڑھ کر واپس چلا جاتا۔دوسرا گروہ آ کر آپ کے ساتھ دوسری رکعت پڑھتا پھر آپ سلام پھیر دیتے اور دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد میں پوری کر لیتے۔کبھی آپ دو جماعتوں میں سے ایک کو ایک رکعت پڑھا کر کھڑے رہتے اور وہ دوسری پوری کر کے واپس چلی جاتی اور پھر دوسری جماعت آ کر آپ کے ساتھ دوسری رکعت ادا کرتی۔جب آپ تشہد میں بیٹھتے تو یہ اٹھ کر ایک رکعت پوری کرتی،آپ تشہد میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے اور اس کے تشہد پڑھنے کے بعد سلام پھیرتے،کبھی آپ ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھا کر سلام

پھیر دیتے پھر دوسری جماعت آتی تو اس کو بھی آپ دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ آپ کے ساتھ ایک رکعت ہی پڑھاتے اور وہ بھی دوسری رکعت قضا نہ کرتی۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کی دو رکعت پوری ہو جاتی اور عام لوگوں کی صرف ایک ایک ہوتی، یہ تمام صورتیں نماز میں جائز ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ نماز خوف کے چھ یا سات طریقے ثابت ہیں اور سب جائز ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہر جماعت آپ کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور پھر دوسری قضا نہ کرے تو یہ جائز ہے، یہ حضرت جابر، ابن عباس، طاؤس، مجاہد، حسن، قتادہ، حکم اور اسحاق کا مذہب ہے۔

بعض لوگوں نے نماز خوف کی دس صورتیں ذکر کی ہیں، اور ابن حزم نے تقریبا پندرہ صورتیں بتائی ہیں لیکن صحیح وہی ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان لوگوں نے ایک ہی واقعہ میں راویوں کے اختلاف کو نبی کریم ﷺ کے فعل کو مختلف شکلوں پر محمول کیا ہے۔

فصل (۲۲)

آپ ﷺ کے اداءِ زکاۃ کا طریقہ

آپ ﷺ نے زکاۃ کا انتہائی کامل ترین نظام پیش کیا ہے۔ اس کے وجوب کا وقت، اس کی مقدار، اس کا نصاب، کن پر واجب ہوتی ہے، اور اس کے مصارف کیا ہیں، ان سب کی پوری طرح وضاحت فرمادی ہے۔ مالداروں اور مساکین کے مصالح اور ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زکاۃ کو مال اور صاحب مال کے لئے باعث طہارت بنایا ہے، چنانچہ مالداروں کی نعمتوں کو اس سے محفوظ کردیا ہے اور جس نے زکاۃ ادا کی وہ زوال نعمت سے محفوظ رہتا ہے بلکہ اس میں برکت اور زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

زکاۃ چار طرح کے مال پر لاگائی ہے کیونکہ یہی اموال زیادہ تر رائج ہیں اور اہمیت وضرورت کے حامل ہیں۔

پہلی قسم: فصل اور پھل، دوسری قسم: جانوروں میں اونٹ، گائے اور بکریاں۔ تیسری قسم: سونا وچاندی جو سارے مالی نظام کی بنیاد ہے۔ چوتھی قسم: مختلف قسم کے تجارتی مال۔

زکاۃ کی ادائیگی ہر سال میں صرف ایک بار فرض ہے اور فصلوں اور پھلوں کی زکاۃ کو ان کے پکنے اور مکمل ہونے سے مشروط کردیا گیا ہے، اور یہ غیر معمولی عادلانہ نظام ہے۔

کیونکہ ہر ماہ اور ہفتے اسے فرض قرار دینا صاحب مال کے لئے ضرر رساں ہے اور دوسری طرف عمر میں صرف ایک بار فرض کرنا فقراء ومساکین کی حق تلفی اور نقصان دہ تھا۔

چنانچہ سال میں ایک بار فرض کرنا فی الحقیقت سب سے زیادہ منصفانہ قانون ہے۔

شریعت نے مال کے حصول میں آسانی یا محنت کے لحاظ سے زکاۃ میں واجب ہونے والی مقدار میں بھی کمی بیشی رکھی ہے، چنانچہ ایسی دولت جو کسی کو اچانک مل جائے جیسے زمین میں مدفون خزانہ تو اس پر پانچواں حصہ فرض ہے اور اس کے لئے سال کا گزرنا شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ جونہی ایسی دولت ملے اسی وقت پانچویں حصے کی ادائیگی واجب ہوگی۔

رہے پھل اور فصلیں جن کے حصول کے لئے انسان کو بہت کم مشقت اور تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے، جنہیں بارش کا پانی سیراب کرتا ہے، ان پر دسواں حصہ زکوۃ واجب ہوگی اور جسے انسان اس کی سیرابی کے لئے اپنے طور پر انتظام کرے، اس میں بیسواں حصہ واجب ہے، اور جس مال میں مالک کی مسلسل کوشش اور مستقل جدوجہد کے بغیر اضافہ ممکن نہیں، اس میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔

چونکہ ہر مال مواسات وہمدردی کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس لئے زکوۃ کے لئے ایک نصاب مقرر ہوا تاکہ صاحب مال کو نقصان نہ پہنچے اور فقراء کو خاطر خواہ فائدہ ہوجائے۔ چنانچہ چاندی کا نصاب دوسو درہم، سونے کا بیس مثقال، غلہ اور پھل کے لئے

پانچ وسق، اور بکریوں کے لئے چالیس بکریاں، گائے کے لئے تیس گائیں اور اونٹوں کے لئے پانچ اونٹ نصاب مقرر کیا گیا ہے، لیکن چونکہ اونٹ کے نصاب میں اس کی جنس سے مواساۃ کی گنجائش نہیں، اس لئے اس میں ایک بکری واجب کی گئی ہے، البتہ جب پچیس اونٹ ہوجائیں تو نصاب میں گنجائش کی وجہ سے ایک اونٹنی واجب ہوجائے گی جو دوسرے سال میں لگی ہو، پھر چھتیس اونٹوں سے پینتالیس تک ایک اونٹنی جو تیسرے سال میں لگی ہو، اور چھیالیس سے لے کر ساٹھ تک ایک اونٹنی جو چوتھے سال میں لگی ہو، اور اکسٹھ سے لے کر پچہتر تک ایک اونٹنی جو چار سال مکمل کر چکی ہو۔ چھہتر سے نوے تک دو اونٹنیاں جو پانچ سال مکمل کر چکی ہوں، اور جب ایک سو بیس اونٹ سے زیادہ ہوں تو ہر چالیس پر دو سالہ اونٹنی واجب ہے۔

اسی طرح شریعت نے اصحاب مال اور فقراء دونوں کا لحاظ رکھا ہے اور کسی ایک فریق پر ظلم کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔

لہذا مالدار پر ضروری ہے کہ جو زکاۃ اس پر واجب ہوجائے اس کے نکالنے میں بخیلی نہ کرے اور لینے والے پر ضروری ہے کہ اگر وہ مستحق نہیں تو اس کو نہ لے کیونکہ مذکورہ دونوں ہی صورتوں میں اصل نقصان سے فقراء ومساکین دوچار ہوتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالی نے زکاۃ وصدقات کے مصارف کی خود ہی تقسیم فرمائی ہے اور

اس کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں، جو دو طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو وہ جو ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور ضرورت کی شدت وضعف اور کمی وزیادتی کے مطابق سوال کرتا ہے جیسے فقراء ومساکین، غلام کو آزاد کرانے میں اور مسافر، دوسرے لوگ وہ ہیں جو اسے منفعت کے باعث لیتے ہیں جیسے زکاۃ وصول کرنے والے، دلجوئی کے مستحق لوگ، مقروض لوگ، اللہ کے راستے میں مجاہدین، اور اگر لینے والا محتاج نہ ہو اور نہ اس سے مسلمانوں کا فائدہ وابستہ ہو تو اسے زکاۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔

فصل (۲۳)

آپ ﷺ کا اموال زکاۃ کی تقسیم کا طریقہ

نبی کریم ﷺ کو جب معلوم ہوتا کہ یہ شخص مال زکوۃ کا مستحق ہے تو آپ عطا فرماتے تھے اور جس کے متعلق آپ کو معلومات نہ ہوتیں تو اس کو یہ کہہ کر دیتے تھے کہ مالدار اور کمانے کے قابل شخص کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آپ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ جس علاقے کی زکاۃ جمع ہوتی وہیں کے مستحقین میں تقسیم کرتے تھے۔ ان میں تقسیم کے بعد جو بچ جاتی تو اسے منگوا کر دوسری جگہ تقسیم کر دیتے تھے۔یہی وجہ تھی کی آپ عاملین کو دیہاتوں میں بھیجتے تھے،شہروں میں نہیں، بلکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اہل یمن کی زکوۃ لے کر انہی کے فقراء میں تقسیم کر دیں۔اور نہ آپ کا یہ طریقہ تھا کہ عاملین کو چو پایوں، پھلوں اور فصلوں جیسے ظاہری اموال کے مالکین کی طرف بھیجتے تھے اور آپ کھجوروں اور انگوروں کے مالکین کے پاس پھلوں کا اندازہ کرنے والوں کو بھیجتے تھے اور وہ اندازے کے مطابق زکوۃ متعین کرتے تھے کہ کتنے وسق پر کتنی زکوۃ متعین ہونی چاہیئے ،اور آپ ان عاملین کو حکم دیتے تھے کہ ان کے لئے تیسرا یا چوتھا حصہ چھوڑ دیں چنانچہ وہ چوتھائی کو زکاۃ کے اندازے میں ظاہر نہ کرتا کیونکہ کھجوریں آفات سے کم ہی محفوظ رہتی ہیں۔یہ اندازہ اس لئے کیا جاتا تاکہ پھلوں

کے استعمال سے پہلے یہ بات معلوم ہو سکے کہ اس میں کتنی زکوۃ واجب ہے تا کہ مالکین کو اس میں تصرف کا موقع حاصل رہے اور عاملین کی آمد کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ نبی کریم ﷺ کی سنت حسنہ تھی کہ آپ سواری کے گھوڑے، خدمت کے غلام، لادنے کے خچر اور گدھے، سبزیوں اور غلہ جات اور ایسے تمام پھلوں سے زکوۃ نہ لیتے تھے جو ناپے یا ذخیرہ نہیں کئے جا سکتے البتہ انگور و کھجور میں سے زکاۃ لیتے تھے اور خشک اور گیلی میں فرق نہیں کرتے تھے۔

جب کوئی شخص نبی کریم ﷺ کے پاس ان چیزوں کی زکاۃ لے کر آتا تو کبھی آپ ﷺ اس کے لئے یہ دعا فرماتے:

" اللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيهِ وَفِي إِبِلِه "(۱)

اے اللہ اس میں اور اس کے اونٹوں میں برکت دے۔

اور کبھی یہ دعا فرماتے:

" اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ "(۲)

اے اللہ اس پر رحمت نازل فرما۔

---

(۱) نسائی: ۵/۳۰، اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) بخاری: ۱۴۹۷، اور مسلم ۱۰۷۸۔

نبی کریم ﷺ کا زکاۃ کی مد میں اچھا اچھا مال چھانٹ لینے کا دستور نہ تھا بلکہ اوسط درجہ کا مال لیتے تھے، اور آپ صدقہ کرنے والوں کو اپنا ہی مال یا سامان خریدنے سے منع فرماتے تھے۔ اگر کوئی فقیر کسی مالدار کو صدقہ کا مال ہدیہ کے طور پر دیتا تو آپ اسے کھا لینے کی اجازت دیتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کبھی کبھی زکاۃ وصدقہ کی مد میں سے مسلمانوں کے فائدے اور رفاہی کاموں کے لئے قرض لیتے تھے اور صدقہ کے اونٹوں پر اپنے ہاتھ سے نشان لگاتے تھے اور ضرورت کے وقت آپ زکاۃ وقت سے پہلے لیتے تھے جیسا کہ آپ نے عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے دوسال کی پیشگی زکاۃ لے لی تھی۔

صدقہ فطر

صدقہ فطر کو نبی کریم ﷺ نے ہر شخص اوراس کے زیر کفالت چھوٹے بڑے پر فرض قرار دیا ہے، جس کی مقدار ایک صاع ہے، چاہے وہ کھجور ہو یا جو پنیر ہو یا کشمش، یا ایک صاع آٹا دیا جائے۔ ایک روایت میں آدھ صاع گیہوں بھی دینا ثابت ہے۔ جیسا کہ ابوداود نے ذکر کیا ہے، اور صحیحین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھ صاع کا فیصلہ حضرت نے قیمت کے لحاظ سے کیا تھا۔

صدقہ فطر آپ نماز عید سے پہلے نکال دیتے تھے اور صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما

سے مروی ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ عیدگاہ جانے سے پہلے ہی صدقہ فطر ادا کر دیا کریں“ (۱)

سنن مین ان ہی سے مروی ہے کہ ” جس نے اسے نماز سے قبل ادا کیا وہ مقبول صدقہ ہے اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو وہ ایک عام صدقہ ہے،،۔ (۲)

ان دونوں حدیثوں کا تقاضہ یہ ہے کہ صدقہ فطر کو نماز سے موخر نہیں کرنا چاہیئے اور نماز کے بعد اس کا وقت ختم ہو جاتا ہے جس طرح کہ قربانی اگر امام کی نماز سے پہلے کی جائے تو وہ ایک ذبیحہ ہوگا۔

صدقہ فطر میں نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ اسے فقراء و مساکین کے لئے خاص فرماتے تھے اور زکاۃ کے آٹھوں مصارف میں نہیں دیتے تھے۔ ایسا عمل آپ کے بعد صحابہ و تابعین سے ثابت نہیں۔

(۱) صحیح بخاری: ۱۵۰۳، صحیح مسلم ۹۸۶

(۲) ابوداود ۱۶۵۹، اور اس کی سند جید ہے۔

فصل (۲۴)

آپ ﷺ کی نفلی صدقات کی ادائیگی کا طریقہ

نبی کریم ﷺ کے نفلی صدقات میں سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا صدقہ کر دیتے تھے اور آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ صدقہ و خیرات کرنے والے تھے۔ آپ اللہ کی رضا کے لئے بغیر اس کی کثرت وقلت کو مدنظر رکھے جو بھی آپ سے سوال کرتا اسے عطا فرما دیتے تھے، اور لینے والے کو حاصل کرنے میں جتنی خوشی ہوتی تھی اس سے زیادہ خوشی آپ کو دینے میں ہوتی تھی۔

جب کوئی محتاج آپ کے سامنے آجاتا تو آپ اپنے سے زیادہ لباس وخوراک کے معاملہ میں اسے ترجیح دیتے تھے۔

آپ کے عطایا وصدقات کی مختلف نوعیتیں ہوتی تھیں۔ کبھی ہدیہ دیتے کبھی صدقہ، کبھی ہبہ کرتے، کبھی کوئی چیز خریدتے پھر بائع کو وہ چیز اور قیمت دونوں دیتے تھے اور کبھی قرض لیتے پھر اس سے زیادہ واپس کر دیتے، جب کسی سے ہدیہ قبول کرتے تو کسی نہ کسی طریقے سے اس کا بدلہ دیتے تھے۔ آپ ﷺ دوسروں کے ساتھ مالی وعملی وقولی ہر طرح سے کرم واحسان کا معاملہ کرتے اور لوگوں کا بھرپور تعاون کرتے ہوئے اپنا مال صدقہ میں دے دیتے یا دوسروں کو صدقہ کی ترغیب دیتے اور بخیل کو صدقہ وخیرات

کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔

آپ سے ملنے والے خود سخاوت ومروت پر مجبور ہو جاتے تھے، آپ کا سینہ کھلا اور طبیعت پاکیزہ تھی کیونکہ صدقہ واحسان کا شرح صدر میں خاص دخل ہے اور اس کی تاثیر ہے۔ اللہ تعالی نے رسالت کے ذریعہ بھی آپ کے سینہ کو کھول دیا تھا، ظاہری طور پر بھی آپ کے سینہ کو کھول کر اللہ تعالی نے شیطان کا حصہ اس سے نکال دیا تھا۔

شرح صدر کا سب سے بڑا سبب عقیدہ توحید ہے، توحید جس قدر کامل ترین وقوی تر ہوگی، اسی اعتبار سے شرح صدر بھی زیادہ اور کشادہ ہوگا۔

اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ﴾(۱)

اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔ مزید ارشاد ہے:

﴿فَمَن يُرِدِ اللّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلإِسْلاَمِ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً ﴾(۲)

---

(۱) سورۃ الزمر: ۲۲۔

(۲) سورۃ الأنعام: ۱۲۵۔

اللہ تعالی جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

شرح صدر کا تیسرا سبب علم ہے، اس سے بھی سینہ میں انشراح وکشادگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ تاثیر سارے علوم میں نہیں ہوتی بلکہ وہ علم ہے جس کا رشتہ رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے۔

شرح صدر کا چوتھا سبب اللہ تعالی کی طرف انابت اور اس سے دلی سچی محبت ہے کیونکہ شرح صدر میں محبت کی عجیب وغریب تاثیر ہوتی ہے ، اس سے طبیعت میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ محبت جس قدر قوی ہوگی انشراح قلب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس کے برعکس برے لوگوں کو دیکھنے سے سینہ تنگ ہوتا ہے۔

شرح صدر کا پانچواں سبب کثرت سے ذکر اللہ ہے اور اس کی بھی انشراح صدر میں بڑی تاثیر ہے (غفلت دور ہوتی ہے اور اللہ تعالی کی قربت نصیب ہوتی ہے)۔

شرح صدر کا چھٹا سبب اللہ تعالی کی مخلوق کے ساتھ کرم واحسان ہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون ہے خواہ وہ مالی ہو یا بدنی، اس کے علاوہ کرم واحسان کے بہت سے طریقے ہیں۔

شرح صدر کا ساتواں سبب شجاعت ہے کیونکہ بہادر وسعت ظرف اور فراخی قلب

کا مالک ہوتا ہے۔

بزدل، بخیل اور ذکر الٰہی سے غافل، اور دین الٰہی سے جاہل روح کی لذت اور اس کے سرور سے محروم ہوتا ہے۔ دل کو دوسروں سے متعلق رکھنے میں روحانی کیف وسرور اور لذت حاصل نہیں ہوتی اور ایسے لوگوں کے دلوں کے انشراح یا انقباض کا کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ کیونکہ عارضی چیزیں اسباب ختم ہونے کے بعد ختم ہوجاتی ہیں۔ اعتبار صرف ان صفات کا ہوتا ہے جو دل کے ساتھ قائم ودائم ہوں اور اس کے انشراح وانقباض کا موجب ہوں اور لائق معیار اور قابل اعتبار ایسی ہی صفات ہیں۔

اسی طرح بلکہ ان تمام مذکورہ اسباب وصفات سے زیادہ اہم یہ ہے کہ دل ان تمام صفات مذمومہ سے خالی کردیا جائے جو تنگی اور عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسے بدنگاہی، فضول باتیں، غلط چیزیں سننا، اختلاط رکھنا، کھانے اور سونے میں بدنظمی کرنا کیونکہ جب تک انسان شرح صدر کے اسباب کی طرف راغب نہ ہوگا اور صفات مذمومہ اس کے قلب سے خارج نہ ہوں گی تو اسے کما حقہ انشراح صدر حاصل نہ ہوگا۔

فصل (۲۵)

آپ ﷺ کا رمضان کے روزے رکھنے کا طریقہ

روزہ کا مقصد نفس کو خواہشات سے روکنا ہے تا کہ اس کے اندر پوری طرح سعادت حاصل کرنے اور اخروی پاکیزہ زندگی قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور بھوک و پیاس کی شدت سے نفس کی تیزی کو ختم کیا جائے اور فقرا و مساکین کی بھوک اور پیاس کی تڑپ اور شدت کو محسوس کیا جائے اور کھانے و پینے کو کم کر کے انسان کے رگ میں شیطان کے چلنے پھرنے کے راستوں کو تنگ کیا جائے۔

یہ روزہ متقیوں کی لگام اور مجاہدوں کی ڈھال اور ابرار و مقربین کے لئے ورزش ہے اور تمام اعمال صالحہ میں روزہ ہی ایسا عمل ہے جو رب العالمین کے لئے مخصوص ہے کیونکہ روزہ دار رضائے الٰہی کی خاطر اپنا کھانا پینا، اور خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے اور اللہ تعالی کی محبت کے لئے ساری محبوب چیزوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے گویا روزہ ایک معاہدہ اور راز ہے جو صرف بندہ اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے۔ لوگ ظاہری طور پر کھانے پینے کو ترک کر دینے سے آگاہ ہو سکتے ہیں لیکن اپنے معبود کی خاطر اسے چھوڑ دینا ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی انسان واقف نہیں اور یہی روزے کی حقیقت ہے۔

روزہ کے فوائد و اثرات عجیب و غریب ہیں۔ وہ ظاہری جوارح کی حفاظت، باطنی

قوت کو فاسد مادے سے محفوظ رکھنے میں ظاہری اور باطنی قوت کو جِلا دیتا ہے، فاسد مادے دور کرتا اور ردی اخلاط سے جسم کو پاک کرتا ہے۔روزہ،قلب اور دیگر تمام اعضا کو وہ تمام قوتیں واپس دلاتا ہے جو مختلف طریقوں سے صرف ہوجاتی ہیں۔اس کے علاوہ روزہ کو روحانیت میں ایک بڑا درجہ حاصل ہے اور تقوی وتزکیہ حاصل کرنے کا وہ ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾(۱)

اے مسلمانو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح اگلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقوی حاصل کرو۔

نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو جو وسائل کی عدم موجودگی کی وجہ سے شادی نہیں کرسکتے ، روزہ رکھنے کا حکم دیتے اور فرماتے تھے"روزہ (جنسی) خواہش کو دباتا ہے"۔(۲)

(۱)سورۃ البقرۃ:۱۸۳

(۲)دیکھئے:صحیح بخاری:۵۰۶۵وصحیح مسلم:۱۴۰۰

روزہ کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی سنت سب سے کامل ترین اور حصول مقصد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کی فرضیت میں آسانی اور سہولت پیدا کی گئی، کیونکہ مرغوبات وخواہشات نفس سے بچنا غیر معمولی سخت اور دشوار گزار چیز تھی، اس لئے روزہ ہجرت کے بعد فرض کیا گیا اور اس میں بھی تدریجی انداز میں پہلے یہ اختیار دیا گیا کہ اگر کوئی چاہے تو روزہ رکھے یا اس کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے، پھر یہ حکم ہوا کہ صرف بوڑھا شخص یا عورت اگر چاہے تو ہر روز ایک فقیر کو کھانا کھلا دیا کریں، نیز مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی، بشرطیکہ وہ بعد میں اس کی قضا کریں، اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اجازت دی گئی کہ وہ روزے نہ رکھیں لیکن بعد میں اس کی قضا کریں، اگر یہ عورتیں صرف بچوں کے نقصان کے اندیشے سے روزہ نہ رکھیں تو قضا کے ساتھ ایک مسکین کو کھانا بھی کھلائیں گی کیونکہ ان کا روزہ رکھنا بیماری کے خوف سے نہیں ہے کہ صرف قضا کافی ہو، اس لئے اس کی تلافی مسکینوں کو کھانا کھلانے سے کی گئی جیسا کہ تندرست آدمی اسلام کے ابتدائی دور میں روزہ نہ رکھنے کی صورت میں کرتا تھا۔

نبی کریم ﷺ کا رمضان کے مہینے میں مختلف قسم کی بکثرت عبادات کا معمول تھا، چنانچہ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے اور اس ماہ

میں کثرت سے صدقہ وخیرات، تلاوت اور ذکر کرنے کے علاوہ اعتکاف بھی کرتے تھے۔

اوراس میں عبادات کا اس طرح اہتمام فرماتے تھے جو دوسرے مہینوں میں نہیں ہوتا تھا، اور دن ورات مسلسل عبادات کرتے تھے اور کھانا اور پینا بھی چھوڑ دیتے تھے لیکن امت کو متواتر روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میرا حال تم سے مختلف ہے، مجھے اللہ تعالی کھلاتا اور پلاتا ہے۔(۱)

(۱) صحیح بخاری:۱۹۶۵و صحیح مسلم:۱۱۰۳

فصل (۲۶)

آپ ﷺ کا روزے کے بارے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ کی عادت یہ تھی کہ جب تک رویت ہلال کی تحقیق نہ ہوجائے یا کوئی عینی گواہ نہ مل جاتا آپ روزے شروع نہ کرتے تھے اور اگر چاند نہ دیکھا جاتا اور کہیں سے اس کی شہادت بھی نہ ملتی تو شعبان کے پورے تیس دن پورے کرتے تھے اور اگر تیسویں رات کو بادل حائل نہ ہوجاتا تو آپ تیس دن مکمل کرتے تھے، اور آپ ابر آلود دن کو روزہ نہیں رکھتے تھے، نہ آپ نے اس کا حکم دیا بلکہ فرمایا ''جب بادل ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کئے جائیں'' یہ اس روایت کے منافی نہیں جس میں حکم ہوا ہے کہ ''جب بدلی ہو تو اندازہ کرلیا کرو'' (۱) اس سے مراد تکمیل ماہ ہے۔

آپ کی عادت طیبہ تھی کہ رمضان کے اختتام پر دو افراد کی شہادت طلب کرتے تھے۔ اگر عید کا وقت نکل جانے کے بعد دو گواہ مل جاتے تو آپ روزہ توڑ دیتے پھر دوسرے دن وقت پر عید کی نماز پڑھتے۔

آپ افطار میں جلدی فرماتے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔ اسی طرح سحری کو تاخیر

(۱) صحیح بخاری: ۱۹۰۰، صحیح مسلم: ۱۰۸۰

سے کرتے اور اس کی تاکید فرماتے تھے اور افطار کو کھجور سے یا پانی سے کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

روزہ دار کو آپ مجامعت، شور وغل، گالی گلوچ سے منع فرماتے تھے اور اگر اس سے کوئی گالی گلوچ کرے تو یہ حکم دیا ہے کہ جواب میں یہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

آپ نے رمضان کے مہینے میں سفر کیا تو حالت سفر میں کبھی روزہ رکھا اور کبھی افطار کیا۔ اور صحابہ کو دونوں باتوں کا اختیار دیا۔ ہاں اگر مسلمانوں کا لشکر دشمن سے قریب ہو جاتا تو روزہ نہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔

سفر کی وجہ سے روزہ رکھنے کے لئے آپ ﷺ نے کسی مسافت کی تحدید نہیں کی ہے، صحابہ کرام سفر شروع کرنے کے بعد گھروں کو چھوڑنے کا اعتبار کئے بغیر روزہ چھوڑ دیتے تھے، وہ یہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

طلوع فجر کے وقت بسا اوقات آپ حالت جنابت میں ہوتے تھے۔ نماز فجر کے وقت غسل فرماتے تھے اور روزہ رکھ لیتے تھے۔ روزے کی حالت میں بعض ازواج مطہرات کا بوسہ لے لیتے تھے اور اس کو پانی سے کلی کرنے کے مشابہ بتایا ہے۔ اس سلسلے میں بوڑھے اور جوان میں فرق ثابت نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لے تو اس کو قضا کرنے کا حکم نہیں

دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالی نے اسے کھلایا اور پلایا ہے،اورروزے کو جو چیزیں فاسد کرتی ہیں، وہ یہ ہیں: کھانا پینا، پچھنا لگوانا، قے کرنا اورقرآن کریم نے جماع کا بھی ذکرکیا ہےلیکن سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

آپ سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا، سر پر پانی ڈالنا، ناک میں پانی ڈالنا،کلی کرنا ثابت ہے۔البتہ ناک میں زیادہ پانی ڈالنے سے آپ ﷺ نے منع کیا ہے،جیسا کہ امام احمد سے روایت ہے۔

آپ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے روزے کی حالت میں پچھنا لگوایا ہے۔امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں سرمہ لگانے سے ممانعت آئی ہےلیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ابن معین نے اسے منکر کہا ہے۔(۱)

(۱)ابوداود:۲۳۷۷،اس کی سند ضعیف ہے۔

فصل (۲۷)

آپ ﷺ کا نفلی روزے رکھنے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ روزے رکھنے لگتے تو کہا جانے لگتا کہ اب نہیں چھوڑیں گے، اور جب نہیں رکھتے تو کہا جاتا کہ اب روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور رمضان کے علاوہ آپ کسی مہینے کے پورے روزے نہیں رکھے اور ماہ شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزہ نہیں رکھتے تھے اور کوئی مہینہ آپ کا بغیر روزہ کے نہیں گزرتا تھا۔ پیر اور جمعرات کے دن آپ خاص طور پر روزہ رکھتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سفر و حضر میں کسی بھی حالت میں ایام بیض (مہینہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ) کو روزہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اسے امام نسائی نے ذکر کیا ہے۔(۱) آپ لوگوں کو ان تاریخوں میں روزے رکھنے کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

رہے عشرۂ ذی الحجہ کے روزے تو اس میں اختلاف ہے اور ماہ شوال کے چھ روزے تو آپ سے صحیح روایت میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ''رمضان کے فوراً بعد (یعنی شوال میں) یہ روزے رکھنا ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہے'' عاشورہ کا روزہ آپ باقی

---

(۱) نسائی: ۴/ ۱۹۸ اس کی سند ضعیف ہے۔

تمام ایام کے مقابلے میں زیادہ اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک متبرک دن ہے۔ اللہ تعالی نے اس دن موسی اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسی کے حقدار ہیں، چنانچہ عاشورہ کا روزہ خود بھی رکھا اور صحابہ کرام کو بھی اس کا حکم دیا۔

یہ واقعہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے قبل کا ہے، اس لئے جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا ''جس کا جی چاہے عاشورہ کا روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے''۔(۱)

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ میدان عرفات میں یوم عرفہ کو روزہ نہ رکھتے تھے۔ یہ صحیحین کی روایت سے ثابت ہے، نیز آپ سے مروی ہے کہ آپ نے عرفات کے دن عرفات میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ اسے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔(۲)

نیز آپ ﷺ سے صحیح روایت میں ثابت ہے کہ ''نویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنے سے

(۱) بخاری:۱۳۸۳۱ اور مسلم:۱۱۲۵

(۲) ابوداود:۲۴۴۰ و ابن ماجہ:۱۷۳۲، اس کی سند ضعیف ہے۔

ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں‘‘۔(۱)

آپ ﷺ ہمیشہ (صوم الدھر) مسلسل روزے نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ’’جس نے ہمیشہ اور مسلسل روزے رکھے، اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا‘‘ (۲) اکثر یہ ہوتا تھا کہ آپ گھر میں تشریف لاتے اور پوچھتے ’’کچھ کھانے کو ہے؟ اگر جواب ملتا: نہیں تو فرماتے میں روزہ رکھ لیتا ہوں‘‘۔(۳)

کبھی آپ نفلی روزہ کی نیت کر لیتے اور پھر توڑ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے ان سے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ ’’نفل روزہ کی قضا کرو‘‘ (۴) وہ حدیث معلول ہے۔

روزے کی حالت میں اگر کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو روزہ پورا کرتے تھے، جیسا کہ آپ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کے یہاں جانے کے موقع پر کیا تھا لیکن ام سلیم کی حیثیت آپ کے اہل بیت جیسی تھی، اور صحیح روایت میں آپ سے ثابت ہے کہ

---

(۱) مسلم: ۱۱۶۲

(۲) بخاری: ۱۹۷۷، مسلم: ۱۱۵۹

(۳) مسلم: ۱۱۵۴

(۴) ابوداود: ۲۴۵۷ وترمذی: ۷۳۵

آپ نے فرمایا ''تم میں سے اگر کوئی روزہ دار ہو اور اسے کھانے کے لئے بلایا جائے تو وہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں'' (ا) اور نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن مخصوص کر کے روزہ رکھنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

(ا) مسلم: ۱۱۵۰

فصل (۲۸)

آپ ﷺ کے اعتکاف کا طریقہ

اصلاح قلب اور اللہ تعالی کی مرضیات پر چلنے میں استقامت اسی وقت ممکن ہے جب اس ذات پر اعتماد کلی کیا جائے اور اس کی طرف پوری طرح رجوع وانابت اختیار کی جائے کیونکہ اللہ تعالی کی طرف میلان اور رجوع ہی اطمینان قلب کا سبب ہے اور پراگندہ دل اللہ تعالی کے قرب سے دور ہوتا ہے۔

چونکہ کھانے پینے میں زیادتی، باہمی میل جول میں اضافہ، بات چیت اور سونے میں کثرت ایسے اعمال ہیں جن سے قلب کی پراگندگی اور اس کے انتشار اور پریشانی میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالی کی طرف وصل وقرب میں رکاوٹ بنتے ہیں اس لئے اللہ تعالی نے بندوں پر اپنی رحمت اور حکمت سے روزہ فرض کیا تا کہ کھانے پینے میں کمی واقع ہوجائے اور دل ودماغ سے شہوانی خیالات نکل جائیں جو اللہ تعالی کی طرف رغبت وانابت میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

پھر روزے میں اس کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے کہ انسان دنیاوی نعمتوں اور مصلحتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخروی زندگی کے لئے بھی کچھ مفید کام کر سکے جو اسے نقصان نہ پہنچائیں۔

اسی طرح اللہ تعالی نے اس میں اعتکاف کو مشروع قرار دیا ہے تاکہ بندہ کا دل خود بخود اللہ تعالی کی طرف مائل اور اس کی عبادت کا عادی وشوقین ہو جائے اور غیر اللہ سے اس کی توجہ ہٹ جائے اور دنیاوی جھنجھٹوں سے دور ہو کر اللہ تعالی کے قرب کے لئے یکسو اور اسی سے مانوس ہو جائے۔ اور یہی انسیت بندہ کو قبر کی وحشت میں کام آئے گی۔

دراصل اعتکاف کا بڑا مقصد یہی ہے اور چونکہ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ اعتکاف کی تکمیل روزے کے ساتھ ہو، اس لئے اعتکاف کو روزوں کے افضل ترین ایام میں یعنی رمضان کے آخری عشرہ میں مشروع کیا گیا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالی نے روزے ہی کے ساتھ اعتکاف کا ذکر کیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بھی روزہ کے بغیر اعتکاف نہیں فرمایا ہے۔

رہا مسئلہ قلت کلام کا تو اس کا حکم اس لئے ہے کہ شریعت نے امت کو تمام ایسی باتوں سے زبان بند رکھنے کا حکم دیا ہے جو آخرت میں اس کے لئے مفید نہ ہوں۔

رہا زیادہ سونے سے بھی ممانعت کا حکم تو شریعت نے رات کی نماز کا حکم دیا ہے جو فضول جاگنے سے زیادہ بہتر اور مفید ہے۔ قیام اللیل معتدل قسم کی عبادت ہے جو دل اور جسم دونوں کے لئے مفید ہے، اور بندے کے ذاتی مصالح اور کاموں میں رکاوٹ بھی نہیں پیدا کرتی۔

اہل ریاضت وسلوک کے مجاہدوں کا دارومدار ان ہی چار چیزوں پر ہے اور اس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہے جو نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر گامزن رہے اور غلو کرنے والوں یا کوتاہی کرنے والوں کی راہ اور طریقہ سے پرہیز کرے۔

چونکہ ہم پہلے روزہ اور قیام اللیل اور کلام کے متعلق مسنون طریقہ کا ذکر کر چکے ہیں اس لئے اب اعتکاف کا مسنون طریقہ بیان کریں گے۔

نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے اور یہ سنت طیبہ وفات تک جاری رہی۔ایک مرتبہ آپ نے رمضان میں اعتکاف نہیں کیا تو اس کی قضا شوال میں فرمائی۔ ایک دفعہ آپ نے رمضان کے پہلے عشرہ میں اور ایک مرتبہ درمیانی عشرہ میں اور ایک مرتبہ آخری عشرہ میں اعتکاف کیا۔شب قدر اسی میں تلاش کرتے تھے۔اعتکاف آپ پوری زندگی میں پابندی سے کرتے تھے اور اس کے لئے مسجد میں چھوٹا سا خیمہ لگا دیا جاتا تھا اور تنہائی میں رب العزت کے حضور بیٹھے رہتے تھے۔

جب آپ اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز کے بعد خیمہ میں داخل ہوجاتے۔ایک مرتبہ آپ کے حکم سے آپ کا خیمہ لگایا گیا تو ازواج مطہرات نے بھی اپنے اپنے خیمے لگوا لئے،آپ فجر کی نماز سے فارغ ہوئے تو ان خیموں کو دیکھ کر اپنا خیمہ

کھولنے کا حکم دے دیا، اور اس سال آپ نے رمضان میں اعتکاف ملتوی کر دیا۔ پھر شوال کے ابتدائی عشرہ میں اعتکاف فرمایا۔

آپ ﷺ ہر سال دس دن اعتکاف فرماتے تھے مگر وفات کے سال بیس دن اعتکاف کیا۔ آپ حضرت جبریل کے ساتھ قرآن کا ایک دور فرماتے تھے لیکن وفات کے سال دو مرتبہ دور فرمایا، اور اسی طرح ہر سال قرآن آپ پر ایک مرتبہ پیش کیا جاتا، اور وفات کے سال دو مرتبہ پیش کیا گیا۔

جب اعتکاف کی حالت میں ہوتے تو مسجد سے باہر نہ نکلتے حتی کہ گھر میں بھی بغیر خاص ضرورت کے نہ جاتے لیکن یہ ضرور ہوتا کہ سر حضرت عائشہ کے حجرہ میں کر دیتے وہ باوجود ایام میں ہونے کے اسے دھوتیں اور بالوں میں کنگھی کر دیتیں۔

اور بعض ازواج مطہرات آپ کے خیمہ میں بھی آتی تھیں مگر بجز بات چیت کے ان سے اور کوئی سروکار نہ رکھتے تھے اور جب وہ چلنے کے لئے کھڑی ہوتیں تو رات کے وقت ان کو گھر تک پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ چلتے۔

آپ اعتکاف کے دوران ازواج مطہرات کے ساتھ مباشرت نہیں کرتے تھے اور نہ بوسہ وغیرہ لیتے تھے۔ اعتکاف کے دوران آپ کا بستر اور چارپائی اعتکاف کی جگہ رکھ دی جاتی تھی۔

جب کسی ضرورت کے لئے نکلتے تو راستہ میں کسی مریض کی عیادت بھی کر لیتے تھے۔ایک مرتبہ آپ نے ترکی قبہ میں اعتکاف کیا جس کے اندر چٹائی بچھی ہوئی تھی (یا اس پر چٹائی ڈال دی)۔

یہ تمام باتیں اس لئے تھیں کہ اعتکاف کا اصل اور اس کی روح حاصل ہو۔بخلاف آج کل کے جاہل لوگوں کے اپنی جائے اعتکاف کو میل ملاپ کی جگہ اور زائرین کے لئے مجلس بنالیتے ہیں پھر اس کے بعد دنیا بھر کی باتیں کرتے ہیں۔اس میں اور اعتکاف نبوی میں بہت بڑا فرق ہے۔

فصل (۲۹)

آپ ﷺ کے حج اور عمرہ کا طریقہ

نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کئے اور وہ سب کے سب ذی القعدہ کے مہینے میں تھے۔

پہلا عمرہ: حدیبیہ کا، سنہ ٦ ہجری میں ادا کیا، اس موقع پر مشرکین نے خانہ کعبہ کے پاس جانے سے روک دیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے اس جگہ جہاں پر روکے گئے تھے، قربانی کی اور سر منڈا کر احرام کھول دیا۔

دوسرا عمرہ: عمرۃ القضا کا، جو پہلے عمرے کے بعد والے سال میں ادا کیا، اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور تین دن قیام فرما کر واپس ہوئے۔

تیسرا عمرہ: جو آپ نے حج کے ساتھ (حج قران کی صورت میں) ادا فرمایا۔

چوتھا عمرہ: جو آپ نے جعرانہ سے ادا فرمایا۔

آپ ﷺ نے جتنے عمرے کئے سب مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے کئے، یہ ثابت نہیں کہ مکہ میں ہوں اور عمرہ کرنے کے لئے باہر گئے ہوں، جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نبوت سے مشرف ہونے کے بعد مکہ میں تیرہ سال مقیم رہے لیکن یہ ثابت نہیں کہ آپ نے مکہ سے باہر نکل کر عمرہ کیا ہو، صرف حضرت عائشہ رضی اللہ

عنہا کو آپ نے تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کرنے کی اجازت دی تھی کیونکہ وہ ایام حیض کی وجہ سے حج سے پہلے اپنے قافلہ کے ساتھ عمرہ نہیں کر سکی تھیں، آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی کے لئے حج کے بعد اس عمرہ کی اجازت دی تھی۔

نبی کریم ﷺ نے سارے عمرے حج کے مہینوں میں کیے، اس میں مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی کہ حج کے مہینوں میں عمرہ مکروہ ہے، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان مہینوں میں عمرہ کرنا ماہ رجب میں عمرہ کرنے سے افضل ہے۔

رہا رمضان کا عمرہ تو صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ''رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہوتا ہے''(۱) باوجود اس اہمیت کے آپ کے اس ماہ میں عمرہ نہ کرنے کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ آپ رمضان میں عمرہ سے زیادہ دوسری عبادتوں میں مشغول رہا کرتے تھے اور اس میں نہ کر کے امت پر رحمت وسہولت کرنا مقصد تھا، کیونکہ اگر آپ رمضان میں عمرہ کر لیتے تو ساری امت اس سنت پر عمل کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی، اس طرح عمرہ اور روزے میں جمع کرنا مشکل ہو جاتا، آپ نے بہت سی پسندیدہ عبادتوں کو محض اس لئے چھوڑ دیا کہ کہیں امت کا اس پر عمل کرنا دشوار نہ ہو جائے۔

---

(۱) بخاری:۱۷۸۲، مسلم:۱۲۵٦

آپ سے سال میں ایک عمرہ سے زائد کرنا ثابت نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ ہجرت کے بعد سنہ ۱۰ ہجری کے علاوہ آپ نے کوئی حج نہیں کیا۔

جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ ﷺ حج کے لئے تیار ہو گئے کیونکہ حج سنہ ۹ ہجری یا ۱۰ ہجری میں فرض ہوا، اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾

حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔

یہ آیت سنہ ٦ ہجری میں نازل ہوئی لیکن جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس سے فرضیت حج ثابت نہیں ہوتی، اس میں صرف اس قدر فرمایا ہے کہ جب حج وعمرہ کی نیت کرلو تو اسے پورا کرو۔

جب رسول اللہ ﷺ نے حج کا عزم فرمایا اور لوگوں کو معلوم ہوا تو سب نے تیاریاں شروع کر دیں تا کہ آپ کی شرف معیت حاصل کریں، مدینہ کے مضافاتی علاقے کے لوگوں کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بھی گروہ درگروہ اسی مقصد سے آنا شروع ہو گئے، راستے میں بھی لوگوں کی جماعتیں جو حد شمار سے خارج تھیں، شریک قافلہ ہوتی گئیں، آگے، پیچھے، دائیں، بائیں حد نظر تک خلقت نظر آ رہی تھی۔

مدینہ سے آپ ۲۴/ ذی القعدہ کو ظہر کی چار رکعت نماز پڑھ کر روانہ ہوئے،

روانگی سے قبل ایک خطبہ دیا، جس میں احرام اوراس کے واجبات وسنن کی تعلیم دی، پھر اندرتشریف لے گئے، تیل لگایا کنگھی کی، لنگی باندھی، چادراوڑھی اور مقام ذوالحلیفہ پہنچ کرعصر کی دورکعت نماز پڑھی پھر رات بھر یہیں قیام فرمایا، یہاں آپ نے پوری پانچ نمازیں پڑھیں، عصر، مغرب، عشاء اور دوسرے دن فجر اورظہر، تمام ازواج مطہرات ہمراہ اور رفیق سفرتھیں، ایک ایک کرکے آپ سب کے یہاں تشریف لے گئے، جب احرام باندھنے کاارادہ کیا تو دوسرا غسل کیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے بدن اورسر پرخوشبو لگائی یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی اور مانگ میں مشک کی چمک نظر آرہی تھی، جسے آپ نے دھویا نہیں، پھر چادر اور لنگی سے احرام باندھا پھر ظہر کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد مصلے پر بیٹھتے ہی حج وعمرہ کے لئے احرام باندھا، اس وقت آپ سے یہ منقول نہیں کہ آپ نے احرام کے لئے الگ سے دورکعتیں پڑھی ہوں۔

احرام سے پہلے نبی کریم ﷺ نے اونٹوں کو قلادہ پہنا دیا تھا اورکوہان کو دائیں طرف سے چیر دیا تھا یہاں تک کہ خون رسنے لگا۔

نبی کریم ﷺ نے اس وقت حج قران کا احرام باندھا تھا جس کے ثبوت میں بیس سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

آپ ﷺ نے سر کے بالوں کو خطمی وغیرہ لگا کر اس طرح چپکا لیا تھا کہ بکھر نہ

سکیں۔ پھر مصلے پر بیٹھ کر تلبیہ فرمایا، پھر اونٹنی پر سوار ہو کر تلبیہ کہا اور پھر بیداء کے مقام پر بھی تلبیہ کہا، آپ کبھی حج وعمرہ اور کبھی صرف حج کا تلبیہ کہتے، کیونکہ عمرہ حج کا ایک جز ہے، اسی وجہ سے بعض لوگ آپ کے حج کو قران کہتے ہیں، بعض حج تمتع کہتے اور بعض افراد کہتے ہیں۔

ابن حزم کا یہ قول کہ آپ نے ظہر سے پہلے احرام باندھا تھا، وہم ہے، صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے ظہر کے بعد احرام باندھا تھا، چنانچہ کسی سے بھی ظہر سے پہلے احرام باندھنا منقول نہیں، پتہ نہیں یہ قول ان کو کہاں سے ملا۔

پھر آپ نے ان الفاظ سے تلبیہ کہا:

”لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ“

اے اللہ! حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ہر طرح کی تعریف اور نعمتیں تیرے ہی لئے ہیں، حکومت بھی تیری ہی ہے، تیرا کوئی ساجھی نہیں۔

یہ تلبیہ آپ نے بآواز بلند کہا یہاں تک کہ تمام صحابہ نے اسے سن لیا، آپ نے حسب فرمان باری تعالی انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بھی بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔

یہ سفر حج آپ نے سواری پر کیا، جس پر کجاوہ رکھا ہوا تھا۔ حالت احرام میں کجاوہ اور ہودج وغیرہ میں بیٹھنے پر علما میں قدرے اختلاف ہے۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو حج کی تینوں قسموں، قران، تمتع، افراد جس کا وہ چاہیں، احرام باندھنے کا اختیار دے دیا تھا، پھر مکہ سے قریب ہونے کے وقت قربانی کا جانور ساتھ نہ رکھنے والے حضرات کو حکم دیا کہ عمرہ کر کے احرام کھول دیں اور حج قران کی نیت ختم کر دیں، پھر مروہ کے پاس پہنچ کر اس کو لازمی قرار دے دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس کے یہاں بچہ پیدا ہوا، یہ نومولود حضرت محمد بن ابوبکر تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ غسل کر لیں، اپنی شرمگاہ پر کوئی کپڑا رکھ کر باندھ لیں اور سفر جاری رکھیں، احرام باندھ لیں اور تلبیہ کہتی رہیں۔(۱)

اس واقعہ سے تین چیزیں ثابت ہوئیں، محرم کے لئے غسل جائز ہے، ایام حیض میں عورت غسل کر سکتی ہے، ایام حیض میں عورت احرام باندھ سکتی ہے۔

پھر آپ لبیک کے مذکورہ الفاظ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور صحابہ کرام بھی قدرے کمی و زیادتی کے ساتھ اس کو دہراتے رہے لیکن آپ نے کسی پر نکیر نہ فرمائی۔

---

(۱) نسائی: ۵/۱۸۳ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

مقام روحاء میں جب یہ قافلہ پہنچا تو آپ نے ایک زخمی نیل گائے دیکھی، آپ نے صحابہ سے فرمایا اسے چھوڑ دو ممکن ہے اس کا مالک آجائے، اتنے میں وہ آگیا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کو پورا اختیار ہے کہ آپ جو چاہیں کریں، پھر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے سب میں تقسیم کردی۔(۱)

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ محرم غیر محرم کا شکار کیا ہوا جانور کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے لئے شکار نہ کیا گیا ہو، یہ بھی معلوم ہوا کہ شکار کی ملکیت کے لئے صرف ثبوت کافی ہے۔

پھر جب آپ مقام اثایہ جو کہ رویثہ اور عرج کے درمیان والا علاقہ ہے، پہنچے تو ایک درخت کے سایہ میں ایک ہرن دکھائی دیا جو تیر سے زخمی تھا، آپ نے وہاں ایک شخص کو کھڑے ہوجانے کا حکم دیا تاکہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، ہرن اور نیل گائے کے درمیان فرق کا سبب یہ تھا کہ یہاں اس کا علم نہ تھا کہ شکار کرنے والا غیر محرم ہے۔

پھر آپ مقام عرج پہنچے، آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر کی سواری ایک ہی تھی، اتنے میں حضرت ابوبکر کا غلام بغیر اونٹ کے پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ اونٹ کہاں ہے تو اس نے کہا کہ گم ہوگیا تو حضرت ابوبکر نے کہا ایک ہی اونٹ تھا اسے بھی گم کردیا، پھر

(۱) ابوداود: ۱۸۱۸، ابن ماجہ: ۲۹۳۳، اس کی سند میں ضعف ہے۔

اس کی پٹائی کرنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا ''دیکھو یہ حالت احرام میں کیا کررہے ہیں''۔

پھر وہاں سے چل کر مقام ابواء پر پہنچے تو حضرت صعب بن جثامہ نے آپ کی خدمت میں نیل گائے کی ران پیش کی تو آپ نے ان کو یہ کہہ کر واپس کردیا کہ ہم اسے محض محرم ہونے کی وجہ سے لوٹا رہے ہیں۔(۱)

جب آپ وادی عسفان کے پاس سے گزرے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا یہ کون سی وادی ہے تو انہوں نے عرض کیا، وادی عسفان ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وادی سے حضرت ہود اور حضرت صالح سرخ اونٹوں پر بیٹھ کر گزرے ہیں تاکہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوں، امام احمد نے اسے روایت کیا ہے۔(۲)

جب آپ مقام سرف پر پہنچے تو حضرت عائشہ کو ماہواری شروع ہوگئی۔آپ نے اس جگہ صحابہ کرام سے فرمایا، جس شخص کے پاس قربانی کا جانور نہ ہو اگر وہ چاہے تو صرف عمرہ کا احرام باندھے(یعنی عمرہ کرنے کے بعد حلال ہوجائے) اور جس شخص

(۱) بخاری:۱۸۲۵، مسلم:۱۱۹۳

(۲) احمد:۱/۲۳۲، اس کی سند میں ضعیف راوی ہے۔

کے پاس قربانی کا جانور ہوتو وہ یہ نہ کرے(۱)، یہ اختیار میقات کے پاس والے اختیار سے بڑھ کر تھا، پھر جب آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے تو جن کے پاس قربانی کا جانور نہ تھا انہیں لازمی طور پر حکم دے دیا کہ اسے عمرہ میں تبدیل کردیں اور عمرہ کے بعد حلال ہوجائیں، اور جس کے پاس جانور ہوتو وہ احرام میں رہیں، حضرت سراقہ بن مالک نے سوال کیا کہ یہ حکم صرف اسی عمرہ کے ساتھ خاص ہے یا ہمیشہ کے لئے تو آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ کے لئے ہے۔(۲)

پھر آپ مقام ذی طوی (جوزاہر کے کنوئں سے مشہور ہے) پر پہنچے، وہاں چار ذی الحجہ اتوار کی شب گزاری اور فجر کی نماز ادا کرکے غسل فرمایا اور مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوگئے، مکہ میں آپ حجون سے متصل ثنیہ علیا کی بلند کھائی میں دن کے وقت داخل ہوئے، جبکہ عمرہ کے موقع پر آپ نشیبی علاقہ سے داخل ہوئے تھے، پھر آپ آگے بڑھے اور چاشت کے وقت مسجد میں داخل ہوئے۔

امام طبری نے ذکر کیا ہے کہ آپ باب عبد مناف سے جسے باب بنی شیبہ کہا جاتا ہے(۳)، داخل ہوئے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ آپ جب کسی بلند جگہ سے داخل

---

(۱) بخاری:۱۵۶۰،مسلم:۱۲۱۱

(۲) بخاری:۱۵۵۷،مسلم:۱۲۱۶

(۳) مجمع الزوائد:۳/۲۳۸

ہوتے تو بیت اللہ کی طرف رخ کر کے دعا فرماتے ،امام طبری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب آپ بیت اللہ کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

” اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَالْبَیْتَ تَشْرِیْفًا،وَّتَعْظِیمًا ،وَتَکْرِیْمًاوَمَھَابَةً “(۱)

اے اللہ اس گھر کو اور زیادہ عزت وعظمت اور بزرگی اور رعب عطا فرما۔

ایک اور مرسل روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ بیت اللہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ،اللہ اکبر کہتے اور یہ دعا پڑھتے تھے:

” اَللّٰھُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ حَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ ،اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَالْبَیْتَ تَشْرِیْفًا،وَّتَعْظِیمًا ،وَتَکْرِیْمًاوَمَھَابَةً، وَزِدْ مَنْ حَجَّهُ أَوِاعْتَمَرَهُ تَکْرِیْمًا وَتَشْرِیْفًا وَتَعْظِیْمًا وَبِرًّا “(۲)

اے اللہ! تو سلام ہے اور تجھی سے سلامتی ہے،ہمیں سلامتی دے،اے اللہ! اس گھر کو اور زیادہ عزت،عظمت،کرامت اور رعب دے،اور جو اس کا حج یا عمرہ کرے اسے بھی عزت،کرامت،عظمت اور نیکی عطا کر۔

جب آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے پاس تشریف لائے اور تحیۃ

(۱) مجمع الزوائد:۳/ ۲۳۸،یہ روایت ضعیف ہے۔
(۲) بیہقی:۵/۷۳،اس کی سند منقطع ہے۔

المسجد نہیں پڑھی کیونکہ یہاں طواف ہی تحیۃ المسجد ہے، جب حجر اسود کے بالمقابل ہوئے تو اس کا استلام کیا اور کوئی مزاحمت نہ فرمائی اور نہ رکن یمانی کی طرف بڑھے اور نہ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا، اور نہ آپ نے یہ کہا کہ طواف سے میری سات چکر کی نیت ہے، اور نہ اس سے پہلے اللہ اکبر کہا، اور نہ حجر اسود کی طرف پورے جسم کو سامنے کیا پھر مڑ کر اس کو اپنی داہنی طرف کیا ہو، بلکہ اس کی طرف رخ فرما کر استلام کیا، پھر دائیں جانب چلے، اس وقت آپ باب کعبہ کے پاس یا میزاب کے نیچے یا کعبہ کی پشت پر یا گوشوں کے پاس کھڑے ہو کر کوئی مخصوص دعا نہیں فرمائی اور نہ طواف کے دوران کوئی معین دعائیں فرمائیں، البتہ دونوں رکن کے درمیان آپ سے یہ دعا پڑھنا ثابت ہے:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾[البقرة:٢٠١]

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔(۱)

نبی کریم ﷺ نے طواف کے تین چکروں میں رمل کیا یعنی چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے چلے، اور اضطباع کیا یعنی داہنا مونڈھا کھول کر بائیں مونڈھے پر

(۱)ابوداود:۱۸۹۲،احمد:۳/۴۱۱

چادرڈالدی،اسی طرح داہنا کندھا کھلا ہوا تھااور بایاں ڈھکا ہوا،آپ جب حجراسود کے سامنے ہوتے تو اس کی طرف اشارہ کرتے اور اسے استلام کرتے یعنی اپنے خمدار عصاسے چھوکراسے بوسہ دیتے تھے۔

آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے رکن یمانی کا بھی استلام کیا ہے لیکن بوسہ دینا ثابت نہیں اور نہ استلام کے بعد ہاتھ کو بوسہ دینا ثابت ہے۔آپ سے حجراسود کو بوسہ دینا ثابت ہےاور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے اس کا ہاتھ سے استلام کیا ہے یعنی اس کو ہاتھ سے چھوکر ہاتھ سے بوسہ لے لیا ہے،اور یہ بھی ثابت ہے کہ اسے عصاسے چھوا ہے، اس طرح کل یہ تین صورتیں ثابت ہیں۔

امام طبرانی نے ایک معتبر حوالے سے ذکر کیا ہے کہ آپ جب رکن یمانی کو چھوتے تو (بسم اللہ واللہ اکبر) کہتے تھےاور جب حجراسود کے پاس پہنچتے تو اللہ اکبر کہتے تھے(۱) اور حجراسوداوررکن یمانی کےعلاوہ کسی اورحصہ کوچھونا ثابت نہیں۔

جب آپ طواف سے فراغ ہوئے تو مقام ابراہیم کے پیچھے آئے اور یہ آیت پڑھی۔

﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾[البقرۃ:۱۲۵]

(۱) بیہقی: عبداللہ بن عمر سے موقوفا ثابت ہے۔

مقام ابراہیم کو مصلی بنالیجیئے۔

پھر دو رکعت نماز پڑھی، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ الکافرون اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص تلاوت فرمائی، ان آیات سے یہ مراد تھی کہ یہ تمام کام اللہ ہی کے لئے ہے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حجر اسود کے پاس تشریف لائے اور اس کا بوسہ لیا، پھر سامنے کے دروازے سے صفا کی طرف نکل آئے اور قریب ہو کر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰه﴾[البقرة:١٥٨]

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔

پھر فرمایا:

"أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهِ"

میں بھی اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع کیا۔

اور نسائی میں ہے کہ تم بھی اسی سے شروع کرو۔(١)

پھر کوہ صفا پر چڑھ کر بیت اللہ کی طرف رخ کیا اور اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھی:

"لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

(١) نسائی:٥/٢٣٦، اس کی سند صحیح ہے۔

شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ، وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَه "

اللہ واحد کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اس کی بادشاہت ہے، اسی کے لئے ستائش ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے، اللہ واحد کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندہ کو فتحیاب کیا اور تمام جماعتوں کو تنہا شکست دی۔

اس طرح تین مرتبہ یہ دعائیں فرمائیں پھر سعی کرتے ہوئے مروہ کی طرف چلے، نشیب میں پہنچ کر دوڑنے لگے جب وادی سے نکل آئے تو معمول کے مطابق چلنے لگے۔(۱)

جب مروہ پر پہنچے تو اس پر چڑھ کر بیت اللہ کا رخ کر کے اللہ تعالی کی تکبیر و توحید بیان کی اور جو صفا پر دعائیں کی تھیں یہاں پر بھی کیں۔

جب صفا، مروہ کی سعی سے فارغ ہوئے تو ان تمام لوگوں کو جن کے ہمراہ قربانی کے جانور نہ تھے، ہدایت کی کہ اب احرام اتار دیں اور پوری طرح سے حلال ہو جائیں کیونکہ عمرہ کے ارکان پورے ہو گئے اور آٹھویں ذی الحجہ تک اسی طرح رہیں، اور چونکہ آپ

---

(۱) مسلم: ۳۰/۱۲۱۸

ﷺ کے ساتھ قربانی کا جانور تھا اس لئے اپنی نسبت فرمایا اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو قربانی کا جانور ساتھ ہرگز نہ لاتا اور صرف عمرہ کا احرام باندھتا(۱)، اسی جگہ آپ ﷺ نے بال منڈوانے والوں کے لئے تین مرتبہ اور بال چھوٹے کرنے والوں کے لئے ایک مرتبہ دعائے مغفرت فرمائی۔(۲)

ازواج مطہرات نے احرام کھول دیا تھا لیکن حضرت عائشہ ماہواری کی مجبوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔

آپ نے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے آپ کی طرح نیت کی تھی اور ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے احرام میں باقی رہنے کا حکم دیا اور جن کے ساتھ نہیں تھے انہیں احرام کھولنے کا حکم دیا۔

آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں چار دن قیام کے دوران نماز قصر ادا فرماتے رہے(۳) اور جمعرات کے دن چاشت کے وقت مسلمانوں کے ساتھ منی تشریف لے گئے، جنہوں نے احرام کھول دیا تھا، وہ اپنے گھروں سے حج کا احرام باندھ کر نکلے، اس

(۱) بخاری:۱۵۵۷، مسلم:۱۲۱۶

(۲) بخاری:۱۷۲۷ اور مسلم:۱۳۰۱

(۳) بخاری:۱۰۸۵

وقت وہ مسجد حرام نہیں گئے، جب منی پہنچے تو وہاں ظہر وعصر کی نماز ادا کی اور وہیں شب گزاری، جب صبح ہوئی تو عرفات کو روانہ ہوئے اور ضب کا راستہ اختیار فرمایا، صحابہ کرام میں سے بعض تلبیہ کہہ رہے تھے اور بعض تکبیر، آپ دونوں کو سن رہے تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے۔

عرفات کے مشرقی حصہ میں مقام نمرہ کے پاس آ گئے تھے، خیمہ نصب کر دیا گیا، اس میں آپ نے قیام فرمایا، سورج ڈھلنے کے بعد قصواء اونٹنی پر سوار ہو کر وادی عرنہ کے نشیبی حصہ تک گئے۔

اسی مقام سے سواری ہی پر بیٹھے ایک عظیم الشان خطبہ دیا، اس میں آپ نے اسلامی اصول وقواعد کی وضاحت کی اور جاہلی رسم ورواج کی تردید فرمائی، جان ومال، عزت وآبرو کی حرمت کا اعلان فرمایا، جسے دوسرے اہل مذاہب نے بھی تسلیم کیا تھا۔

اسی خطبہ میں جاہلی معاملات اور سود کے خاتمہ کا اعلام فرمایا، اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی، ان کے حقوق اور فرائض کو بتایا اور یہ بتایا کہ خوراک اور پوشاک ان کا حق ہے، لیکن اس کی کوئی تعیین وتحدید آپ نے نہیں فرمائی، شوہر کو آپ نے یہ اجازت دی کہ اگر بیوی اس کی اجازت کے بغیر کسی مرد کو گھر میں داخل کرے تو اسے مار سکتا ہے۔

اس خطبہ میں آپ نے تمسک بالقرآن کا حکم دیا اور بتایا کہ جب تک مسلمان قرآن کو تھامے رہیں گے گمراہ نہیں ہوں گے، پھر آپ نے فرمایا کہ صحابہ سے رسول کے متعلق پوچھا جائے گا اور دریافت کیا کہ وہ کیا جواب دیں گے اور کس چیز کی گواہی دیں گے ؟صحابہ نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیں گے کہ بیشک آپ نے رسالت کا حق ادا فرمادیا اور امت کو نصیحت فرمائی، احکام اسلام بحسن وخوبی پہنچادیئے،تو اس پر آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین مرتبہ اللہ تعالی کو گواہ بنایا اور صحابہ کرام کو حکم دیا کہ جو موجود ہیں وہ غیر موجود تک آج کی بات پہنچادیں ، اس موقع پر آپ نے ایک ہی خطبہ دیا، درمیان میں بیٹھے نہیں۔

جب آپ نے خطبہ ختم کیا تو حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم دیا چنانچہ اذان اور اقامت ہوئی پھر آپ نے سری قراءت سے ظہر کی دو رکعت ادا کی اور یہ جمعہ کا دن تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مسافر پر جمعہ کی نماز فرض نہیں پھر دوبارہ اقامت ہوئی اور آپ نے عصر کی بھی دو رکعتیں ادا فرمائیں،آپ کے ہمراہ اہل مکہ بھی تھے انہوں نے بھی قصر اور جمع کر کے نماز ادا کی اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سفر قصر میں مسافت کی تعداد متعین نہیں۔

جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو میدان عرفات ہی میں پہاڑ کے دامن میں

چٹانوں کے پاس قبلہ رخ سواری پر اس طرح کھڑے ہوئے کہ جبل مشاۃ آپ کے سامنے تھا اورسورج غروب ہونے تک دعاوگریہ وزاری میں مصروف رہے اورلوگوں کو حکم دیا کہ وادی عرنہ سے ہٹ جائیں، اورمزید فرمایا کہ عرفات پورے کا پورا جائے وقوف ہے(۱) اورلوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے مشاعر میں ٹھہرے رہیں اور وہیں وقوف کریں کیونکہ یہاں کے والد حضرت ابراہیم کی میراث ہے۔(۲)

دعامیں آپ اپناہاتھ سینے تک اٹھالیتے تھے جس طرح کوئی مسکین کھانا مانگ رہاہو، اس موقع پرارشادفرمایا کہ ''بہترین دعاعرفات کی دعاہے''۔(۳)

عرفات میں آپ کی دعاؤں میں سے یہ دعائیں منقول ہیں:

" اللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلامِي وَتَرَى مَكَانِي وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلانِيَّتِي وَلَايَخْفَى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِي أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ، الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ، الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذُنُوبِهِ أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِينِ، وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ،وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ

(۱)مسلم:۱۲۱۸

(۲)ابوداود:۱۹۱۹ اورترمذی:۳۸۳

(۳)ترمذی:۳۵۷۹،اس کی سند حسن ہے۔

رَقَبَتُهُ، وَفَاضَتْ لَكَ عَيْنَاهُ وَذَلَّ جَسَدُهُ،وَرَغِمَ أَنْفُهُ لَكَ، اللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْنِي بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا،وَكُنْ بِي رَؤُوفًا رَحِيمًا يَاخَيْرَ الْمَسْئُولِينَ وَيَا خَيْرَ الْمُعْطِينَ"

اللہ تو ہی میری بات سنتا ہے، میرے مقام کو دیکھتا ہے، میرے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، تجھ سے میرا کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں، میں محتاج، فقیر، مدد اور پناہ کا طالب، ڈرنے والا اور گناہوں کا اعتراف کرنے والا ہوں، تجھ سے مسکین کی طرح مانگتا ہوں اور ذلیل وگنہگار کی طرح عاجزی کرتا ہوں، ڈرنے والے کی طرح تجھے پکارتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہے، آنکھیں بہہ رہی ہیں، جسم ذلیل ہے اور ناک خاک آلود ہے، اے میرے رب! مجھے دعا کے بعد محروم نہ فرما، اور میرے ساتھ شفقت ورحمت کا معاملہ فرما، اے بہترین مسئول! اور بہترین دینے والے! (اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے)۔(۱)

نیز آپ کی دعاؤں میں یہ بھی ثابت ہے:

" اللّٰهُم لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِي تَقُولُ وَخَيْرًا مِمَّا نَقُولُ ، اللّٰهُم لَكَ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي،وَإِلَيْكَ مَآبِي، وَلَكَ رَبِّي تُرَاثِي، اللّٰهُم إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ،وَوَسْوَسَةِ الصَّدْرِ،وَشَتَاتِ الْأَمْرِ، اللّٰهُم إِنِّي

(۱)الطبرانی فی الصغیر۹۶۹۔

أَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَاتَجِيءُ بِهِ الرِّيحُ "

اے اللہ! تو ہی حمد کے لائق ہے جو ہم کہہ سکتے ہیں، اور ہمارے نطق وکلام سے بھی بہتر حمد کے لائق ہے، اے اللہ! میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا مرنا تیرے ہی لئے ہے، اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے، سب کچھ جمع کیا ہوا تیرے لئے ہے، اے اللہ! عذاب قبر سے اور دل کے وسوسوں اور پراگندہ امور سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اے اللہ! میں اس شر سے جو آندھی لے کر آئے تیری پناہ چاہتا ہوں، (اسے ترمذی نے ذکر کیا ہے)۔(۱)

امام احمد نے حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث سے نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ عرفہ کے دن نبی کریم ﷺ کی زیادہ تر یہ دعا تھی:

" لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "(۲)

اے خدائے واحد جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی

(۱) ترمذی: ۳۵۲۰ اس کی سند قوی نہیں ہے۔

(۲) احمد: ۲/۲۱۰ اس کی سند میں ضعف ہے۔

بادشاہی ہے اور اسی کی حمد ہے، اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ان دعاؤں کی سند میں کچھ کمزوری ہے۔

اس مقام پر نبی کریم ﷺ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:(۱)

﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِينًا ﴾[المائدة: ٣]

آج ہم نے آپ کا دین مکمل کر دیا اور آپ پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام آپ کے لئے پسند کر لیا۔

اس دوران ایک صحابی اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں دو کپڑوں میں کفن دینے کا حکم فرمایا (یعنی احرام کی چادروں میں) اور فرمایا کہ ان کو خوشبو نہ لگائی جائے، ان کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے اور ان کا چہرہ اور سر نہ چھپایا جائے، اور فرمایا کہ اللہ تعالی ان کو قیامت میں اسی طرح لبیک کہتے ہوئے اٹھائے گا۔(۲)

---

(۱) بخاری:۴۵، مسلم:۳۰۱۷

(۲) بخاری:۱۲۶۵، مسلم:۱۲۰۶

اس واقعہ سے بارہ احکام مستنبط ہوتے ہیں:

(۱) میت کو غسل دینا واجب ہے۔

(۲) مرنے سے انسان ناپاک نہیں ہوتا، اگر ناپاک ہوجاتا تو غسل سے اس کی نجاست میں اضافہ ہی ہوتا۔

(۳) میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔

(۴) پاک چیزوں کی آمیزش سے پانی کی قوت طہارت (صفائی) زائل نہیں ہوتی۔

(۵) محرم کو غسل دینا جائز ہے۔

(۶) محرم کو بھی بیری کے پتوں اور پانی سے غسل دیا جاسکتا ہے۔

(۷) میراث اور قرض دونوں سے تدفین و تکفین مقدم ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اسے دو کپڑوں میں کفن دینے کا حکم دیا اور میراث اور قرض کے متعلق کچھ دریافت نہیں فرمایا۔

(۸) کفن میں دو کپڑوں پر اکتفا کرنا جائز ہے۔

(۹) محرم کو خوشبو لگانا جائز نہیں ہے۔

(۱۰) محرم کا سر چھپانا منع ہے۔

(۱۱) محرم کا چہرہ چھپانا ممنوع ہے، چھ صحابہ کرام اس کے جواز کے قائل ہیں اور جو لوگ اس کی اباحت کے قائل ہیں ان ہی کے اقوال سے دلیل پکڑی ہے اور حدیث کے الفاظ ”لَاتُخَمِّرُوا وَجْهَهُ“

یعنی اس کا چہرہ نہ چھپاؤ کو غیر محفوظ بتایا ہے۔

(۱۲) موت کے بعد بھی احرام باقی رہتا ہے۔

جب آفتاب غروب ہوگیا اور زردی بھی ختم ہوگئی اور غروب آفتاب میں کوئی شبہ نہیں رہا تو آپ عرفات سے چل پڑے اور حضرت اسامہ ابن زید کو اپنے پیچھے بیٹھا لیا اور سکینت وخاموشی سے چلتے رہے، ناقہ کی لگام اپنی طرف کھینچ لی یہاں تک کہ اس کا سر آپ کے پیر کے کنارے کو چھونے لگا، اس موقع پر آپ فرما رہے تھے ”اے لوگو! سکون واطمینان سے چلو کیونکہ تیز چلنا نیکی نہیں ہے“۔(۱) آپ ﷺ مازمین کے راستے سے واپس ہوئے اور ضب کے راستے سے عرفات تشریف لائے تھے۔

عید کے موقعوں پر بھی نبی کریم ﷺ کی یہی سنت طیبہ تھی کہ آپ راستہ بدل لیا کرتے تھے، پھر آپ نے چلنے کا وہ انداز اختیار کیا جسے (سیرعنق) کہتے ہیں۔یعنی نہ بہت آہستہ نہ بہت تیز، جب آپ کو وسیع میدان نظر آتا تو ذرا تیز ہوجاتے اور جب کسی

(۱) بخاری:۱۶۷۱، مسلم:۱۲۱۸

ٹیلے پر پہنچتے تو اونٹنی کی باگ قدرے ڈھیلی چھوڑ دیتے تاکہ وہ چڑھ جائے۔

آپ ﷺ سارے راستہ میں مسلسل تلبیہ کہتے رہتے تھے، راستہ میں ایک جگہ آپ نے پیشاب کر کے خفیف وضو فرمایا، اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا نماز پڑھنا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''نماز کی جگہ آگے ہے''۔(۱) پھر آپ مزدلفہ پہنچے اور نماز کے لئے وضو کیا اور مؤذن کو اذان دینے کا حکم فرمایا اور اقامت کہلوائی پھر مغرب کی نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے سامان اتارا اور سواریوں کو بیٹھایا۔ پھر دوبارہ اقامت کہی گئی اور عشاء کی نماز ادا فرمائی عشاء کے لئے اذان نہیں کہی، مغرب وعشاء کے درمیان آپ نے کوئی نماز نہیں پڑھی۔(۲)

پھر آپ سو گئے یہاں تک صبح ہوگئی، اس رات آپ نے کوئی عبادت نہیں کی اور نہ عیدین کی راتوں میں آپ سے کوئی عبادت ثابت ہے، اس رات چاند ڈوبنے کے بعد آپ نے کمزور اہل وعیال کو فجر سے پہلے منی روانگی کا حکم دے دیا اور ان کو تاکید فرمائی کہ آفتاب نکلنے سے پہلے کنکریاں نہ ماریں، جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ام سلمہ نے فجر سے پہلے کنکری ماری (۳) وہ منکر ہے۔ امام احمد نے اس کا انکار کیا ہے اور حضرت

---

(۱) بخاری:۱۸۱، مسلم:۱۲۸۰

(۲) بخاری:۱۸۱، ۱۲۸۰

(۳) ابوداود:۱۹۴۲

سودہ وغیرہ کی حدیثیں (۱) ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ غور وفکر کرنے کے بعد ان حدیثوں میں ہمیں کوئی تعارض نہیں معلوم ہوا، آپ ﷺ نے آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنے سے بچوں کو روک دیا کیونکہ اس کے لئے کہ اسی میں جلدی کرنے کے لئے ان کا کوئی عذر نہیں البتہ عورتوں کو آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنے کی اجازت اس عذر کی وجہ سے دی کہ بعد میں بھیڑ ہوجائے گی اوران کے لئے مشقت کا اندیشہ ہوجائے گا، احادیث سے یہی ثابت ہے کہ بیماری یا بڑھاپے کا عذر ہوتو آفتاب نکلنے سے پہلے کنکری مارنا جائز ہے، لیکن جو شخص طاقت وتندرستی رکھتا ہو اس کے لئے تقدیم جائز نہیں، حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روانگی میں جلدی چاند ڈوبنے کے بعد ہوگی، آدھی رات میں نہیں، اس کی تحدید کی کوئی دلیل نہیں۔

طلوع فجر کے بعد اول وقت میں نماز فجر ادا فرمائی اور اس کے لئے اذان واقامت کہی گئی، پھر سوار ہوکر مشعر حرام کے پاس آئے اور قبلہ رخ ہوکر دعا وتضرع، تکبیر وتہلیل وذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے حتی کہ کافی روشنی ہوئی اور مزدلفہ میں اسی جگہ کھڑے ہوکر یہ فرمایا کہ پورا مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے۔

پھر آپ مزدلفہ سے حضرت فضل بن عباس کو پیچھے سواری پر بیٹھا کر چلے اور راستہ بھر

(۱) بخاری: ۱۶۸۰، مسلم: ۱۲۹۰

تلبیہ کہتے رہے، اور حضرت اسامہ بن زید قریش کی جماعت کے ساتھ پیدل جار ہے تھے۔

راستے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ رمی الجمار کے لئے سات کنکریاں چن لیں، انہیں اسی رات پہاڑ سے نہیں توڑا تھا جس طرح آج کل لوگ لاعلمی میں کرتے ہیں اور نہ ہی رات میں چنی گئی تھی، چنانچہ جب وہ کنکریاں آپ کو دی گئیں تو آپ انہیں اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے اور فرمانے لگے، ایسی ہی کنکریوں سے رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو اور پچھلی قومیں دین میں غلو کرنے کیوجہ سے ہلاک ہوئیں۔(۱)

جب آپ وادی محسّر میں پہنچے تو اونٹنی کی رفتار تیز کردی، آپ کا طریقہ یہی تھا کہ جب ان مقامات میں پہنچتے جہاں قوموں پر عذاب نازل ہوا ہے تو آپ تیزی سے نکل جاتے، اس جگہ اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا جس کا واقعہ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں ذکر کیا ہے، اسی وجہ سے اس جگہ کا نام وادی محسر رکھا گیا، محسر یعنی روک دینا اور اس جگہ ہاتھی مکہ میں داخل ہونے سے رک گئے تھے۔

اسی طرح مقام حجر سے گزرتے ہوئے بھی آپ نے کیا تھا۔ محسر منی اور مزدلفہ کے

(۱) نسائی: ۵/ ۲٦۸ .اس کی سند جید ہے۔

درمیان حد فاصل ہے اور دونوں میں سے کسی میں سے نہیں ہے، اس طرح ''عرنہ'' عرفات اور مشعرحرام کے درمیان حد فاصل ہے جو نہ اس میں داخل ہے اور نہ اس میں۔

آپ جب منی پہنچے تو درمیانی راستہ سے جمرہ عقبہ کے پاس آئے اور جمرہ کے سامنے وادی میں اس طرح کھڑے ہوئے کہ مکہ آپ کے بائیں اور منی آپ کے دائیں ہاتھ تھا، پھر طلوع آفتاب کے بعد سواری پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے سات کنکریاں پھینکیں، ہر کنکری پر تکبیر کہتے تھے اور لبیک کہنا بند کر دیا تھا، حضرت اسامہ اور حضرت بلال آپ کے ساتھ ساتھ تھے، ایک اونٹنی کی مہار تھامے تھے اور دوسرے دھوپ سے بچانے کے لئے کپڑا تانے ہوئے تھے(۱)، اس سے ثابت ہوا کہ محرم کے لئے دھوپ سے بچنا جائز ہے۔

پھر آپ منی واپس آئے اور فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں لوگوں کو قربانی کے دن کی حرمت و عظمت اور فضیلت بیان فرمائی اور مکہ مکرمہ کی تمام شہروں پر فضیلت سے آگاہ کیا اور حکم فرمایا کہ کتاب اللہ کے مطابق حکمرانی کرنے والوں کی اطاعت کریں، مزید ارشاد فرمایا کہ مجھ (آپ ﷺ) سے مناسک حج سیکھ لیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کا آخری حج

(۱) مسلم: ۱۲۹۸

ہو(۱)، پھرلوگوں کوحج کے مسائل کی تعلیم دی اورمہاجرین اورانصارکواپنے مرتبوں پر رکھا اورلوگوں کو یہ حکم دیا کہ آپ کے بعدکفر کی طرف نہ لوٹیں اور ایک دوسرے کوقتل نہ کریں،آپ نے تبلیغ احکام کاحکم دیااور بتایا کہ ’’اکثر سننے والے بھول جاتے ہیں اوران سے سیکھنے والوں کو یادرہتا ہے‘‘(۲)خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ ’’مجرم خوداپنے او پرظلم کرتا ہے‘‘۔(۳)

مہاجرین کوآپ نے قبلہ کے دائیں طرف اورانصارکو بائیں طرف اتارا،دوسرے لوگ ان کے اردگرد تھے،اللہ تعالی نے لوگوں کے اندراتنی قوت سماعت پیدا کردی تھی کہ اہل منی نے بھی اپنے اپنے گھروں میں آپ کا خطبہ سنا۔

آپ نے خطبہ میں مزید فرمایا کہ ’’اپنے رب کی عبادت کرواور پانچوں نمازیں پڑھواورمہینے کے روزے رکھو،جب حکم دیا جائے تواطاعت کرواوراپنے رب کی جنت میں داخل ہوجاؤ‘‘۔(۴)

پھرآپ نے لوگوں کوالوداع کیا تولوگ کہنے لگے یہ حجۃ الوداع ہے،پھرآپ منی

(۱)مسلم:۱۲۱۸

(۲)بخاری:۱۷۴۲،مسلم:۱۶۷۹

(۳)ترمذی:۲۱۶۰،ابن ماجہ:۳۰۵۵،اس کی سند جید ہے۔

(۴)ترمذی:۶۱۶

میں قربانی کے مقام پر تشریف لائے چنانچہ وہاں تریسٹھ اونٹ ذبح کیے، اونٹ کو کھڑا رکھ کر اور اس کی اگلی بائیں ٹانگ باندھ کر آپ نے نحر کیا، زندگی کے سال کے مطابق تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کے بعد سو میں سے بقیہ اونٹوں کو ذبح کرنے کے لئے آپ نے حضرت علی کو حکم دیا اور ان کے جھول، کھال اور گوشت کو مسکینوں میں تقسیم کر دیا، قصاب کو اجرت میں قربانی کی کوئی چیز دینے سے منع فرمادیا اور بتایا کہ ہم اسے اپنے پاس سے اجرت دیں گے، پھر فرمایا کہ جو چاہے قربانی میں سے کاٹ کر لے جائے۔(۱)

اس موقع پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حج کے موقع پر سات اونٹ ذبح کیے (۲) تو اس کی تین طرح سے توجیہ کی جاسکتی ہے۔

اول یہ کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے سات سے زیادہ اونٹ ذبح نہیں کیے اور باقی تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کا کسی اور کو حکم دے دیا تھا، جب تریسٹھ اونٹ ذبح ہو گئے تو سو کا عدد پورا کرنے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا اور اس جگہ سے چلے گئے۔

---

(۱) بخاری:۱۷۰۷، مسلم:۱۳۱۷

(۲) بخاری:۱۵۴۷، مسلم:۱۵۶۶

دوسرے یہ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے صرف سات ہی اونٹ ذبح کرتے ہوئے دیکھا اور حضرت جابر نے تمام اونٹوں کو، دونوں حضرات نے اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق تعداد کا ذکر کیا ہے۔

تیسرے یہ کہ پہلے آپ نے سات اونٹ ذبح کئے پھر آپ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مل کر یکے بعد دیگرے تریسٹھ اونٹ ذبح کئے، جیسا کہ غرفہ بن حارث کندی کا بیان ہے کہ انہوں نے اس دن نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ برچھے کا اوپری حصہ تھامے ہوئے ہیں اور حضرت علی کو نچلا حصہ پکڑنے کا حکم دیا اور ان دونوں نے مل کر جانور ذبح کئے،(۱) تریسٹھ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سو تک ذبح کئے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، واللہ اعلم۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کسی سے یہ منقول نہیں کہ ھدی اور قربانی ایک ساتھ کی جائے، اس موقع پر ھدی قربانی ہے، منی میں جو جانور ذبح کیا جائے، وہ ھدی ہے اور دوسری جگہ جو ذبح کیا جائے، وہ قربانی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی

---

(۱) ابوداود:۱۷۶٦

ازواج مطہرات کی طرف سے ایک گائے کی قربانی کی (۱) تو اس سے مراد ھدی ہے، اس لئے وہ سبھی متمتع تھیں جن پر ھدی واجب تھی جو ان کی طرف سے آپ نے ذبح فرمایا۔

لیکن یہاں یہ اشکال ہے کہ امہات المومنین کی تعداد نو تھی اور گائے صرف سات افراد کے لئے کافی ہے تو اس کے متعلق حدیث میں تین الفاظ آئے ہیں، ایک یہ کہ ان کے درمیان ایک گائے ذبح کی، دوسرا یہ کہ ان کی طرف سے اس دن گائے کی قربانی پیش کی، تیسرا یہ ہے کہ ہمارے پاس قربانی کے دن گائے کا گوشت لائے، میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے، جواب ملا کہ نبی کریم ﷺ نے ازواج مطہرات کی طرف سے ذبح کیا ہے۔

ایک گائے اور اونٹ میں کتنے افراد شریک ہو سکتے ہیں، اس سلسلہ میں اختلاف ہے، ایک قول ہے کہ سات آدمیوں کی طرف سے درست ہے، ایک قول دس کا بھی ہے، یہ اسحاق کا قول ہے۔

مختلف حدیثوں کا ذکر کر کے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان احادیث کی تین توجیہ کی جا سکتی ہیں۔ یا تو یہ کہا جائے کہ سات کی حدیثیں بکثرت اور صحت کے

(۱)(۲) بخاری:۵۵۵۹، مسلم:۱۲۱۱

اعتبار سے زیادہ صحیح ہیں، یا کہا جائے کہ غنیمت کی تقسیم کے وقت اونٹ دس بکریوں کے برابر سمجھا جائے گا تا کہ تقسیم منصفانہ ہو لیکن قربانی اور ہدی میں صرف سات آدمیوں کی طرف سے درست ہونے کا حکم ایک شرعی قاعدے اور اندازے کی بنا پر ہے، یا یہ کہا جائے کہ یہ اندازے اختلاف زمان ومکان یا اونٹ کے سبب مختلف ہو جاتے ہیں، واللہ اعلم۔

آپ نے منی کے ذبح خانے میں جانور ذبح کیا اور یہ فرمایا کہ پورا منی کا علاقہ جائے قربانی ہے(۱) اور مکہ کی گلیاں راستہ اور ذبح کی جگہ دونوں ہیں، یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نحر صرف منی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مکہ مکرمہ میں جہاں بھی قربانی کر دی جائے، جائز ہے، جیسے آپ نے عرفات میں وقوف کر کے فرمایا کہ ہم نے یہاں وقوف کیا لیکن سارا میدان عرفات جائے وقوف ہے۔(۲)

نبی کریم ﷺ سے منی میں عرض کیا گیا کہ کیا یہاں آپ کے لئے پہلے سے کوئی خیمہ وغیرہ لگا دیا جائے تا کہ گرمی سے حفاظت ہو سکے تو آپ نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ منی میں جو پہلے جہاں پہنچ گیا، وہ اس جگہ کا حقدار ہو گیا۔(۳)

---

(۱) مسلم: ۱۲۱۸

(۲) مسلم: ۱۲۱۸

(۳) ابوداود: ۲۰۱۹، اور ابن ماجہ: ۳۰۰۶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منی تمام مسلمانوں کی مشترکہ سرزمین ہے اور جو جس جگہ پہلے پہنچ جائے اس کا حقدار ہے لیکن وہ جگہ اس کی ملکیت ہرگز نہیں البتہ روانگی تک اس کے قبضہ میں رہے گی۔

جب نبی کریم ﷺ قربانی سے فارغ ہو گئے تو حجام کو بلایا اور سر کا حلق کرایا، حجام سے آپ نے فرمایا "اے معمر! تیرے ہاتھ میں استرا ہے اور ہم نے اپنے کان کی لو تیرے حوالے کردی ہے تو انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم یہ تو مجھ پر اللہ تعالی کی نعمت ہے اور اس کا بڑا احسان ہے، آپ نے فرمایا: ہاں ایسی صورت میں میں تمہارے لئے اقرار کرتا ہوں" اسے امام احمد نے ذکر کیا ہے (۱)، پھر آپ ﷺ نے حجام سے فرمایا کہ شروع کرو اور اپنی دائیں جانب کی طرف اشارہ فرمایا، جب وہ فارغ ہوا تو آپ نے اپنے پاس والوں پر وہ بال تقسیم فرما دیئے پھر حلاق کو اشارہ کیا تو اس نے بائیں طرف کا حلق کیا، پھر آپ نے دریافت فرمایا، ابوطلحہ یہاں ہیں، چنانچہ وہ بال ان کو عطا فرما دیئے۔(۲)

اس موقع پر آپ نے سر منڈوانے والوں کے لئے تین بار اور چھوٹے کرنے

---

(۱) احمد: ۶/۴۰۰۰، یہ ضعیف ہے۔

مسلم: ۱۲۱۸

والوں کے لئے ایک بار دعائے مغفرت فرمائی، اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حلق حج کی ایک عبادت ہے، صرف ممنوعات سے آزادی کا ایک ذریعہ نہیں۔

طواف افاضہ: پھر نبی کریم ﷺ ظہر سے قبل سوار ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے گئے اور طواف افاضہ کیا اور یہی آپ کا طواف زیارت بھی تھا، اس موقع پر نہ تو کوئی دوسرا طواف کیا اور نہ سعی کی اور یہی درست ہے۔

طواف افاضہ اور طواف وداع دونوں میں آپ نے رمل نہیں کیا بلکہ صرف طواف قدوم میں رمل کا ثبوت ہے، پھر آپ زمزم کے پاس تشریف لائے اور وہاں لوگ پانی پلا رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے تو میں خود اتر کر تمہارے ساتھ پانی پلاتا، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کو ڈول میں پانی دیا، آپ نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔(۱)

اس واقعہ پر بعض لوگوں نے کہا کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے ممانعت ایک استحبابی حکم ہے، بعض لوگوں کی رائے ہے کہ کھڑے ہو کر ضرورتاً پینے کی اجازت ہے اور یہی زیادہ راجح ہے۔

صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ

(۱) مسلم: ۱۲۱۸

الوداع میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا، آپ چھڑی سے حجر اسود چھو رہے تھے (۱) اور اسی حدیث میں ہے کہ تا کہ لوگوں کو دکھا سکیں اور لوگ آپ سے مسائل دریافت کر سکیں کیونکہ لوگوں نے آپ کو گھیر رکھا تھا اور یہ طواف وداع نہیں تھا کیونکہ آپ نے اس کو رات میں کیا تھا اور طواف قدوم بھی نہ تھا کیونکہ اس میں رمل کیا تھا اور سواری پر سے رمل کا کوئی قائل نہیں ہے، اس کے بعد آپ ﷺ منی واپس آ گئے۔

اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز منی میں ادا کی یا مکہ مکرمہ میں اور اس دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک طواف اور ایک سعی کی اور یہ ان کے حج وعمرہ کے لئے کافی ہو گیا۔

حضرت صفیہ نے بھی اسی دن طواف کیا تو اس کے بعد وہ ماہواری میں مبتلا ہو گئیں تو انہیں طواف وداع کی طرف سے یہ طواف کافی ہو گیا، چنانچہ انہوں نے طواف وداع مستقل طور پر نہیں کیا۔

اس طرح عورت کے متعلق نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ ہو گئی کہ اگر حج میں عورت کو طواف افاضہ سے قبل حیض آ جائے تو اسے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے اور اگر

---

(۱) بخاری: ۱۶۰۷، مسلم: ۱۲۷۲

طواف افاضہ کے بعد حیض آجائے تو یہ طواف وداع کی جانب سے کافی ہے اور طواف وداع کرنے کی ضرورت نہیں۔

پھر منیٰ واپس آکر وہیں رات گزاری، جب صبح ہوئی تو زوال آفتاب تک انتظار کیا، جب سورج ڈھل گیا تو جمرات کی طرف پیدل تشریف لے گئے اور جمرہ اولی سے شروع کیا، جو مسجد خیف سے متصل ہے، تیسرے جمرہ تک ہر ایک پر سات سات کنکریاں پھینکیں، ہر کنکری پر تکبیر کہتے اور جب سات پوری ہو جاتیں تو ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے، دعا اتنی طویل کرتے جتنی سورہ البقرہ پڑھی جاسکے لیکن تیسرے جمرہ پر دعا نہیں فرمائی اور کنکریاں پھینکنے کے بعد ہی واپس آگئے، بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کی جگہ تنگ تھی، بعض لوگوں نے کہا کہ اس موقع کی دعا اس عبادت کا ایک حصہ ہے، اس لئے رمی سے فارغ ہونے کے بعد دعا کے کوئی معنی نہیں، بلکہ عبادت کے دوران ہی کی دعا افضل ہے۔

میرے دل میں ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہا کہ آپ نماز ظہر سے قبل رمی کرتے تھے یا بعد میں، گمان غالب یہ ہے کہ آپ نماز سے قبل ہی رمی کرتے تھے کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے کہ جب سورج ڈھل جاتا تھا تب آپ رمی فرماتے تھے۔

فصل (۳۰)

آپ ﷺ کے منی میں معمولات اوراسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ حج کے دوران چھ مقامات پر دعا کے لئے ٹھہرے،کوہ صفا پر،کوہ مروہ پر،میدان عرفات میں،مزدلفہ میں،جمرۂ اولی کے قریب اور جمرۂ ثانیہ کے قریب۔

آپ نے منی میں دو خطبہ دیئے،ایک قربانی کے دن جس کا ذکر ہو چکا ہے،دوسرا ایام تشریق کے درمیانی دن میں،یہیں پر عباس رضی اللہ عنہ نے حاجیوں کو پانی پلانے کی غرض سے منی کے بجائے مکہ میں رات گزارنے کی اجازت چاہی تو مرحمت فرمادی،اس طرح اونٹوں کے چرواہوں نے منی سے باہر اپنے اونٹوں کے پاس رات گزارنے کی اجازت مانگی تو آپ نے انہیں بھی اجازت دے دی اور فرمایا کہ قربانی والے دن کنکری مارلیں اور پھر بعد کے دنوں کی کنکریاں کسی ایک دن میں اکٹھی مارلیں (۱)،اور یہ ان کے حق میں ایک رخصت تھی،امام مالک فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے دودنوں میں سے پہلے دن رمی کے لئے فرمایا،پھر وہ آخری دن رمی کریں۔

اس حدیث کے متعلق ابن عیینہ کا قول ہے کہ چرواہوں کو آپ نے رخصت دی ہے کہ ایک دن کنکری ماریں اور ایک دن چھوڑ دیں۔

(۱) دیکھئے ابوداود: ۱۹۷۵،اور ترمذی ۹۵۵،اس کی سند جید ہے۔

ان مذکورہ دونوں طرح کے لوگوں کے لئے حدیث سے منی میں رات نہ گزارنے کی اجازت ملتی ہے لیکن کنکریاں مارنا نہ چھوڑیں بلکہ تاخیر کرکے رات میں ماریں یا دونوں کے بدلہ ایک دن کنکری ماریں۔

اگر کسی کو اپنے مال کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو یا کوئی مریض جو قافلے سے بچھڑ جانے کا خوف رکھتا ہو یا منی میں رات گزارنے پر قادر نہ ہو، ایسے تمام لوگوں کے لئے رات گزارنی ضروری نہیں بلکہ ان سے یہ حکم ساقط ہو جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے دو دن میں کنکری مار کر واپس جانے میں جلدی نہیں کی بلکہ تیسرے دن بھی رک کر پورے تین دن کنکری ماری اور منگل کے دن ظہر کے بعد وادی محصب کی طرف روانہ ہوئے جو بلندی پر واقع ہے، اور جہاں بنی کنانہ کا خیمہ تھا، وہاں ابو رافع رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے لئے قبہ بنا رکھا تھا انہوں نے یہ کام از خود محض اللہ تعالی کی توفیق سے کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم نہ دیا تھا، پھر آپ ﷺ نے وہاں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا فرمائی اور سو گئے (۱) پھر اٹھ کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور سحری کے وقت طواف وداع فرمایا۔

اس رات عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف عمرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے

---

(۱) مصنف کا اشارہ بخاری حدیث نمبر ۱۷۵۶ کی طرف ہے۔

فرمایا بیت اللہ اور صفا ومروہ کا طواف کر لینا ان کے حج وعمرہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا، لیکن انہوں نے مستقل اور مکمل طور پر عمرہ کرنے پر اصرار کیا تو آپ نے ان کے بھائی کو حکم دیا کہ انہیں تنعیم سے عمرہ کرالیں، چنانچہ وہ بھی رات میں اسی طرح سے عمرہ کر کے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے ساتھ وادی محصب پہنچ گئیں، آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگ عمرہ سے فارغ ہو گئے، حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ ہاں، پھر آپ ﷺ نے قافلے کو روانہ ہونے کا حکم فرمایا اور لوگ روانہ ہو گئے (۱)، علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ وادی محصب میں قیام سنت طیبہ ہے یا محض ایک اتفاقی قیام تھا، اس سلسلہ میں دو قول ہیں۔

(۱) دیکھئے بخاری:۱۷۸۸، اور مسلم:۱۲۱۱

فصل (۳۱)

آپ ﷺ کا سفر حج سے واپسی کا طریقہ

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بیت اللہ کے اندر داخل ہونا حج کی سنت اور نبی کریم ﷺ کی اتباع ہے، لیکن احادیث کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کسی حج یا عمرے کے موقع پر خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہوئے (۱) البتہ فتح مکہ کے وقت اس میں داخل ہوئے تھے، ملتزم کے پاس کھڑے ہو کر فتح مکہ کے موقع پر دعائیں فرمائی تھیں، رہی ابوداود کی روایت جس میں عمرو بن شعیب روایت کرتے ہیں اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے کہ انہوں نے اپنا سینہ، چہرہ، بازو اور ہتھیلیاں ملتزم پر رکھ کر پھر پھیلا کر دعا مانگی اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح کیا تھا۔ (۲) اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے طواف وداع کے موقع پر ایسا کیا ہو یا پھر کسی اور موقع سے کیا ہو طواف وداع کے علاوہ کیا ہو، لیکن مجاہد وغیرہ فرماتے ہیں کہ مستحب یہ ہے کہ طواف وداع کے بعد ملتزم کے پاس تھوڑی دیر کھڑے ہو کر دعا کی جائے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ ملتزم کے درمیان کھڑے ہوتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نکلنے کا ارادہ کر رہے تھے تو ام سلمہ رضی

---

(۱) بخاری: ۱۷۹۱، مسلم: ۱۳۳۲۔ (۲) ابوداود ۱۸۹۹، اور ابن ماجہ ۲۹۶۲، اس کی سند حسن ہے۔

اللہ عنہا نے جو مریضہ تھیں اور طواف نہیں کیا تھا، نکلنا چاہا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ جب لوگ فجر کی نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں تو اونٹنی پر سوار ہو کر طواف کرلو، اور انہوں نے ایسا ہی کیا اور نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ وہ چل پڑیں۔(۱) یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ کام یوم النحر کو ہوا ہو بلکہ یہ طواف وداع کے موقع پر تھا جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دن فجر کی نماز آپ نے مکہ مکرمہ ہی میں ادا فرمائی، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو نماز میں سورہ طور پڑھتے سنا۔ پھر آپ مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب آپ مقام روحاء پہنچے تو ایک سوار ملا، اس نے سلام کیا اور پوچھا یہ کون لوگ ہیں، بتایا گیا مسلمان لوگ ہیں، پھر دریافت کیا یہ کون ہیں، بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔

پھر ایک عورت نے شیر خوار بچے کو دکھا کر عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ! کیا اس کا بھی حج ہوگا، فرمایا: ہاں اس کا بھی حج ہوگا اور تجھے ثواب ملے گا۔(۲)

واپسی میں بھی آپ ﷺ نے ذی الحلیفہ میں رات گزاری، جب صبح مدینہ منورہ

(۱) بخاری: ۴۸۵۳، اور مسلم: ۱۲۷۶

(۲) مسلم ۱۳۳۶

نظر آیا تو تین بار تکبیر کہی اور یہ دعا پڑھی:

” لَا إِلٰـهَ إِلَّا الـلّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر آيِبُـوْنَ، تَـائِبُـوْنَ، عَابِدُوْن سَاجِدُون، لِرَبِّنَا حَامِدُوْن ، صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ“

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہی اور حمد اسی کی ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، ہم واپس لوٹے توبہ کرتے ہوئے، عبادت کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے، اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندہ کی مدد کی اور جماعتوں کو تنہا شکست دی۔

پھر آپ دن کے وقت معرس کے راستے سے مدینہ میں داخل ہوئے، جب آپ تشریف لے گئے تھے تو شجرہ کے راستے سے گئے تھے۔

فصل (۳۲)

آپ ﷺ کا قربانی اور عقیقہ کرنے کا طریقہ

قربانی اور عقیقہ صرف ان آٹھ قسموں کے جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر سورۃ الأنعام میں موجود ہے، ان کے علاوہ اور جانوروں کی قربانی ثابت نہیں، وہ آٹھوں قسم قرآن کی ان چار آیتوں میں مذکور ہیں:

پہلی آیت کریمہ:

﴿أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾[المائدة: ١]

تمہارے لئے چوپائے مویشی حلال کئے گئے۔

دوسری آیت کریمہ:

﴿لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾[الحج: ٣٤]

تاکہ اللہ کے دیئے ہوئے چوپایوں پر اللہ کے نام ذکر کریں۔

تیسری آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةً وَفَرْشاً﴾[الأنعام: ١٤٢]

اور اللہ نے چوپایوں میں سے بعض اونچے قد کے اور بعض زمین سے لگے ہوئے پیدا کئے۔

چوتھی آیت کریمہ:

﴿هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ﴾[المائدة:٩٥]

کعبہ تک پہنچنے والی قربانی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کو پہنچنے والی ہدی (قربانی کے جانور) انہیں آٹھ جوڑوں میں سے ہوگی، اور یہ علی رضی اللہ عنہ کا استنباط ہے۔

وہ ذبیحے جن سے اللہ کا تقرب اور اس کی عبادت مقصود ہوتی ہے، اس کی تین قسمیں ہیں، ہدی، قربانی، عقیقہ۔ ہدی میں نبی کریم ﷺ نے بکری اور اونٹ دیئے، ازواج مطہرات کی طرف سے گائے ذبح فرمائی، نیز آپ نے عمرہ اور حج میں ہدی پیش کی، بکری کو جب آپ ﷺ ہدی میں بھیجتے تو قلادہ پہنا دیتے تھے اور نشان لگاتے تھے۔

جب آپ مقیم ہوتے اور ہدی بھیجتے تو کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام نہ کرتے تھے، اور جب اونٹ بطور ہدی کے لے جاتے تو اسے قلادہ بھی ڈالتے اور نشان بھی لگاتے تھے، چنانچہ آپ اس کی کوہان کی دائیں جانب سے ذرا شق کر دیتے تا کہ خون نکل آئے، ہدی بھیجتے ہوئے آپ قاصد کو یہ حکم دیتے تھے کہ اگر کوئی جانور مرنے لگے تو اسے ذبح کرے اور اس کے نعل کو اس کے خون سے رنگ کر اس کے پہلو میں رکھ دے، اس کا

گوشت نہ خود کھائے نہ اپنے ساتھیوں کو کھلائے ، (۱) بلکہ دوسروں میں تقسیم کر دے، گوشت کے استعمال کرنے سے روکنے کا مقصد یہ تھا کہ قاصد جانوروں کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرے۔

آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک اونٹ اور ایک گائے میں سات آدمیوں کو شریک ہونے کی اجازت دی ہے اور ہدی کے لئے لے جانے والے کو بھی اجازت دی کہ اگر سواری میسر نہ ہو تو معروف طریقہ سے اس پر سوار ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اسے دوسری سواری مل جائے ، (۲) علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اونٹنی کا دودھ بھی استعمال کر سکتا ہے اگر اس کے بچہ سے فاضل بچ جائے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ آپ اونٹوں کے بائیں پاؤں کو باندھ کر تین پاؤں پر کھڑا کر کے انہیں نحر کرتے ، اور نحر کرتے وقت (بسم اللہ اللہ اکبر) کہتے تھے اور آپ قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ کام کسی دوسرے کے سپرد بھی کر دیتے ، جیسا کہ آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو سو میں سے بقیہ اونٹوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور جب آپ ﷺ بکری ذبح کرتے تو اپنا پیر اس کے چہرہ پر

(۱) مسلم: ۱۳۲۵

(۲) مسلم: ۱۳۲۴

رکھتے پھر بسم اللہ کہہ کر ذبح کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو ہدی اور قربانی کے گوشت میں سے کھانے کی اور بطور تحفہ و توشہ لے جانے کی بھی اجازت دی ہے اور تین دن سے زیادہ جمع رکھنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سال لوگوں کو تکلیف مشقت تھی (۱)۔

بسا اوقات آپ نے ہدی کا گوشت تقسیم فرمایا، اور بسا اوقات یوں بھی فرمایا: جو چاہے کاٹ کر جائے (۲) اس اجازت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ شادی وغیرہ میں اگر کوئی چیز نچھاور کی جائے تو اسے حاصل کرنا جائز ہے، کچھ لوگوں نے دونوں کے درمیان وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے فرق کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ عمرہ کے ہدی کو مروہ کے پاس اور حج قران کے ہدی کو منی میں ذبح کرتے تھے اور آپ نے حلال ہونے سے قبل کبھی ذبح نہیں کیا، نیز آپ نے ہمیشہ طلوع آفتاب اور رمی کے بعد ہی ذبح کرتے تھے۔ حاصل یہ ہوا کہ یوم النحر (دسویں تاریخ) کو آپ ترتیب کے ساتھ یہ چار کام کرتے تھے، پہلے رمی، دوم قربانی، سوم بال منڈانا، چہارم طواف کرنا، سورج نکلنے سے قبل قربانی کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔

(۱) مسلم: ۱۹۷۱

(۲) ابوداود: ۱۷۶۵، اور اس کی سند جید ہے۔

فصل (۳۳)

آپ ﷺ کا قربانی کے جانور کے انتخاب میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ کبھی بھی قربانی کا ناغہ نہیں فرماتے تھے، آپ نماز کے بعد دو مینڈھوں کی قربانی کرتے تھے اور فرماتے: جس نے نماز عید سے قبل ذبح کر دیا اس کی قربانی نہیں ہوئی، بلکہ وہ ایک گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے مہیا کیا ہے(۱)، آپ کی اسی سنت طیبہ کی ہم پیروی کرتے ہیں اور محض وقت نماز کا کچھ اعتبار نہیں۔

آپ نے یہ حکم دیا کہ بھیڑ کا ایک سال کا بچہ ذبح کیا جائے(۲) اور دوسرے جانور دو دانت والے ہوں۔ آپ سے یہی مروی ہے کہ تشریق کے تمام دن ذبح کئے جائیں لیکن یہ حدیث منقطع ہے(۳)، امام عطاء، امام حسن بصری، امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اور ابن منذر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

آپ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ قربانی کا جانور بہترین اور تمام عیوب سے پاک منتخب

---

(۱) بخاری:۹۵۵، مسلم:۱۹۶۱

(۲) مسلم:۱۹۶۳

(۳) ابن حبان:۳۸۵۴، اس روایت کے اور شواہد ہونے کی وجہ سے علامہ البانی نے صحیح الجامع ۴۵۳۷ میں صحیح قرار دیا ہے۔

فرماتے تھے اور آپ نے کان کٹے اور سینگ ٹوٹے ہوئے جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے (۱)، اسے ابوداود نے ذکر کیا ہے، آپ نے حکم دیا ہے کہ آنکھوں اور کانوں کو دیکھ لیا جائے یعنی ان کے صحیح وسالم ہونے کا بخوبی جائزہ لے لیا جائے۔

لنگڑے جانور یا جس کا کان آگے یا پیچھے سے کٹا ہو یا جس کا کان پھٹا ہو یا جس کے کان میں سوراخ ہو، ایسے کی قربانی نہیں کرنی چاہئیے ،امام ابوداود نے اسے ذکر کیا ہے۔(۲)

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ عیدگاہ میں قربانی کرنے کی تھی، ابوداود نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے قربانی کے دن دو سینگوں والے خوبصورت دو مینڈھے ذبح کیئے، جب آپ نے انہیں لٹایا تو یہ دعا پڑھی۔

”وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفاً وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ،إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ،لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عن محمد وأمته بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ “(۳)

(۱)ابوداود:۲۸۰۵،اس کی سند حسن ہے۔

(۲)ابوداود:۲۸۰۴،اس کی سند جید ہے۔

(۳)ابوداود:۲۷۹۵،اس کی سند حسن ہے۔

میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے کی طرف کردیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں، اے اللہ! تیرے لئے اور تیری ہی طرف سے محمد ﷺ اور آپ کی امت کی جانب سے ہے۔

پھر آپ نے ذبح کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ جب ذبح کریں تو اچھی طرح ذبح کریں اور جب قتل کریں تو اچھے انداز سے قتل کریں، اور مزید فرمایا کہ اللہ تعالی نے ہر چیز پر احسان کو فرض کیا ہے(۱)، آپ کی یہ بھی سنت ہے کہ بکری ایک آدمی اور اس کے گھر والوں کی جانب سے کافی ہے۔

(۱) مسلم:۱۹۵۵

فصل (۳۴)

آپ ﷺ کا عقیقہ سے متعلق اسوۂ حسنہ

موطا میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے عقیقہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا ''میں عقوق (نافرمانی) کو پسند نہیں کرتا'' (۱) گویا آپ نے عقوق کے لفظ کو نا پسند فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح روایت سے ثابت ہے کہ ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری'' (۲) نیز آپ نے فرمایا ''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض مرہون ہے۔ لہذا چاہیئے کہ ساتویں دن اس کی طرف سے قربانی کی جائے، اس کا سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے''۔ (۳)

حدیث میں ہے کہ ''ہر بچہ عقیقہ کا مرہون ہوتا ہے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہ ہو، اسے والدین کی شفاعت سے روک دیا جائے گا، ظاہری معنی یہ ہے کہ بچہ اپنی ذات سے متعلق مرہون ہوگا اور اس سے مطلوب بھلائی سے محروم ہوگا لیکن اس

(۱) ابوداود: ۲۸۴۲، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) ترمذی: ۱۵۱۳، ابن ماجہ: ۲۱۶۳، اس کی سند جید ہے۔

(۳) ترمذی: ۱۵۲۳، ابوداود: ۲۸۳۸، یہ حدیث جید ہے۔

سے یہ لازم نہیں آتا کہ آخرت میں اسے سزا ملے گی،بعض مرتبہ لڑکا والدین کی کوتاہیوں کی وجہ سے بھلائی سے روک دیا جاتا ہے جیسے جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھی جائے۔

امام ابوداود نے مراسیل میں جعفر سے روایت کی ہے،وہ محمد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے عقیقہ کے موقع پر فرمایا"دائی کے گھر میں ایک ٹانگ بھیج دو اور خود کھاؤ اور دوسروں کو کھلاؤ اور کوئی ہڈی نہ توڑو"۔(۱)

میمونی کہتے ہیں کہ ہم نے آپس میں مباحثہ کیا کہ کتنے دن کے بعد بچہ کا نام رکھا جائے تو اس پر ابوعبداللہ نے کہا کہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تیسرے دن نام رکھا جائے لیکن سمرہ کا قول ہے کہ ساتویں دن نام رکھنا چاہئے۔

(۱)ابوداود فی المراسیل ۳۴۲۔

فصل (۳۵)

آپ ﷺ کا نام اور کنیت کے متعلق سنت طیبہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ”اللہ تعالی کے نزدیک سب سے ذلیل اس آدمی کا نام ہے جو اپنا نام ملک الاملاک رکھتا ہے حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں“۔(۱)

نیز آپ کا ارشاد ہے ”اللہ تعالی کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام اور سب سے برے نام حرب ومرہ ہیں“۔(۲)

آپ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ”اپنے لڑکے کا نام یسار، رباح، نجیح، افلح نہ رکھو“ کیونکہ تم ضرورت کے وقت دریافت کروگے۔ کیا وہ ہے؟ اگر نہ ہوا تو جواب ہوگا۔نہیں“۔(۳)

یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے عاصیہ نام بدل کر جمیلہ رکھا(۴)، جویریہ کا پہلے نام برہ

(۱) بخاری:۶۲۰۵،مسلم ۲۱۴۳

(۲) ابوداود:۴۹۵۰، اس کی سند عقیل بن شبیب مجہول ہے۔

(۳) مسلم:۲۱۳۷

مسلم:۲۱۳۹

تھا، اس کو بدل کر آپ نے جویریہ رکھ دیا(۱)، زینب بنت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا نام (برہ) رکھنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اپنے آپ کو پاکیزہ مت جتاؤ، اللہ تعالیٰ تم میں سے نیکوں کو خوب جانتا ہے۔(۲)

نیز آپ نے ابو الحکم کو بدل کر ابو شریح رکھ دیا(۳) اور اصرم کو بدل کر زرعہ کر دیا(۴) اور سعید بن المسیب کے دادا کا نام حزن سے بدل کر سہل رکھ دیا، تو انہوں نے انکار کیا، اور کہا کہ سہل کو پیروں سے روندا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا نہیں، اس سے خدمت لی جاتی ہے۔(۵)

ابو داؤد کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاص، عزیز، عتلہ، شیطان، حکم، غراب، حباب، شہاب وغیرہ کے نام بدل دیئے اور شہاب کی جگہ ہشام، حرب کی جگہ سلم اور مضطجع کی جگہ منبعث نام رکھ دیئے اور زمین کا نام عفرۃ تھا تو آپ نے اس کی جگہ خضرہ کہا، شعب ضلالت کو شعب ہدایت رکھ دیا، اور بنو مغویہ کو بنو رشدہ کا نام

---

(۱) مسلم: ۲۱۴۰

(۲) مسلم: ۲۱۴۲

(۳) ابوداود: ۴۹۵۵، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۴) ابوداود: ۴۹۵۴، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۵) بخاری: ٦١٩٠

رکھا۔(۱)

اسماء چونکہ معانی کے قالب ہوتے ہیں اور علامت ہوتے ہیں لہذا حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ربط اور مناسبت ہو، ایسا نہ ہو کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے یکسر بے ربط اور اجنبی ہوں کیونکہ یہ چیز عقل وحکمت کے منافی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نام کا مسمی کی شخصیت پر ایک مخصوص اثر ہوتا ہے اور انسان اپنے ناموں کے حسن وقبح، ذلت وعزت لطافت وکثافت سے ضرور متاثر ہوتا ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

” قَلَّ أَنْ بَصرَت عَيْنَاكَ ذَالقَبٍ إِلَّا وَمَعْنَاهُ إِنْ فَكَّرتَ فِي لَقَبِه “

بہت کم ایسا ہوگا کہ تمہاری نظر کسی لقب والے پر پڑے اور اس کا معنی اس کے لقب میں نہ ہو بشرطیکہ تم غور کرو۔

خود نبی کریم ﷺ اچھے نام پسند کرتے تھے اور اس کا حکم دیا کہ جب کوئی قاصد آپ کے پاس بھیجا جائے تو وہ اچھی شکل اور اچھے نام والا ہو، آپ نیند اور بیداری دونوں میں ناموں سے معانی کو اخذ کرتے تھے جیسا کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اور صحابہ کرام عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ان کے پاس ابن طاب کی تر

(۱)ابوداود:۵۹۵٦

کھجوریں حاضر کی گئیں تو آپ نے اس کی یہ تاویل فرمائی کہ دنیا میں کامیابی اور آخرت میں رفعت و بلندی مسلمانوں کے لئے ہے اور جو دین ان کے لئے پسند فرمالیا ہے، وہ بار آور اور خوشگوار ہو چکا ہے۔(۱)

حدیبیہ کے دن سہیل بن عمرو کے آنے سے آپ ﷺ نے اس کام میں سہولت و آسانی ہونے کی تاویل فرمائی (۲)۔ایک دن آپ نے کچھ لوگوں سے بکری دوہنے کے لئے کہا، چنانچہ ایک شخص کھڑا ہوا تو آپ نے دریافت کیا: تمہارا نام کیا ہے اس نے عرض کیا: مرہ (تلخ)، آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ، دوسرا شخص کھڑا ہوا، آپ نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا حرب (جنگ)، آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ، پھر ایک اور شخص اٹھا تو آپ نے نام پوچھا، اس نے عرض کیا یعیش (یعنی زندہ رہے)، آپ نے دودھ دوہنے کا حکم دیا(۳)، اسی طرح آپ برے ناموں والی جگہوں اور وہاں سے گزرنے کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔

ایک دفعہ دو پہاڑوں کے درمیان گزر رہے تھے، ان کا نام دریافت فرمایا تو لوگوں

(۱) مسلم: ۲۲۷۰

(۲) بخاری: ۲۷۳۱

(۳) موطا: ۲/۹۷۳، یہ روایت مرسل ہے۔

نے بتایا ''فاضح ومخزی'' (ذلیل اور رسوا کرنے والا)، تو یہ سن کر آپ نے راستہ بدل دیا۔
چونکہ اسم اور مسمی کے مابین وہی ربط ومناسبت ہوتی ہے جو روح وجسم اور قالب وحقیقت کے درمیان ہے، اس لئے عقل سلیم نام سن کر مسمی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جیسا کہ ایاس بن معاویہ وغیرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی شخص کو دیکھ کر فرماتے تھے کہ اس کا نام فلاں فلاں ہوگا اور یہ بات غلط نہ ہوتی تھی۔
اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے نام دریافت فرمایا، اس نے عرض کیا، جمرہ (چنگاری) پوچھا باپ کا کیا نام ہے؟ کہنے لگا، شہاب (شعلہ) پھر آپ نے پوچھا تماری منزل کہاں ہے؟ کہنے لگا ''حرۃ النار'' (آگ کی گرمی) مزید عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تمہاری رہائش کہاں ہے؟ جواب دیا ''ذات لظی'' (شعلہ والی جگہ میں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سب سن کر فرمایا کہ اچھا جاؤ تب تو تمہارا گھر جل ہی گیا ہوگا، راوی کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو واقعی اس کا گھر جل چکا تھا۔(۱)
جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے سہیل کا نام سن کر معاملہ کی سہولت کو سمجھا، آپ نے اپنی امت کو اچھے نام رکھنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا کہ انہیں قیامت کے دن ان ہی ناموں سے پکارا جائے گا۔

---

(۱) موطا: ۲/۹۷۳، اس کی سند منقطع ہے۔

آپ غور کریں کہ نبی کریم ﷺ کے دونوں ناموں احمد و محمد سے ان کے اوصاف کا کس انداز سے اشتقاق ہوا، محمد کے لفظ میں صفات حمیدہ کی کثرت اور احمد میں دوسروں کی صفات سے افضلیت ہے۔

اسی طرح آپ نے ابو الحکم کو ابو جہل کی کنیت دی، اور اللہ تعالی نے عبدالعزی کو ابولہب سے مخاطب کیا، کیونکہ اس کا ٹھکانہ آگ کے شعلے تھے۔

جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس کا نام یثرب تھا، آپ نے اس کا نام طیبہ رکھ دیا اور اس سے تثریب (تخریب) کے معنی ختم ہو گئے۔(۱)

چونکہ اچھا نام اپنے مسمی کا مقتضی ہوتا ہے اس لئے آپ نے بعض عربوں سے فرمایا، اے بنی عبداللہ! اللہ تعالی نے تمہارا اور تمہارے باپ کا نام اچھا رکھا، اس طرح آپ نے انہیں اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔

بدر کے موقع پر ان چھ ناموں پر غور کیجئے جن سے موسوم لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ پر نکلے تھے ایک کا نام ولید تھا جس کا معنی ہے بچہ، اس سے ابتدائی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، دوسرے کا نام تھا شیبہ یعنی بڑھاپا، اس سے اخیر کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، تیسرے کا نام تھا عتبہ جو عتب بمعنی غصہ سے ماخوذ ہے، یعنی اس نام سے موسوم شخص مورد

(۱) بخاری:۱۴۸۱، مسلم:۱۳۹۲

عتاب ہوگا، اب مقابل کے ناموں پر غور کیجئے علی، ابوعبیدہ اور حارث، علی سے بلندی، ابوعبیدہ سے بندگی اور حارث سے آخرت کے لئے کوشش ثابت ہوتی ہے۔

اس وجہ سے اللہ تعالی کے نزدیک اچھے نام وہی ہیں جن کے معنی اچھے ہوں، چونکہ عبودیت اللہ کی نظر میں زیادہ محبوب ہے اس لئے اس کے ناموں میں سے اللہ اور رحمٰن کی طرف اس کی اضافت ''القادر والقاہر'' کی طرف اضافت سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ بندے اور رب کے درمیان جو تعلق ہے وہ رحمت خالص کا ہے، اس کی رحمت سے بندے کا وجود ہے اور جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ محبت، خوف اور امید کے ساتھ اللہ کی بندگی کرے۔

چونکہ ہر بندہ ارادہ سے حرکت کرتا ہے اور ارادہ کی ابتدا قصد سے ہوتی ہے، پھر ارادے کے نتیجہ میں محنت اور کمائی ہوتی ہے، اس لئے سب سے سچا نام حارث اور ہمام ہے، اسی طرح چونکہ سچی ملکیت اور بادشاہت صرف اللہ تعالی کے لئے زیبا ہے اس لئے اس کے نزدیک سب سے اچھا نام ملک الملوک، سلطان السلاطین ہے کیونکہ اللہ تعالی کے علاوہ کسی کے اندر یہ وصف نہیں، اس لئے اس نام سے کسی کو موسوم کرنا باطل ہوگا، اللہ تعالی باطل کو پسند نہیں کرتا، بعض لوگوں نے قاضی القضاۃ کو بھی اسی حکم میں شمار کیا ہے اور سید الناس کے نام سے بھی کسی کو موسوم کرنا اسی قبیل سے ہے، کیونکہ یہ وصف

نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے زیبا نہیں۔

چونکہ حرب (لڑائی) اور مرارہ (تلخی) کا مسمی مزاج وطبیعت کو ناگوار ہے اس لئے سب سے قبیح و ناپسند نام حرب اور مرہ سمجھا گیا ہے اور یہی حکم حنظلہ اور حزن وغیرہ ناموں کا بھی ہے۔

جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اخلاق سب سے زیادہ اعلیٰ و احسن ہوتے ہیں اوران کے نام بھی اچھے وبہترین ہوتے ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ انبیاء کرام کے نام رکھا کریں، جیسا کہ سنن ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ''انبیاء علیہم السلام کے ناموں پر اپنے نام رکھو''۔(۱)

اگر اس میں کوئی دوسرا فائدہ نہ بھی ہو پھر بھی ان کے ناموں کی وجہ سے ان سے تعلق قائم رہتا ہے اور نام کی تکرار سے ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، اس سے ان کے صفات حسنہ واخلاق حمیدہ سے متصف ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لڑکے کا نام ''یسار'' وغیرہ رکھنے کی ممانعت ہے تو اس کا سبب دوسرا ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے ''یعنی جب اس کے متعلق دریافت کروگے کہ وہ

---

(۱) بخاری فی الأدب المفرد ۸۱۴

وہاں ہےتو تم کہو گے: نہیں“ خدا جانے یہ ٹکڑا حدیث کے الفاظ ہیں یا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ اس طرح کے نام بدفالی پیدا کرسکتے ہیں، اس لئے محسن انسانیت ﷺ نے جو کہ اپنی امت کے غیر معمولی خیرخواہ تھے، بر بنائے رحمت و مصلحت یہ چاہا کہ ان اسباب سے محفوظ رکھا جائے جو ناگوار چیز کو سننے یا اس کے وقوع پذیر ہونے کو ضروری بنادیں، اس کے ساتھ اس کا بھی امکان ہے کہ نام اپنے برعکس معنی کا مسمی بن جائے جیسے یسار ایسے شخص کا نام ہوجائے جو سراسر مشکلات کا باعث ہو یا نجیح (کامیاب) ایسے آدمی کا نام ہو جو کبھی کامیاب نہ ہوتا ہو، یا رباح (منافع) ایسے آدمی کا نام ہو جو ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہو، اس طرح یہ نسبت ان کی طرف غلط ہوگی اور اللہ تعالی کی طرف بھی غلط انتساب ہوگا۔

مزید یہ کہ ایسے شخص سے لوگ نام کی طرح حسن سلوک کی توقع رکھیں گے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکا تو پھر وہ برا بھلا کہیں گے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَمَّوكَ مِنْ جَهْلِهِمْ سَدِيدًا   وَاللّٰهِ مَافِيكَ مِنْ سَدَادٍ

لوگوں نے جہالت سے تمہارا نام درست رکھ دیا ہے حالانکہ بخدا تمہارے اندر کوئی درستگی نہیں۔

یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب کسی کی ایسی تعریف کی جائے جو درحقیقت اس کے لئے مذمت اور لوگوں کی نظر میں بے وقعتی کا سبب بن جائے ، مثلا اگر تعریف میں ایسی باتیں ممدوح کی طرف منسوب کی جائیں جو اس میں موجود نہیں تو سننے والے انہی صفات کی اس سے توقع کریں گے اور اس کو ان صفات کا حامل مانیں گے لیکن جب تجربہ کے بعد وہ اوصاف نہیں ملیں گے تو ممدوح کی وقعت ان کے دلوں سے نکل جائے گی اور خود مدح مذمت کی شکل اختیار کرے گی ، اگر ایسے شخص کو بغیر تعریف کے چھوڑ دیا جائے تو مذکورہ خرابی لازم نہیں آئے گی ۔

اس میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ کہ ایسی تعریف سن کر انسان کو اپنی پاکی اور برتری کا احساس ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے برہ، رشید، مطیع، طائع وغیرہ جیسے نام رکھنے سے منع فرمایا ہے، اور کفار کا اس طرح کا نام ہرگز نہ رکھنا چاہیئے اور نہ ان جیسے ناموں سے انہیں پکارنا چاہیئے ۔

کنیت رکھنا دراصل ایک طرح سے تعظیم وتکریم کی چیز ہے، نبی کریم ﷺ نے صہیب کو ابو یحیی اور علی رضی اللہ عنہ کو ابو تراب کی کنیت مرحمت فرمائی اور انس ابن مالک کے بھائی جبکہ ابھی چھوٹے ہی تھے، انہیں ابو عمیر کی کنیت عطا کی ۔

نیز نبی کریم ﷺ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ آپ صاحب اولاد اور بے اولاد سب کو

کنیت عطا کرتے تھے اور ابوالقاسم کے علاوہ آپ سے ثابت نہیں کہ آپ نے کسی کنیت سے منع فرمایا ہو۔

لیکن اس سلسلہ میں علماء میں اختلاف ہے، بعض لوگوں کا قول ہے کہ کسی کی یہ کنیت رکھنا جائز نہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کے نام کے ساتھ یہ کنیت جائز نہیں، اس کی تائید میں ایک حدیث وارد ہے جسے امام ترمذی نے صحیح کہا ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں جمع کرنا جائز ہے کیونکہ علی رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں مذکور ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ اگر آپ (ﷺ) کے بعد میرے گھر میں کوئی لڑکا پیدا ہوا تو میں آپ کا نام اور آپ کی کنیت رکھوں گا آپ نے فرمایا، ٹھیک ہے، امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔(۱) چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کی حیات طیبہ میں آپ کی کنیت رکھنا ممنوع تھا اور وفات کے بعد جائز ہے۔

صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ کا نام رکھنا جائز ہے اور آپ کی کنیت اختیار کرنا ممنوع ہے، اور آپ کی زندگی میں آپ کی کنیت اختیار کرنے کی ممانعت زیادہ شدید تھی اور اسی طرح نام وکنیت دونوں اختیار کرنے کی ممانعت ہے۔

---

(۱) ترمذی:۲۸۴۶

علی رضی اللہ عنہ کی مذکور حدیث کی صحت میں علماء نے کلام کیا ہے اور امام ترمذی کی ان حدیثوں میں سے ہے جن کی تصحیح میں تساہل برتا گیا ہے۔

پھر علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں رخصت دی تھی، جس کا معنی یہ ہے کہ دوسروں کے حق میں ممانعت بدستور باقی ہے۔ رہی عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ ''کس چیز نے میرا نام حلال اور کنیت حرام کی ہے'' (۱) تو یہ حدیث غیر معیاری ہے اس سے صحیح حدیث کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سلف کی ایک جماعت نے ''ابو عیسی'' کنیت رکھنے کو مکروہ بتایا ہے اور دوسروں نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ ابو داود نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک لڑکے کو مارا جو کہ ابو عیسی کنیت رکھتا تھا، جب مغیرہ ابن شعبہ نے ابو عیسی کنیت اختیار کی تو عمر نے فرمایا کہ کیا تجھے اتنا کافی نہیں کہ تم ابو عبداللہ کنیت اختیار کر لو تو انہوں نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے میری کنیت رکھی ہے، اس پر عمر نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے تھے اور ہمیں اپنا انجام معلوم نہیں، پھر وفات تک ہمیشہ ابو عبداللہ ہی کی کنیت سے یاد کئے جاتے تھے۔ (۲)

(۱) ابوداود: ۴۹۶۸، یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲) ابوداود: ۴۹۶۳، یہ روایت جید ہے۔

نبی کریم ﷺ نے انگور کو "کرم" کہنے سے منع فرمایا کہ کرم تو مومن کا دل ہوتا ہے چونکہ لفظ کرم کثرت خیر و برکت پر دلالت کرتا ہے، لہذا ایسے امور خیر کا زیادہ مستحق مومن کا قلب ہی ہوسکتا ہے نہ کہ انگور کا درخت۔(۱)

رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا "دیہاتیوں کے نام تمہاری نمازوں پر غالب نہ آجائیں، دیکھو اس کا نام عشاء ہے لیکن وہ لوگ عتمہ کہتے ہیں۔(۲) ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا "اگر انہیں معلوم ہوتا کہ عتمہ (عشاء) اور صبح کی نماز میں کس قدر ثواب ہے تو گھسیٹتے ہوئے حاضر ہوتے"۔(۳)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ (عتمہ) لفظ مطلقا استعمال کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ عشاء کا نام چھوڑ کر اسے اختیار کرنے سے منع فرمایا اور ایسا اس نام کی محافظت کے خیال سے کیا، کیونکہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں اس نماز کو اسی نام سے موسوم کیا ہے، لہذا اسے نہ چھوڑا جائے اور اس پر دوسرے اسماء غالب نہ کردیئے جائیں، جس طرح متاخرین نے جدید اصطلاحات والفاظ کو قدیم الفاظ پر چسپاں کردیئے ہیں، جس کی وجہ

(۱) بخاری:۶۱۸۱، مسلم:۲۲۴۶

(۲) بخاری (۵۶۳)

(۳) بخاری:۶۱۵، مسلم:۴۳۷

سے اس قدر جہالت اور فساد وانتشار پیدا ہوا کہ جس کا علم صرف اللہ تعالی ہی کو ہے۔

اسی طرح ان چیزوں کے مقدم کرنے پر آپ کی محافظت کا معاملہ ہے جنہیں اللہ تعالی نے مقدم کیا ہے، مثلا بقرعید میں آپ نے پہلے نماز پڑھی پھر قربانی کی، اعضاء وضو کو دھونے میں پہلے چہرہ پھر دونوں ہاتھ، پھر سر کا مسح کیا، پھر دونوں پیر، اسی طرح صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کیا کیونکہ آیت میں پہلے صدقہ ہی کا ذکر ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾[الأعلى:١٤، ١٥]

کامیاب ہوا وہ جس نے پاکی حاصل کی اور اپنے رب کو یاد کیا پھر نماز پڑھی، اور اس طرح کی مثالیں بکثرت ہیں۔

فصل (۳۶)

آپ ﷺ کا انداز بیان اور گفتگو کا طریقہ

نبی کریم ﷺ گفتگو اور تقریر کے لئے بہترین اور لطیف ترین الفاظ استعمال کرتے تھے، فحش گوئی اور ترش روئی اختیار نہیں کرتے تھے، سخت مزاج اور تندمزاج لوگوں کے انداز بیان سے بعید تھے، گفتگو کے دوران چیختے اور چلاتے نہیں تھے۔

کسی اچھے لفظ کو نااہل شخص کے لئے اور کسی ناپسندیدہ لفظ کو اچھے شخص کے لئے استعمال نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ منافق کے لئے سید (۱) اور انگور کے لئے کرم اور ابوجہل کے لئے ابوالحکم کہنے سے منع فرمایا، اسی طرح آپ نے ایک صحابی ابوالحکم کا نام بدل کر ابوشریح رکھ دیا اور فرمایا کہ ’’حکم تو اللہ تعالی ہے اور اسی سے سارے فیصلے ہیں‘‘۔

اس طرح آپ نے منع کیا کہ غلام اپنے آقا کو (ربی) کہہ کر پکارے اور آقا اسے اپنا بندہ کہے (۲)، کسی نے آپ کے سامنے طبیب ہونے کا دعوی کیا تو آپ نے فرمایا کہ ’’تم رفیق ہو، طبیب تو پیدا کرنے والی ذات ہے‘‘۔ (۳)

---

(۱) ابوداود: ۴۹۷۷، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) بخاری: ۲۵۵۲، مسلم: ۲۲۴۹

(۳) ابوداود: ۴۲۰۷، یہ حدیث صحیح ہے۔

جاہل لوگ بعض فطری وقدرتی چیزوں کے جاننے والے کافروں کو حکیم کہتے ہیں حالانکہ حکیم صرف اللہ جل شانہ کی ذات پاک ہے جبکہ کافر کائنات کی سب سے زیادہ احمق مخلوق ہے۔

اسی طرح آپ نے ایک خطیب سے جس نے کہا تھا کہ جوان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ’’تم بدترین خطیب ہو‘‘ (۱) اسی طرح آپ نے فرمایا کہ ’’یہ مت کہو کہ جس طرح اللہ چاہے اور فلاں چاہے‘‘۔(۲)

اسی قبیل سے ان حضرات کا قول ہے کہ جو شرک سے پرہیز نہیں کرتے اور کہتے ہیں ’’أَنَا بِاللّٰهِ وَبِكَ‘‘ میں اللہ سے اور تم سے ہوں، ’’أَنَا فِي حَسْبِ اللّٰهِ وَحَسْبِكَ‘‘ ’’میں تمہاری اور اللہ کی کفایت میں ہوں‘‘ میرے لئے اللہ اور تمہارے سوا کوئی نہیں، یہ لوگ مزید کہتے کہ مجھے اللہ پر اور تم پر بھروسہ ہے، یہ اللہ کی اور تمہاری طرف سے ہے، تمہاری اور اللہ کی قسم، اس طرح کے جملوں میں چونکہ کہنے والا اللہ کا ساجھی بنا دیتا ہے اس لئے ان کی ممانعت اور قباحت مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ والے جملے سے بڑھ جاتی ہے البتہ اگر کوئی یوں کہے ’’میں اللہ سے ہوں اور پھر تم سے ہوں‘‘ یا ’’جو اللہ چاہے اور پھر تم

---

(۱) مسلم: ۸۷۰

(۲) بخاری فی الأدب المفرد ۷۸۷

چاہو" تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہوگی، جیسا کہ تین اشخاص کے واقعہ والی حدیث میں یہ جملہ وارد ہے "میرے لئے آج میرے پہنچنے کے لئے اللہ کا پھر تمہارے علاوہ کوئی سہارا نہیں"۔(۱)

رہا مذمت والے الفاظ کا ان لوگوں کے حق میں استعمال کرنا جو ان کے اہل نہیں تو اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

کوئی شخص زمانہ کو گالی نہ دے کیونکہ آپ ﷺ نے زمانہ کو گالی دینے سے منع کیا ہے اور فرمایا کہ "اللہ ہی زمانہ ہے" (۲) ایسا کرنے میں تین خرابیاں ہیں:

اول یہ کہ غیر مستحق کو گالی دی، دوم یہ کہ اس کا گالی دینا شرک کو متضمن ہے کیونکہ اسے فائدہ رساں اور ضرر رساں سمجھ کر گالی دی ہے، اور یہ کہ زمانہ ظالم ہے، جیسا کہ بہت سے شاعروں نے اشعار میں زمانہ کو برا بھلا کہا ہے اور بہت سے جاہل تو علانیہ طور پر زمانہ کو لعنت وملامت کرتے ہیں، سوم یہ کہ بدکلامی اور گالی ان کاموں کے کرنے والوں پر واقع ہوتی ہے جن سے انسان ناراض ہوتا ہے حالانکہ اگر اللہ تعالی لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرے تو زمین وآسمان میں فساد پیدا ہو جائے، اور حالت جب ان کے مساعد

---

(۱) بخاری:۳۴۶۳، مسلم:۲۹۶۴

(۲) بخاری:۶۱۸۲، مسلم ۲۲۴۶

وموافق ہوجاتے ہیں تو یہی لوگ زمانہ کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔
اسی قبیل سی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”تم میں کوئی یہ نہ کہے کہ شیطان ہلاک ہو کیونکہ یہ سن کر شیطان پھولے نہیں سماتا اور تکبر میں کہنے لگتا ہے کہ میں نے اپنی طاقت سے بندہ کو زیر کرلیا ہے بلکہ یوں کہا کرو ”بسم اللہ“ اس سے وہ مکھی کی طرح چھوٹا اور حقیر ہوجاتا ہے“۔(۱)
اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ”بندہ جب شیطان پر لعنت کرتا ہے تو وہ کہتا ہے تو ایک ملعون پر لعنت کررہا ہے“ نیز اللہ تعالی شیطان کو رسوا کرے اللہ شیطان کا منہ کالا کرے وغیرہ جیسے کلمات بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، ان سب سے وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ بنی آدم کو معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنی قوت سے نقصان پہنچایا ہے، اور یہ جملے اسے اور زیادہ سرکش بنادیتے ہیں اور ذرا بھی فائدہ بخش نہیں ہوتے۔
چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس پر شیطان کا اثر ہو وہ اللہ کا ذکر کرے اور اسی کا نام لے اور شیطان سے اللہ تعالی کی پناہ چاہے، یہ چیز اس کے لئے فائدہ مند ہے اور شیطان کے غصہ کو مزید بھڑکانے والی ہے۔
نیز نبی کریم ﷺ نے کسی کو یہ بھی کہنے سے منع فرمایا کہ ”میرا نفس خبیث ہوگیا“

(۱) ابوداود: ۴۹۸۲، اس کی سند صحیح ہے۔

آپ نے فرمایا کہ ''میرا نفس سخت ہو گیا'' کہنا چاہیئے (۱)، دونوں جملوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی طبیعت و عادت میں خرابی پیدا ہونا، لیکن خبیث کا لفظ برا اور بھدا ہے اس لئے اس کے استعمال کو ناپسند فرمایا۔

کسی معاملہ یا موقع کے ہاتھ سے نکل جانے پر'' کاش کہ میں یوں کرتا اور یوں نہ کرتا'' کہنے سے بھی آپ نے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے شیطان کا کام آسان ہوتا ہے(۲)، اس کی جگہ اس سے زیادہ نفع بخش کلمہ کی تعلیم دی '' یہ اللہ کا فیصلہ تھا اور اللہ نے جو چاہا کیا''۔

انسان کا یہ کہنا کہ اگر میں نے ایسا ایسا کیا ہوتا تو فلاں موقع نہ کھوتا، یا جس مشکل میں پھنس گیا ہوں نہ پھنستا، یہ ایسی باتیں ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جو چیز گزر چکی ہے پھر دوبارہ نہیں لوٹ سکتی، اور اگر مگر سے لغزش کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

انسان کے اندر یہ بات چھپی ہوتی ہے کہ اگر انسان کی مرضی ومنشأ کے مطابق کام ہو جاتے تو قضاء الٰہی کے خلاف کسی کام کا ہونا ممکن ہو جاتا اور تقدیر کے خلاف کسی کام کا واقع ہونا محال ہے۔ اور اس کی یہ سوچ انتہائی جھوٹی، نادانی اور ناممکنات پر مبنی ہے، اور

(۱) بخاری:۹/۱۷۹، مسلم:۲۲۵۰

(۲) مسلم:۲۶۶۴

اگر اس سے تقدیر کی تکذیب نہ بھی لازم آئے تو کم از کم اگر مگر سے اس کی مخالفت کا ارتکاب ضرور لازم آئے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح کے کلام میں جن اسباب کی تمنا کرتا ہے وہ بھی تو نوشتہ تقدیر ہی میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ صحیح ہے، لیکن اس کا فائدہ ناپسندیدہ مقدر کے واقع ہونے سے پہلے ہوسکتا ہے، اگر وہ واقع ہو جائے تو اسے روکنا یا ہلکا کرنا ممکن نہیں، بلکہ بندے کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اس فعل کا سامنا کرے جس سے اس واقع چیز کو دور کرسکتا ہو یا اس کے اثر کو کم کرسکتا ہو، جس صورت کے واقع ہونے کا امکان نہیں، اس کی تمنا سے کوئی فائدہ نہیں، ایسا کرنا محض عاجزی ہے، اور اللہ تعالی عاجزی پر عتاب کرتا ہے اور ہوشمندی کو پسند کرتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اسباب کو استعمال کرے، انھی سے خیر کا دروازہ کھلتا ہے اور عاجزی شیطان کو دخل اندازی کا موقع دیتی ہے گویا یہ بندہ فائدہ مند اعمال سے عاجز آ گیا اور باطل امیدوں کے انتظار میں بیٹھ گیا ہے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان دونوں سے پناہ مانگی ہے کیونکہ ان دونوں میں برائی کی جڑ ہے اور انھی سے غم ورنج، بخل، قرض، بزدلی، مغلوبیت جیسے حالات وصفات پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ ان سب چیزوں کا مصدر عاجزی اور کسل مندی ہے اور لفظ "اگر" شیطان کی کنجی ہے ایسی تمنائیں کرنے والا شخص سب سے زیادہ لاچار اور

مفلس ہوتا ہے اور ہر گناہ کی جڑ عاجزی ہی ہے، کیونکہ بندہ جب طاعات کے اسباب اور گناہوں سے بچنے کے اسباب سے عاجز ہو جاتا ہے جو اسے گناہوں سے روکیں، تو بہرحال وہ گناہوں میں ڈوب جاتا ہے۔

ایک حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ نے شر کی اصل، اس کی شاخوں، اس کی ابتدا و انتہا اور اس کے منبع و مصدر کا احاطہ کر کے، جو کہ آٹھ خصلتوں پر مشتمل ہے، سے پناہ مانگی ہے، جن میں ہر دو خصلتیں ایک ساتھ ہوتی ہیں اور وہ اس طرح وارد ہوئی ہیں ”أعوذ باللہ من الھم والحزن“ میں تیری پناہ چاہتا ہوں فکر و غم سے۔

یہ دونوں وصف ایک ساتھ ہوتے ہیں کیونکہ دل پر جو ناپسندیدگی طاری ہوتی ہے، اس کا سبب یا تو کوئی گزشتہ امر ہوتا ہے جس سے حزن پیدا ہوتا ہے، یا مستقبل میں متوقع امر جس سے (ھم) یعنی فکر پیدا ہوتی ہے، اور یہ دونوں چیزیں عاجزی کی دلیل ہیں۔

جو چیز گزر چکی ہے وہ غم سے دور نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تلافی، رضا بقضاء حمد باری، صبر جمیل اور ایمان بالقدر سے ہو سکتی ہے اور یہ کہہ کر ہو سکتی ہے کہ ”یہ اللہ کا فیصلہ ہے، اللہ نے جو چاہا کیا“۔

اسی طرح جو چیزیں مستقبل میں ہونے والی ہیں، انہیں الجھن اور فکر کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا، اگر اس کو روکنے کی تدبیر ہو تو پھر عاجز نہیں بننا چاہیئے اور اگر تدبیر نہ ہو تو

گریہ وزاری اور پریشانی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے بلکہ توحید،توکل اور رضائے الٰہی کے سہارے برداشت کرنا چاہیئے۔

فکروغم سے انسان کا عزم کمزور ہوتا ہے، دل میں سستی پیدا ہوتی ہے، یہ دونوں اوصاف بندے کومنفعت بخش کام سے روک دیتے ہیں،ان کی حیثیت انسان کی پشت پر بھاری بوجھ کی سی ہے۔

خدائے عزیز وحکیم کی یہ حکمت ہے کہ اس نے ان چیزوں کواپنی ذات سے اعراض کرنے والے دلوں پر مسلط کیا تا کہ بہت سی نافرمانیوں سے اسے روک سکیں، ایسے دلوں کی اس قید کا سلسلہ توحید کی فضا میں پہنچنے اور اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہونے تک جاری رہتا ہے،اس تک پہنچنے کے لئے اس کی قدرت کا سہارا لینا ضروری ہے،اس کے علاوہ اورکوئی اس سلسلہ میں رہنمائی نہیں کرسکتا۔

بندے کواللہ تعالی جس مقام پر رکھتا ہےتو حمداوراس کی حکمت کے سبب بندے کو اس میں مقیم رکھتا ہے بندے کا کوئی حق اللہ تعالی اس سے روکتا نہیں،اور جوروکتا ہےتو اس لئے روکتا ہے کہ بندہ اس کی محبوب چیزوں کواس کی طرف وسیلہ بنا کر پہنچے، پھراللہ تعالی اسے دے،اسےاپنی طرف لوٹانے کے لئے روکتا ہے،عزت دینے کے لئے اپنے سامنے ذلیل کراتا ہے،اپنامحتاج بنا کرغنی بناتا ہے،اپنے سامنے انکساری کے ذریعہ اسے

قوی بناتا ہے، ہرطرف سے معزول کرکے بہترین ولایت دیتا ہے، اپنی قدرت میں حکمت اورعزت وغلبہ میں رحمت کا مشاہدہ کراتا ہے، اس کا روکنا عطیہ کا پیش خیمہ ہے، اس کی سزا تادیب ہے، دشمنوں کو مسلط کرنا اللہ تعالی کی طرف لے جانے کا راستہ ہے اور اللہ تعالی اپنے انعامات کے محل کو خوب جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کہاں پر اپنے رسول بھیجے، ارشاد باری تعالی ہے کہ:

﴿وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولوا أَهَـؤُلاء مَنَّ اللّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ﴾[الأنعام:٥٣]

اسی طرح ہم نے آزمایا بعض کو بعض کے ذریعہ تاکہ وہ یہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمارے بیچ اللہ نے احسان کیا ہے، کیا اللہ شکرگزاروں کو جانتا نہیں۔

اللہ تعالی تخصیص کے مقام کو خوب جانتا ہے، نہ دینے سے اگر کوئی شخص اللہ کا محتاج بن جائے تو یہ محرومی اس کے حق میں عطیہ ہے اور اگر کوئی شخص عطیہ کے سبب اس سے سے اعراض کرے تو یہ محرومی ہے، اللہ تعالی ہم سے استقامت کا طالب ہے اور یہ کہ ہم اس کا راستہ اپنائیں اور اس نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ یہ مقصد بغیر اس کی مشیت و مدد کے حاصل نہیں ہوسکتا، ارشاد باری ہے کہ:

﴿وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾[التكوير:٢٩]

تمہارا چاہنا اللہ رب العزت کے چاہنے کے بغیر نہیں ہے۔

پس اگر بندے کے ساتھ ایک دوسری روح ہو جس کا اس کی روح سے ویسے ہی تعلق ہو جو اس روح کا اس کے بدن سے ہے اور روح کے ذریعہ ارادہ الٰہی بندے سے چاہے کہ وہ کوئی فعل انجام دے تو بھی بندہ انجام نہیں دے سکتا، ورنہ اس کا محل عطیہ کے قابل نہیں، اور اس کے ساتھ ایسا کوئی پیمانہ نہیں جس میں عطیہ رکھا جائے اور جو بھی بغیر پیمانہ کے آئے گا محروم لوٹے گا، پس اسے صرف خود کو ملامت کرنا چاہیئے، قصہ کوتاہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فکر و غم سے پناہ مانگی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے عاجزی اور کسل مندی سے پناہ مانگی ہے، اور یہ دونوں بھی باہم دیگرے ساتھی ہیں، کیونکہ بندے کی کامیابی اور اس کے عروج و کمال کا حاصل نہ ہونا یا تو عدم قدرت واستطاعت سے ہوتا ہے اور اسی کو عاجزی کہتے ہیں، اور یا قدرت واستطاعت تو ہوگی لیکن بندے کے اندر اس کے حصول کی طلب و تڑپ نہ ہوگی، اسی کو کسل مندی اور سستی کہتے ہیں۔

ان دونوں اوصاف سے ہر طرح کی بھلائی ضائع ہو جاتی ہے اور برائی پیدا ہوتی ہے، اس برائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن سے نفع اندوز نہیں ہوتا، جسے بزدلی کہتے ہیں اور اسی طرح اپنے مال سے نفع اندوز نہیں ہوتا جسے بخل کہتے ہیں، چنانچہ اس کی

وجہ سے دو طرح کی مغلوبیت مسلط ہو جاتی ہے، ایک کسی کے حق کا غلبہ جسے غلبہ دین کہتے ہیں، دوسرے باطل کے باعث غلبہ یعنی انسانوں کا غلبہ اور یہ تمام مفاسد عاجزی اور کسل اور سستی کا نتیجہ ہیں۔

یہی مفہوم نبی کریم ﷺ کی اس صحیح حدیث کا جس میں آپ نے اس شخص کے لئے جس کے خلاف فیصلہ ہوا تو یہ کہا "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عاجزی پر سرزنش کرتا ہے اور تمہیں عقل وشعور سے کام لینا چاہئیے، پھر بھی اگر کوئی امر تم پر غالب آجائے تو "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" کہو(۱)، اس شخص نے تھک ہار کر یہ کلمہ پڑھا تھا اور ذرا بھی عقل وشعور سے کام نہیں لیا تھا، اگر عقل مندی سے کام لیتا تو فیصلہ اس کے موافق ہوتا حالانکہ اگر ان اسباب کو ہوشمندی سے بروئے کار لاتا اور پھر بھی مغلوب ہو جاتا، اس صورت میں یہ جملہ واقعتاً اپنے مقام پر درست ہوتا جیسے حضرت ابرہیم علیہ السلام نے تمام مامور بہ اسباب کو اختیار کیا، کسی کو ترک نہیں کیا اور نہ عجز اختیار کیا، پھر بھی جب دشمن غالب آ گئے اور انہیں آگ میں ڈال دیا تو انہوں نے اس حالت میں "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" کہا چنانچہ یہ کلمہ جب اپنے مقام پر پڑھا تو فوراً اثر ہوا اور اس کا مقتضی ظاہر ہوا۔

---

(۱) ابوداود: ۳۶۲۷

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے احد کے دن یہ کہا گیا کہ:

﴿إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ﴾[آل عمران:١٧٣]

لوگوں نے تمہارے لئے جمع کرلیا ہے۔

وہ لوگ پوری تیاری کر کے دشمن کے مقابلے کے لئے نکلے، پھر مذکورہ کلمہ کہا اور اس نے اپنا پورا اثر دکھایا، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِب﴾[الطلاق:٢،٣]

اور جو اللہ سے ڈرتا رہا، اللہ اس کے لئے نکلنے کی راہ بنادے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

مزید ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُواْ اللّهَ وَعَلَى اللّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴾[المائدة:١١]

اور اللہ سے ڈرو مومنوں کو چاہئیے کہ اللہ پر توکل کریں۔

اسباب دنیا اختیار کئے بغیر توکل کرنا اور اللہ تعالی کو کارساز سمجھنا یہ محض عاجزی ہے، اگرچہ اس پر قدرے توکل چھایا نظر آتا ہے، لیکن توکل عجز ہے لہذا بندے کو چاہئیے کہ

اپنے توکل کو عاجزی اور عاجزی کو توکل نہ بنائے، بلکہ توکل کو بھی اسباب مامورہ سمجھ کر اسے اختیار کرے، جس کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں پا سکتا، اس مقام پر دو گروہ غلطی کے شکار ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ حصول مراد کے لئے تنہا توکل ہی کافی اور مستقل سبب ہے، چنانچہ انہوں نے تمام وسائل اور اسباب کو معطل کر دیا، جس کی خود حکمت الٰہی مقتضی ہے اور مسبب تک پہنچنے کا ذریعہ تھے، چنانچہ یہ گروہ ضعیف توکل اور ترک اسباب کے باعث عجز اور تفریط کا شکار ہو گیا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے صرف اسباب کو اختیار کیا اور توکل سے روگرانی کی۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انتہائی کمال کی جانب بندوں کی رہنمائی کی ہے اور بتایا ہے کہ نفع بخش چیزوں پر دھیان ضروری ہے اور کوشش کرنا بھی لازم ہے، اسی صورت میں حسبی اللہ پڑھنے کا فائدہ ہوگا لیکن کوشش میں کوتاہی کے بعد حسبی اللہ کہنے پر اللہ تعالی بندہ سے ناخوش ہوتا ہے اور اس کے لئے کفایت کا انتظام نہیں فرماتا، وہ تو صرف ان لوگوں کے لئے کافی اور کارساز ہے جو اس سے ڈریں پھر اس پر توکل کریں۔

فصل (۳۷)

آپ ﷺ کا ذکر کرنے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ اللہ تعالی کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے بلکہ آپ کا ہر کلام اللہ کے ذکراور اس کی فکر میں ہوتا تھا، آپ کا امت کو حکم کرنا اور روکنا اللہ تعالی کے اسماء وصفات اوراس کے احکام اور وعدو عید کی تعلیمات سب کی سب ذکر الٰہی کے قبیل سے ہیں، اسی طرح اس کی بے حساب نعمتوں پر حمد وثنا اور تسبیح و تمجید بھی ذکر اللہ تھا، اللہ تعالی سے سوال ودعا اور خوف وخشیت بھی ذکر ہی تھے بلکہ آپ کی خاموشی تک بھی قلبی طور پر ذکر الٰہی کی متضمن تھی، جس طرح ذکر اللہ سے رطب اللسان تھے، اسی طرح قلب وجگر بھی اس سے سرشار تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ ہر آن، ہر حالت میں ذاکر وشاغل رہتے تھےاور ذکر اللہ آپ کی سانس کے ساتھ جاری وساری رہتا، اٹھتے بیٹھتے ، چلتے پھرتے ،سوار ہوتے، اترتے، سفر وحضر ہر وقت اور ہر حال میں آپ اللہ تعالی کو یاد کرتے تھےاوراس کے ذکر وفکر میں رہتے تھے۔

جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

” اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی أَحْیَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَیْهِ النُّشُورُ “(بخاری:۶۳۱۲).

تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو مارنے کے بعد زندہ کیا اور اس کے پاس اٹھ کر جانا ہے۔

پھر اس کے بعد علامہ ابن قیم نے وہ حدیثیں ذکر کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل مواقع کی دعائیں مذکور ہیں، جب نیند سے بیدار ہو، جب نماز شروع کرے، جب گھر سے نکلے، جب مسجد میں داخل ہو، صبح وشام کی دعا اور جب کپڑے تبدیل کرے، جب گھر میں داخل ہو، جب بیت الخلاء میں داخل ہو، وضو کی دعا، اذان کی دعا، رویت ہلال کی دعا، کھانے کی دعا اور چھینکنے کی دعا۔

فصل (۳۸)

آپ ﷺ کا گھر میں داخل ہونے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ اچانک گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ آگاہی کے بعد اندر جاتے تھے اور داخل ہونے کے وقت سلام کرتے تھے اور مسواک فرماتے تھے، احوال دریافت فرماتے اور پوچھتے کیا کچھ ہے۔کبھی پوچھتے دوپہر کا کھانا ہے(۱) اور کبھی خاموش رہتے حتی کہ ماحضر پیش کردیا جاتا۔

آپ سے ثابت ہے کہ ایک شخص نے پیشاب کرنے کی حالت میں سلام کیا تو آپ نے جواب نہیں دیا(۲) اور پھر فرمایا کہ اللہ تعالی ایسی حالت میں بات چیت کو پسند نہیں کرتا ہے۔آپ پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ رخ یا پشت نہیں کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے آپ ﷺ نے منع بھی فرمایا ہے۔(۳)

---

(۱) مسلم:۱۱۵۴
(۲) مسلم:۳۷۰
(۳) بخاری:۱۴۴

فصل (۳۹)

آپ ﷺ کی اذان میں سنت طیبہ

نبی کریم ﷺ سے اذان میں ترجیع اور بغیر ترجیع ہر طرح سے ثابت ہے۔اور اقامت ایک مرتبہ اور دو دو مرتبہ مشروع کیا ہے لیکن "قَدْقَامَتِ الصَّلَاۃُ " کا کلمہ آپ سے دو ہی مرتبہ کہنا ثابت ہے۔ایک دفعہ کہنا قطعاً ثابت نہیں۔اس طرح اذان کے شروع میں اللہ اکبر چار بار کہنا ثابت ہے،دو بار نہیں۔

اذان کے وقت اور اس کے بعد پانچ قسم کے اذکار کی آپ نے امت کو تعلیم دی ہے:

۱۔ایک یہ کہ سننے والا موذن کے کلمات والفاظ دہراتا جائے،سوائے " حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ " اور "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ " کے اس وقت "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" (۱) کہنا چاہیئے اور نہ دونوں میں جمع اور نہ صرف "حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ وَحَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

یہی حکمت کا تقاضا ہے،کیونکہ اذان کے کلمات ذکر ہیں اور حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ وحَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ " نماز کی دعوت ہے۔اس لئے سننے والے کے لئے آپ ﷺ

(۱) بخاری:۱۴۴،مسلم:۲۶۴

نے یہ مسنون قرار دیا ہے کہ اس دعوت کو سن کر وہ اعانت کے کلمہ سے استعانت چاہے۔

۲۔دوسرے یہ کہ " رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيًّا "
کہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے یہ دعا پڑھی اس کے گناہ بخش دیئے
گئے۔(۱)

۳۔تیسرے یہ کہ موذن کی اذان کا جواب دینے کے بعد نبی کریم ﷺ پر درود
وسلام بھیجے اور کامل ترین وہ درود ہے جو خود آپ ﷺ نے بنفس نفیس امت کو سکھلایا
ہے۔

۴۔چوتھے اذان کے بعد یہ دعا پڑھے:

" اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ
وَالْفَضِيلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُودًا "(۲)

اے اللہ! مکمل پکار اور ہمیشہ قائم رہنے والی نماز کے پروردگار! تو محمد ﷺ کو وسیلہ
اور بزرگی دے اور آپ کو مقام محمود پر پہنچا۔

۵۔پانچویں یہ کہ اس کے بعد اپنے لئے دعا کرے اور اللہ تعالی کے فضل وکرم کو

(۱) مسلم ۳۸۶
(۲) بخاری ۶۱۴

طلب کرے۔

سنن میں آپ سے مروی ہے کہ اذان اور اقامت کے مابین دعا رد نہیں ہوتی ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ ہم اس وقت میں کیا دعا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ یہ حدیث صحیح ہے۔(۱)

آپ ذی الحجہ کے عشرہ میں بکثرت دعا کرتے تھے اور تکبیر و تحمید اور تہلیل کی تاکید فرماتے تھے۔

آپ یوم عرفہ کی نماز فجر سے لے کر آخری یوم تشریق کی عصر تک ان الفاظ کے ساتھ تکبیر کہتے تھے:"اللّٰہُ أَکبَرُ اللّٰہُ أَکبَرُ لَاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ و اللّٰہُ أَکبَرُاللّٰہُ أَکبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ "(۲)

اس حدیث کی اسناد اگرچہ صحیح نہیں لیکن عمل اس پر ہوتا رہا ہے۔اس میں اللہ اکبر مکرر ہے۔ جابر اور ابن عباس کی روایت میں تین مرتبہ اللہ اکبر کہنا صرف ان کا اپنا عمل ہے،اور دونوں صورتیں مستحسن ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر یوں کہے " اللّٰہُ أَکبَرُ کَبِیرًا وَالْحَمْدُلِلّٰہِ کَثِیرًا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ بُکرَۃً وَأَصِیلًا" تو یہ بھی بہتر ہے۔

(۱)اس کا شروع کا حصہ صحیح ہے، دیکھئے ترمذی:۲۱۲،ابوداود:۵۲۱

(۲) یہ روایت بعض صحابہ کرام تک موقوف ہے۔مستدرک للحاکم:۱/ ۲۹۹

فصل (۴۰)

آپ ﷺ کا کھانا کھانے کا طریقہ

جب آپ ﷺ کھانا شروع کرتے تو ''بسم اللہ'' کہتے اور لوگوں کو اس کا حکم دیتے۔ اور آپ فرمایا کرتے کہ جب تم میں سے کوئی کھانا کھاتے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو یہ کہے "بِسْمِ اللّٰهِ فِي أَوَّلِهِ وَآخِرِهِ "(۱) اور یہ صحیح ہے کہ کھانا کھاتے وقت بسم اللہ کہنا واجب ہے اور جو یہ کہنا چھوڑ دیتا ہے تو اس کے کھانے پینے میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔(۲)

بسم اللہ کہنے کے متعلق احادیث صحیح اور صریح وارد ہوئی ہیں۔ نہ اس کے مخالف کوئی حدیث ہے نہ اجماع امت۔

اگر اجتماعی کھانے کے وقت ایک آدمی بسم اللہ پڑھ لے تو کیا باقی لوگوں سے یہ وجوب ساقط ہو جائے گا اور شیطان کی شرکت ختم ہو جائے گی تو امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کا پڑھ لینا سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بسم اللہ پڑھے گا صرف اسی کے کھانے سے شیطان کی شرکت ختم ہو گی۔

---

(۱) ابوداود: ۳۷۶۷، ترمذی: ۱۸۵۹، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) بخاری: ۵۳۷۶، مسلم: ۲۰۲۲

امام ترمذی نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو صحیح بتا کر نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ چھ آدمیوں کے ساتھ کھانا تناول فرمارہے تھے اتنے میں ایک اعرابی آیا اور سارا کھانا دو لقمے میں صاف کردیا اس پر آپ نے فرمایا ''اگر یہ بسم اللہ پڑھ لیتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا''۔(۱)

یہ یقینی بات تھی کہ آپ اور صحابہ کرام بسم اللہ پڑھ چکے تھے، اور حضرت حذیفہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک کھانے میں شریک تھے کہ اچانک ایک لڑکی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنے لگی، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اس کے بعد ایک اعرابی آیا، آپ نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ شیطان اس کھانے کو حلال سمجھ لیتا ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اور وہ اس لڑکی کو اس لئے ساتھ لایا تھا تا کہ اس کے ذریعہ کھانا اپنے لئے حلال کرے۔ تو جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو پھر اسی مقصد سے اعرابی کو لے آیا لیکن میں نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ بخدا اس وقت شیطان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے، پھر بسم اللہ پڑھ کر آپ نے کھانا تناول فرمایا'' (۲)۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب کا پڑھنا ضروری ہے۔

(۱) ابوداود: ۳۷۶۷، ترمذی: ۱۸۵۹، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) مسلم: ۲۰۱۷

لیکن اس حدیث کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس وقت کھانا شروع نہیں فرمایا تھا اور اس لڑکی نے پہلے شروع کردیا تھا۔اس لئے آپ نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

رہا سلام کرنے اور چھینکنے والے کے جواب کا مسئلہ تو محل نظر ہے اور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا''جب تم میں سے کوئی چھینکے اور الحمدللہ کہے تو ہر سننے والے مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا جواب دے''۔(۱)

اگر دونوں میں حکم تسلیم کرلیا جائے تو بھی ان کے اور کھانے کے مسئلہ کے مابین فرق ظاہر ہے۔

اس لئے کہ شیطان کو کھانے والے کی مشارکت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بسم اللہ نہ پڑھے،اور دوسرا جب بسم اللہ پڑھے گا تو صرف اس کے حق میں مشارکت ختم ہوگی،لیکن نہ پڑھنے والے کے حق میں باقی رہے گی۔

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب برتن میں پانی پیتے تو تین سانس میں پانی پیتے اور ہر سانس پر اللہ کی تعریف کرتے اور آخر میں شکر ادا کرتے۔(۲)

(۱) بخاری:۳۲۸۹،مسلم:۲۹۹۴

(۲) ابن السنی:۱/۴۷،یہ روایت منکر ہے مگر اس کا ابتدائی حصہ صحیح میں مذکور ہے دیکھئے:بخاری:۵۶۳۱،مسلم:۲۰۲۸

آپ ﷺ نے کبھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا، اگر آپ کو ناپسند ہوتا تو چھوڑ دیتے اور خاموش ہو جاتے اور کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔(۱) کبھی کھانے کی تعریف بھی فرماتے تھے۔ جیسے ایک حدیث میں فرمایا ''بہترین سالن سرکہ ہے''(۲) یہ آپ نے اس شخص سے فرمایا تھا جس نے کہا تھا، ہمارے پاس پیش خدمت کے لئے صرف سرکہ ہی ہے۔ یہ ارشاد اس کی دلجوئی کے لئے تھا، اس سے مقصود سارے کھانوں پر افضلیت نہ تھی۔

جب آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا جاتا اور آپ روزے سے ہوتے تو فرماتے کہ ''میرا روزہ ہے''(۳) اور ارشاد فرمایا کہ اگر روزے دار کو کھانا پیش کیا جائے تو کھانا پیش کرنے والے کو دعائیں دو اور اگر روزے سے آپ نہ ہوتے تو تناول فرماتے۔(۴)

جب آپ ﷺ کو کھانے پر مدعو کیا جاتا اور کوئی دوسرا بھی آپ کے ہمراہ ہو جاتا تو آپ میزبان کو مطلع کرتے اور فرماتے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے

---

(۱) بخاری: ۵۳۹۱، مسلم: ۱۹۴۵

(۲) مسلم: ۲۰۵۲

(۳) بخاری: ۱۹۸۲

(۴) مسلم: ۱۴۳۱

اجازت دو ورنہ واپس لوٹا دیں۔(۱) آپ ﷺ کھانا کھاتے وقت باتیں بھی کر لیتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ آپ نے اپنے پروردہ لڑکے سے فرمایا کہ ''بسم اللہ'' کہو اور اپنے سامنے سے کھاؤ''۔(۲)

بسا اوقات مہمانوں کو مزید کھانے کی پیشکش اور اصرار فرماتے، جس طرح کی مہمان نواز اہل کرم کیا کرتے ہیں۔ جس طرح دودھ پینے کا واقعہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا کہ آپ ان سے (بار بار پیو اور پیو) فرماتے رہے۔(۳)

جب آپ کسی کے یہاں کھانا نوش فرماتے تو ان کے لئے دعائیں دیئے بغیر واپس نہ ہوتے، جیسا کہ امام ابوداؤد نے آپ سے ابوالہیثم کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ لوگ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ '' أثيبوا أخاكم'' اپنے بھائی کو ثواب پہنچاؤ۔'' لوگوں نے عرض کیا کس طرح ثواب پہنچائیں تو آپ نے فرمایا کہ آدمی جب کسی کے گھر بلایا جائے اور کھانے پینے سے فارغ ہو جائے تو اس کے لئے دعا کرے اور یہی ثواب پہنچانا ہے،،۔(۴)

---

(۱) بخاری:۲۰۸۱، مسلم:۲۰۳۶

(۲) بخاری:۵۳۷۶، مسلم:۲۰۲۲

(۳) بخاری:۶۴۵۲

(۴) ابوداود:۳۸۵۴، اور اس کی سند حسن ہے۔

آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ ایک دفعہ آپ رات کے وقت گھر میں تشریف لائے اور کھانا تلاش کیا لیکن کچھ نہیں ملا۔اس وقت آپ نے یہ دعا فرمائی:

”اَللّٰهُمَّ أَطْعِمْ مَنْ أَطْعَمَنِي وَاسْقِ مَنْ سَقَانِي“(۱)

اے اللہ جو مجھے کھلائے تو اسے کھلا اور جو پلائے تو اسے پلا۔

آپ ﷺ اس شخص کے لئے دعا فرماتے تھے جو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلاتے تھے اور ان کی تعریف فرماتے تھے۔آپ ﷺ کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرمانے میں اجتناب نہیں فرماتے تھے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، آزاد ہو یا غلام۔

آپ دائیں ہاتھ سے کھانے کا حکم دیتے تھے اور بائیں ہاتھ سے کھانے کو منع فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ”شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور اسی سے پیتا ہے“۔(۲)اس حدیث سے بائیں ہاتھ سے کھانے کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور یہی صحیح ہے۔

کچھ لوگوں نے آپ سے عدم آسودگی کی شکایت کی تو آپ نے ان کو بتایا کہ وہ ساتھ مل کر کھائیں اور الگ الگ نہ کھائیں اور بسم اللہ پڑھ لیا کریں۔آپ ﷺ سے

(۱)مسلم:۲۰۵۵

مسلم:۲۰۲۰

یہ بھی مروی ہے کہ ''اپنے کھانے کو اللہ کے ذکر اور نماز کے ساتھ ہضم کیا کرو اور کھا کر فورا نہ سویا کرو۔ اس سے تمہارا دل سخت ہو جائے گا''(۱) یہ حدیث مفہوم کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تجربہ سے بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

(۱) ابن حبان فی الضعفاء ۱/ ۱۹۹، اس روایف کو ابن جوزی نے موضوع کہا ہے، دیکھئے: الموضوعات ۳/ ۷۰

فصل (۴۱)

آپ ﷺ کے سلام اور اس کے جواب کا طریقہ

صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’بہترین اسلام یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور جاننے والے اور نہ جاننے والے سب کو سلام کرو‘‘(۱) نیز صحیحین میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان سے فرمایا کہ ان فرشتوں کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کرو اور سنو کہ وہ تمہیں کس طرح سلام کا جواب دیتے ہیں کیونکہ وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام و جواب ہوگا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے جا کر (السلام علیکم) کہا۔ فرشتوں جواب میں (السلام علیکم ورحمۃ اللہ) کہا اور ان کے جواب میں ورحمۃ اللہ کا اضافہ تھا۔

نیز آپ نے سلام کو عام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب وہ سلام کو عام کریں تو ان کی آپس میں محبت پیدا ہو جائے گی اور لوگ بغیر ایمان کے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور ایمان بغیر محبت کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ (۲)

---

(۱) بخاری:۳۳۲۶ ومسلم:۲۸۴۱

(۲) مسلم:۵۴

(۳) بخاری فی کتاب ۲، باب ۲۰ میں عمار رضی اللہ عنہ تک موقوف معلق روایت ذکر کیا ہے۔

صحیح بخاری میں عمار کا یہ قول مذکور ہے کہ تین باتیں جس نے جمع کر لیں اس نے ایمان کو حاصل کر لیا۔ اول: اپنے سے انصاف کرنا، دوم: سلام کرنا، سوم: تنگی کے وقت خرچ کرنا۔

ان کلمات میں چھوٹی بڑی تمام بھلائیاں سمٹ گئی ہیں۔ اس لئے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ اور بندوں کے تمام حقوق کو ادا کرے اور لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے جسے اپنے لئے پسند کرے۔ اس میں اپنی ذات کے ساتھ انصاف کی بات بھی داخل ہے۔ اس لئے اپنے بارے میں انسان کو کسی ایسے وصف کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے جو موجود نہ ہو اور نہ نفس کو اللہ تعالی کی نافرمانی سے پلید کرنا چاہیئے۔

حاصل یہ ہے کہ اس انصاف سے اللہ تعالی اور اپنی معرفت حاصل ہوگی۔ بندہ کو نفس کے ذریعہ اس کے خالق سے مزاحمت نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اپنی مراد کو اللہ تعالی اور نفس کی مراد کے مابین تقسیم نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ ظالمانہ تقسیم ہے۔ ایسی تقسیم مشرکین کرتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿هَـٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَـٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَآئِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾[الأنعام:١٣٦]

یہ ان کے خیال میں اللہ کا اور یہ ہمارے شرکاء کا ہے اور جو شرکاء کا ہے وہ اللہ تک نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہے وہ شرکاء تک پہنچتا ہے۔ان کا فیصلہ کس قدر برا ہے۔

بندے کو غور کرنا چاہئیے کہ وہ ایسی تقسیم کرنے والوں میں داخل نہ ہو جائے جو اپنی ذات اپنے شرکاء اور اللہ تعالی کے درمیان تقسیم کرتے ہیں ، ورنہ وہ غیر شعوری حالت میں شک وشبہ میں پڑ جائے گا، کیونکہ پیدائشی طور پر وہ ناداں اور ظالم ہے اور جو خود ظالم وجاہل ہو اس سے انصاف کا مطالبہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔مخلوق کے معاملہ میں وہ شخص کیونکر انصاف کرسکتا ہے جو خالق کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابن آدم !تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہماری نعمتیں تجھ تک پہنچ رہی ہیں اور تیری برائیاں ہم تک آرہی ہیں۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ ابن آدم !تم نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ہم نے تم کو پیدا کیا تم ہمارے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتے ہو۔ہم تم کو رزق دیتے ہیں۔تم دوسرے کا شکر ادا کرتے ہو۔(۱) پھر کیسے اپنے ساتھ بے انصافی کرنے والا دوسروں کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے بلکہ اس نے اس کے ساتھ بدترین ظلم کیا حالانکہ خام خیالی میں سمجھ رہا ہے کہ وہ اکرام کررہا ہے۔

---

(۱)الدیلمی فی الفردوس:۸۰۴۸،اس کے بعض راوی مجہول ہیں۔

سلام کرنے کا مطلب تواضع وانکساری ہے۔ایسا آدمی کسی کے سامنے تکبر نہیں کرتا۔محتاجی میں خرچ اسی وقت ہوگا جب اللہ تعالی پر پورا بھروسہ اوریقین کامل ، توکل،رحم وکرم، جودوسخا کی صفات سے متصف ہوگا اور بندہ شیطان کی تکذیب کرے جوفقروفاقہ سے ڈراتا ہےاور برائیوں کا حکم دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ بچوں کے پاس سے گزرتے تو سلام کرتے تھے(۱)،اورترمذی نے روایت کیا ہے کہ آپ ایک دن عورتوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا۔

ابوداؤد نے اسماء بنت یزید سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ ایک دن ہم عورتوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو سلام کیا۔(۲)ترمذی کی بھی یہی روایت ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایک ہی ہےاورآپ نے ان کو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا تھا۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام جمعہ کے دن نماز سے لوٹتے ہوئے ایک بڑھیا کے پاس سے گزرتے تھےتو اسے سلام کرتے تھےاوروہ انہیں کچھ کھانا وغیرہ

---

(۱)بخاری:۶۲۴۷،مسلم:۲۱۶۷

(۲)ابوداود:۵۲۰۴،ترمذی:۲۶۹۸،یہ روایت حسن ہے۔

پیش کرتی تھیں۔(۱)

عورتوں کو سلام کرنے کے سلسلہ میں صحیح قول یہی ہے کہ بوڑھی اور محرم عورتوں کو سلام کیا جائے۔ان کے علاوہ کسی کو نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ”چھوٹا بڑے کو اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور سوار پیدل چلنے والے کو اور تھوڑے افراد زیادہ کو سلام کریں“۔ ترمذی میں ہے کہ ”چلنے والا کھڑے کو سلام کرے“ (۲) اور مسند بزار میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ ”دو چلنے والوں میں سے جو پہل کرے وہ افضل ہے“ (۳) سنن ابوداؤد میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ ”جو سلام میں ابتدا کرے وہ اللہ کے یہاں تمام لوگوں سے بہتر ہے“۔(۴)

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ کسی جماعت کے پاس آتے تو سلام کرتے اور جب واپس ہوتے تو بھی سلام کرتے تھے، نیز آپ نے فرمایا کہ ”جب تم میں سے کوئی بیٹھے تو سلام کرے اور جب کھڑا ہو تو سلام کرے اور پہلا دوسرے سے زیادہ حقدار

---

(۱) بخاری:۹۳۸

(۲) بخاری:۶۲۳۱ و مسلم:۲۱۶۰

(۳) بخاری فی الأدب المفرد:۱۴۳، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۴) ابوداود:۵۱۹۷، یہ حدیث صحیح ہے۔

نہیں''۔(۱)

ابوداؤد نے آپ ﷺ سے روایت کیا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے ساتھی سے ملے تو سلام کرے اگر دونوں کے بیچ میں درخت یا دیوار حائل ہو جائے پھر سامنا ہو تو اس وقت پھر سلام کرے۔(۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام چلتے رہتے تھے تو راہ میں اگر کوئی پتھر یا درخت آجاتا تو دائیں بائیں ہٹ جاتے اور جب دوبارہ ملتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔(۳)

نیز نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ ہے کہ مسجد میں آنے والا سب سے پہلے تحیۃ المسجد دو رکعت نماز پڑھے پھر آئے اور لوگوں کو سلام کرے۔اس طرح تحیۃ المسجد، تحیۃ القوم سے مقدم ہو جائے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالی کا حق ہے اور سلام بندوں کا، اور ایسے حالات میں اللہ تعالی کا حق مقدم کیا جائے گا۔بخلاف مالی حقوق کے تو ان میں نزاع پایا جاتا ہے اور دونوں کے درمیان فرق آدمی کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتا ہے، اور یہ بھی

---

(۱)ابوداود:۵۲۰۸وترمذی:۲۷۰۷،یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲)ابوداود:۵۲۰۰،اس کی سند صحیح ہے۔

(۳)یہ انس رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔دیکھئے ابن السنی:۲۴۵

دیکھا جائے کہ مال میں دونوں قسم کے حقوق کو ادا کرنے کی وسعت ہے یا نہیں۔

اس طرح مسجد میں آنے والے کے لئے تین باتیں ترتیب وار ضروری ہیں جب کہ مسجد میں کوئی جماعت بیٹھی ہوئی ہو:

اول یہ کہ داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھے:

" بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ "

دوم یہ کہ تحیۃ المسجد کی دو رکعت نماز ادا کرے۔ سوم یہ کہ اس کے بعد لوگوں کو سلام کرے۔

جب آپ ﷺ رات کو اپنے گھر میں داخل ہوتے تو اس طرح سلام کرتے کہ جاگنے والا سن لے اور جو سویا ہو وہ نہ جاگے۔ (رواہ مسلم: ۲۰۵۵)، امام ترمذی نے یہ روایت ذکر کی ہے کہ "کلام سے قبل ہی سلام کیا جائے گا"۔ (۱)

امام احمد نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "سوال سے قبل ہی سلام ہونا چاہیئے"۔ اس لئے جو سلام سے پہلے سوال کرے اس کا جواب نہ دو۔ (۲) آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ "اس شخص کو اجازت نہ دو جو سلام سے ابتدا نہ کرے"۔ (۳)

(۱) ترمذی: ۲۷۰۰، اس کی سند میں ضعف ہے۔

(۲) ابن السنی: ۲۱۴ میں سند حسن سے مروی ہے۔

(۳) اس روایت میں ایک مجہول راوی پایا جاتا ہے۔

جب آپ کسی کے دروازے پر تشریف لے جاتے تو دروازے کے بالمقابل کھڑے نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہتے تھے۔(۱) جو آپ کے سامنے آتا آپ خود اس کو سلام کرتے۔ آپ دوسروں کوسلام پہنچاتے بھی تھے جیسا کہ اللہ تعالی کی طرف سے خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سلام پہنچایا تھا (۲) اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ جبریل تمہیں سلام کہتے ہیں۔

آپ کی سنت مبارکہ یہ تھے آپ سلام کو (وبرکاتہ) پر ختم کرتے تھے۔ بخاری میں انس سے مروی ہے کہ آپ تین بار سلام کرتے تھے (۳)، لیکن ایسا شاید اس وقت ہوتا تھا جب لوگ زیادہ ہوتے تھے اور ایک بار میں سب کو سلام نہیں پہنچ پاتا تھا۔ آپ کو جب یہ خیال ہوتا کہ پہلی اور دوسری بار سن نہیں سکے ہیں تو سہ بارہ سلام کرتے۔ آپ کی سنت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلام کا تکرار عارضی چیز تھی۔

آپ ﷺ جس سے ملتے تو خود سلام کرتے اور جب کوئی آپ کو سلام کرتا تو اس کا ویسا ہی یا اس سے بہتر جواب فوراً دیتے۔ ہاں اگر کوئی عذر ہوتا جیسے قضاء حاجت وغیرہ

---

(۱) ابوداود: ۵۱۸۶، اور اس کی سند حسن ہے۔

(۲) بخاری: ۳۸۱۵، مسلم: ۳۴۳۲

(۳) بخاری: ۹۴

تو جواب میں تاخیر کرتے۔ آپ سلام کا جواب ہاتھ، سر یا انگلی کے اشارے سے نہ دیتے سوائے نماز کے، کیونکہ اگر نماز کی حالت میں سلام کیا جاتا تھا تو آپ اشارہ سے جواب دیتے تھے، اور یہ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

آپ ﷺ سلام کی ابتدا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کے کلمات سے کہتے تھے اور ابتدا میں سلام کرنے والے کو''علیک السلام'' کہنے کو ناپسند کرتے تھے۔ سلام کرنے والے کا جواب آپ ﷺ ''وعلیکم السلام'' سے دیتے تھے۔ جواب سے اگر (واؤ) کو حذف کردیا جائے تو ایک جماعت کا خیال ہے کہ جواب کا فرض ادا نہ ہوگا کیونکہ یہ سنت کی مخالفت ہے، نیز اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے جواب دیا ہے یا سلام کیا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کا جواب صحیح ہوگا۔ امام شافعی نے اس کی وضاحت کی ہے۔ اور اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ﴿فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ﴾ (۱) لیکن اس جگہ جواب میں (واؤ) اس لئے حذف کیا گیا کہ ابتدا میں بھی جملہ میں کچھ حذف ہے۔ امام شافعی کے خیال کی تائید آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے جواب سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں (واؤ) نہیں تھا۔

---

(۱) سورۃ الذاریات: ۲۵

فصل (۴۲)

آپ ﷺ کا اہل کتاب کوسلام کرنے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: اہل کتاب سے سلام کی ابتدا نہ کرو، جب تم راستہ میں ان سے ملو تو انہیں تنگ راہ کی طرف مجبور کردو (۱) لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ حکم ایک خاص موقع کا ہے، جب آپ بنی قریظہ کی طرف گئے تو فرمایا انہیں سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ اب سوال ہے کہ یہ حکم تمام غیر مسلم ذمی لوگوں کے لئے ہوگا یا بنوقریظہ جیسے حالات جن کے ساتھ ہوں ان کے لئے مخصوص ہے، یہ محل نظر ہے۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں کوسلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ اگر انہیں کسی راستہ میں ملو تو انہیں تنگ راہ کی طرف مجبور کردو۔ (۲)

بظاہر یہ حکم عام ہے لیکن علما کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور اکثریت اس طرف ہے کہ ان کوسلام کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ سلام کا جواب دینے کے متعلق صحیح قول یہ ہے کہ جواب دینا واجب ہے، اور ان میں اور اہل بدعت میں یہ فرق ہے کہ ہمیں اہل

---

(۱) مسلم: ۲۱۶۷

(۲) مسلم: ۲۱۶۷

بدعت سے قطع تعلق کا حکم ہے (تا کہ اس سے انہیں تعزیر وزجر کی جائے)۔

آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ ایک مجلس سے آپ کا گزر ہوا جس میں مسلمان اور مشرکین سب بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے سلام کیا۔(۱) اسی طرح ہرقل وغیرہ کے نام خط لکھا تو ''سلام علی من اتبع الہدی'' لکھا۔(۲)

آپ ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ گزرنے والی جماعت میں سے ایک شخص اگر سلام کرے تو کافی ہوگا۔ اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص جواب دیدے تو یہ بھی کافی ہوگا۔(۳) اس کی طرف وہ لوگ گئے ہیں جو جواب کو فرض کفایہ کہتے ہیں، لیکن اگر یہ حدیث ثابت ہوتو مذکورہ قول بہت خوب ہے مگر اس کی سند میں سعید بن خالد ہیں جن کے بارے میں ابوزرعہ کا قول ہے کہ وہ ضعیف راوی ہیں اور یہی ابوحاتم نے بھی کہا ہے۔

آپ ﷺ کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ جب کوئی آپ کو کسی کا سلام پہنچاتا تو اس کو اور پہنچانے والے دونوں کو آپ جواب دیتے تھے۔ اگر کسی سے خلاف شرع کام ہو جاتا تو اس کے توبہ کرنے تک آپ ﷺ نہ اس کو سلام کرتے اور نہ اس کے سلام کا جواب دیتے تھے۔

---

(۱) بخاری: ۲۹۸۸ و مسلم: ۱۷۹۸
(۲) بخاری: ۷ و مسلم: ۱۷۷۳
(۳) ابوداود: ۵۲۱۰، یہ روایت ضعیف ہے۔

فصل (۴۳)

آپ ﷺ کا اجازت طلبی کا طریقہ

صحیح روایت میں آپ ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ''اجازت تین بار طلب کی جائے اگر اجازت مل جائے تو بہتر ہے ورنہ واپس چلے جاؤ'' (۱) اور یہ بھی فرمایا کہ ''اجازت طلبی محض دیکھنے سے بچنے کے لئے ہے'' (۲) نیز آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کی آنکھ پھوڑنے کا ارادہ فرمایا جو حجرہ کے دروازے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر فرمایا کہ: ''اجازت طلبی اس لئے ہے کہ آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے''۔ (۳)

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ اجازت چاہنے سے قبل سلام کرتے تھے اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے اجازت طلب کرتے ہوئے عرض کیا، کیا میں اندر آ جاؤں، تو آپ نے ایک دوسرے شخص کو بھیجا کہ جاؤ اسے اجازت طلب کرنے کا طریقہ بتاؤ اور کہو کہ پہلے السلام علیکم کہے پھر اندر آنے کے لئے پوچھے۔

---

(۱) بخاری: ۲۰۶۲

(۲) بخاری: ۵۹۲۴ و مسلم: ۲۱۵۶

(۳) بخاری: ۵۹۲۴ و مسلم: ۲۱۵۶

آپ کو یہ فرماتے ہوئے اس شخص نے سن لیا تو اس نے اسی طرح سے کیا۔ چنانچہ آپ نے اجازت مرحمت فرمادی اور وہ اندر داخل ہوا۔(۱)

اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پہلے اجازت طلب کی جائے پھر سلام کیا جائے، اور ان کی بھی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر صاحب مکان پر داخلہ سے پہلے نظر پڑ جائے تو پہلے سلام کرے گا ورنہ اجازت طلب کرے گا۔

آپ ﷺ کی سنت طیبہ یہ بھی تھی کہ تین بار اجازت طلب کرنے والے سے دریافت کیا جائے کہ تم کون ہو تو جواب میں فلاں بن فلاں یا اپنی کنیت بتائے اور یہ نہ کہے کہ میں ہوں۔

ابوداؤد نے آپ سے روایت کیا ہے کہ ’’آدمی اگر کسی کے پاس اپنا قاصد بھیجے تو یہ اس کی اجازت کی دلیل ہے‘‘(۲) س حدیث کو امام بخاری نے تعلیقا ذکر کیا ہے پھر ایک حدیث ذکر کی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اجازت طلب کرنے کا اعتبار دعوت دینے کے بعد بھی ہوگا۔ اس حدیث میں اصحاب صفہ سے متعلق ایک صحابی کا بیان کے میں نے

(۱) ابوداود: ۵۱۷۷، اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) ابوداود: ۵۱۸۹

انہیں دعوت دی، وہ لوگ آئے اور اجازت طلب کی (۱) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مدعو فوراً آجائے تو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں اگر دعوت کے کچھ دیر بعد آئے تو پھر اجازت طلب کرنی ہوگی۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ داعی کے پاس مدعو کے آنے سے پہلے کچھ ایسے لوگ ہوں جن کو وہ دعوت دے چکا ہو تو اب مدعو کو اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوگی ورنہ وہ اجازت طلب کرے گا۔

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تخلیہ کے لئے کسی کے گھر جاتے تو کسی کو دروازے پر مقرر کر دیتے پھر کوئی بلا اجازت آپ کے پاس نہیں جا پاتا تھا۔ (۲)

رہی وہ اجازت طلبی جو اللہ تعالیٰ نے غلاموں کو اور ان بچوں کو حکم دیا ہے جو ابھی رشد وبلوغ کو نہیں پہنچے، اس کے تین مواقع ہیں۔ فجر سے قبل، دوپہر کے وقت، اور سوتے وقت۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کا حکم فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے اس پر عمل ترک کر رکھا ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے لیکن انہوں نے اس کی کوئی دلیل نہیں پیش کی۔

---

(۱) بخاری: ۵۳۷۵

(۲) ابوداود: ۵۱۸۸، اس کی سند حسن ہے۔

ایک جماعت کا قول ہے کہ مستحب ہے، لیکن امر کے صیغہ سے ظاہری طور پر وجوب کو نہ ماننے کی ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک جماعت کا مسلک ہے کہ یہ حکم صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ بات بالکل غلط ہے۔

ایک اور جماعت کا خیال ہے کہ یہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ ان کا استدلال ''الذین'' کے کلمہ سے ہے جو مردوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن کلام کا سیاق وسباق اس کے منافی ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ حکم ضرورت کی وجہ سے تھا جب ضرورت ختم ہوگئی تو حکم بھی باقی نہ رہا۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے سنن میں ذکر کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آپ کا اس آیت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہمیں اس کا حکم ہوا ہے لیکن اس پر کوئی عمل نہیں کرتا تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالی مومنوں پر شفیق ورحیم ہے۔ اسے پردہ پسند ہے۔ پہلے لوگوں کے گھروں میں پردے کا انتظام نہ تھا۔ اکثر خادم لڑکے، زیر پرورش، یتیم، گھر میں ایسی حالت میں داخل ہوجاتے جب مرد اپنی بیوی کے ساتھ ہوتا، لہذا اللہ تعالی نے مذکورہ اوقات میں اجازت لینے کا حکم دیا۔ پھر لوگوں میں پردے کا انتظام ہوگیا تو کسی کو اس آیت پر عمل کرتے

ہوئے نہیں دیکھا۔(۱)

بعض لوگوں نے اس حدیث کی صحت کا انکار کیا ہے اور عکرمہ کو مطعون کیا ہے لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا اور اسی طرح راوی عمرو بن ابی عمرو کو بھی مطعون کیا لیکن اس طعن وتشنیع سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اصحاب صحیحین نے ان کی روایتوں کو لیا ہے، اس لئے مذکورہ طعن بے جا اور بے سود ہے۔

ایک اور جماعت کا خیال ہے کہ مذکورہ آیت محکم ہے اور اس کا کوئی معارض نہیں لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آیت کا حکم ایک سبب سے متعلق ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ موجود ہے یعنی اگر اجازت کے قائم مقام کوئی چیز موجود ہو مثلا دروازہ کھول دیا جائے یا پردہ اٹھا دیا جائے یا لوگ آ رہے ہوں تو ایسی صورت میں اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر اجازت طلب کرنا ضروری ہے اور آیت کا حکم برقرار ہے۔

---

(۱) ابوداود: ۵۱۹۲، اس کی سند حسن ہے۔

فصل (۴۴)

آپ ﷺ کا چھینکنے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالی چھینک کو پسند کرتا ہے اور جمائی کو ناپسند کرتا ہے۔لہذا جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے اور وہ (الحمد للہ) کہے تو سننے والے مسلمان پر حق ہے کہ جواب میں (یرحمک اللہ) کہے۔رہی جمائی تو یہ شیطان کی طرف سے ہے،لہذا جب تم میں سے کسی کو جمائی آئے تو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے اسے روکے کیونکہ جب تم میں سے کوئی جمائی لیتا ہے تو شیطان ہنستا ہے۔(۱)

امام بخاری نے مزید روایت کیا ہے کہ''جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہیئے کہ وہ الحمد للہ کہے اور اس کے بھائی اور ساتھی کو چاہیئے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہے اور جب یرحمک اللہ کہہ چکے تو پہلے شخص کو چاہیئے کہ ''یَهْدِیْكُمُ اللّٰهُ وَیُصْلِحُ بَالَكُمْ''(۲) کہے یعنی اللہ تعالی تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کر دے۔

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا''جب تم میں سے کوئی چھینکے اور

(۱) بخاری:۳۲۸۹و مسلم:۲۹۹۴

(۲) بخاری:۶۲۲۴

الحمدللہ کہے تو تم یرحمک اللہ کہو اور اگر وہ الحمدللہ نہ کہے تو اس کا جواب نہ دو"۔(۱)

صحیح مسلم ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا"ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں: جب تم اس سے ملو تو سلام کرو، جب تمہیں دعوت دے تو قبول کرو، جب نصیحت طلب کرے تو نصیحت کرو، جب چھینکے اور الحمدللہ کہے تو یرحمک اللہ کہو، جب مرجائے تو جنازہ میں شرکت کرو اور جب بیمار ہو جائے تو عیادت کرو۔(۲)

امام ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں چھینکنے کے وقت یہ کہنے کی تعلیم دی ہے"الحمدللہ علی کل حال"(۳) امام مالک نے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا جائے تو چھینکنے والے کو"یرحمنا اللہ وایاکم ویغفر لنا ولکم" کہنا چاہیئے۔(۴)

ابتدا میں جو حدیث مذکور ہوئی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ چھینکنے والے کا جواب دینا فرض عین ہے۔ ابن ابی زید نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کا کوئی معارض بھی نہیں ہے۔

(۱)مسلم:۲۹۹۲

(۲)مسلم:۲۱۶۲

(۳)بخاری:۱۲۴۰ و مسلم:۲۱۶۲

(۴)ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول صحیح سند سے ثابت ہے۔ موطأ ۲/ ۹۶۵

چونکہ چھینکنے والے کو چھینک سے نعمت ملتی ہے اور جسم میں پھنسے ہوئے بخارات کے نکلنے سے فائدہ ہوتا ہے اور صحت نصیب ہوتی ہے اس لئے اس نعمت کے حصول پر اللہ تعالی کی تعریف اس کے لئے مشروع کی گئی ہے۔ زمین کو جس طرح زلزلہ سے جھٹکا لگتا ہے اسی طرح کا جھٹکا چھینک سے بدن کو لگتا ہے مگر اللہ کا احسان ہے کہ اس جھٹکے کے باوجود تمام اعضا اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں۔

آپ ﷺ کو جب چھینک آتی تھی تو آپ اپنا ہاتھ یا کپڑا اپنے چہرے پر رکھ لیتے یا سر نیچا کر لیتے اور آواز پست فرما لیتے تھے۔(۱) نیز آپ ﷺ سے منقول ہے کہ بڑی جمائی اور بآواز بلند چھینک شیطان کی جانب سے ہے۔(۲)

صحیح حدیث میں ہے کہ ایک آدمی کو آپ ﷺ کی مجلس میں چھینک آئی تو آپ نے یرحمک اللہ فرمایا پھر دوبار چھینک آئی تو آپ نے فرمایا کہ اس آدمی کو زکام ہے۔ یہ امام مسلم کی روایت میں ہے۔(۳) اور امام ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے تیسری مرتبہ فرمایا کہ اس آدمی کو زکام ہے اور انہوں نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔(۴)

(۱) ابوداود: ۵۰۲۹، اور حاکم نے صحیح کہا ہے جس کی ذہبی نے موافقت کی ہے۔

(۲) ابن السنی: ۲۶۴۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

(۳) مسلم: ۲۹۹۳

(۴) ترمذی: ۲۷۴۴

امام ابوداؤد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ تمہارے بھائی کو اگر تین بار چھینک آئی تو وہ واقعی چھینک تھی اور جو اس سے زیادہ چھینکا تو وہ زکام ہے۔ اور چھینک میں تین بار جواب دینا سنت ہے۔(۱)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ زکام کی حالت میں انسان دعا کا زیادہ محتاج ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایسے شخص کو مریض والی دعا دینی چاہئیے ،لیکن چھینک جو اللہ کو پسند ہے اور جسے نعمت بتایا گیا ہے، وہ تین چھینکوں ہی تک ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے جس شخص کے لئے فرمایا کہ وہ مزکوم ہے تو اس سے اس بات پر تنبیہ مقصود تھی کہ اس کے حق میں عافیت کی دعا کرنی چاہئیے اور یہ معذرت بھی تھی کہ تین مرتبہ کے بعد جواب کیوں نہیں دیا۔

جب کسی چھینکنے والے نے الحمدللہ کہا تو بعض حاضرین نے سنا اور بعض نے نہیں سنا تو جس نے نہیں سنا انہیں کیا کرنا چاہئیے ۔اس میں صحیح بات یہ ہے کہ جب یقین ہو جائے کہ اس نے حمد کی ہے تو سب کو اس کا جواب دینا چاہئیے ۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب کوئی ''الحمدللہ'' کہے تو اس کا جواب دو۔ اور جب کوئی چھینکنے والا ''الحمدللہ'' نہ کہے یا بھول جائے تو ابن العربی کا قول ہے کہ اس کو

(۱)ابوداود:۵۰۳۴،اس کی سند حسن ہے۔

یاددہانی نہ کرائی جائے۔اور ظاہری الفاظ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو یاددہانی اس موقع پر نہیں کرائی حالانکہ آپ ﷺ سنت پر عمل کرنے اور اس کے سیکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔اس کار خیر میں تعاون کرنے کے زیادہ اہل تھے۔

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کے پاس اس امید پر چھینکتے تھے کہ آپ ان کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہیں گے لیکن آپ یہ نہ کہتے، صرف ''يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ'' کہتے تھے۔(۱)

(۱)ابوداود:۵۰۳۸،یہ حدیث صحیح ہے۔

فصل (۴۵)

آپ ﷺ کا سفر کے دوران اسوۂ حسنہ

صحیح روایت میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ دو رکعت نماز پڑھے“(۱) چنانچہ آپ نے دور جاہلیت کے غلط اوہام کے بجائے یہ طریقہ حسنہ پیش فرمایا کیونکہ وہ لوگ پرندوں اور تیروں سے شگون لیتے تھے اور قرعہ کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ غیب میں ان کے حصہ میں کیا تقسیم ہو چکا ہے اور اس طریق کار کو استقسام کہا کرتے تھے اور اس کی جگہ ایسی دعا تعلیم فرمائی جو توحید، اللہ تعالی کی بندگی، احتیاج اور توکل پر مشتمل ہے۔اس ذات پاک سے سوال کرنا ہے جس کے ہاتھ میں تمام خیر اور بھلائی ہے اور اس کے سوا نہ کسی سے بھلائی پہنچ سکتی ہے اور نہ اس کے سوا کوئی دکھوں کو دور کر سکتا ہے۔

یہ دعا اہل سعادت کے لئے نشانِ سعادت و برکت ہے اور ایسے بد بخت مشرکین کے لئے اس میں کچھ حصہ نہیں جو اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی معبود بناتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَجعَلُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَفَسَوفَ يَعلَمُونَ﴾(۲)

---

(۱) بخاری:۱۱۶۲

(۲) سورۃ الحجر:۹۶

جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود قرار دیتے ہیں عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

اس دعا میں اللہ تعالی کی صفات کاملہ اور ربوبیت عامہ کا اقرار ہے۔ اس پر توکل کا اعلان ہے اور اپنی مصلحتوں سے ناواقفیت اور ان پر عدم قدرت کا اعتراف ہے۔

مسند احمد میں سعد بن ابی وقاص سے مرفوعاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ "اللہ تعالی سے استخارہ کرنا اور اس کی قضا پر راضی ہو جانا بنی آدم کی سعادت کی علامت ہے اور استخارہ کو ترک کر دینا اور اللہ تعالی کے فیصلے پر ناراض ہونا بنی آدم کی بدبختی کی علامت ہے"۔(۱)

یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ مقدر دو صفتوں کے درمیان مذکور ہے۔ ایک توکل جو مقدور سے پہلے استخارہ کا مضمون ہے اور دوم اللہ کے فیصلہ پر رضامندی جو مقدور کے بعد کی چیز ہے۔

جب نبی کریم ﷺ سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھتے:

﴿ سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴾

پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کیا اور ہم اسے زیر نہ کر سکتے تھے

(۱) ترمذی: ۲۱۵۲، یہ حدیث قوی نہیں ہے۔

، ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پھر آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے:

" اَللّٰھُمَّ إِنِّی أَسأَلُكَ فِي سَفَرِي ھٰذَا البِرَّ وَالتَّقوٰی، وَمِنَ العَمَلِ مَا تَرضٰی، اَللّٰھُمَّ ھَوِّن عَلَینَا السَّفَرَ وَاطوِ عَنَّا بُعدَہٗ، اَللّٰھُمَّ أَنتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالخَلِیفَةُ فِي الأَھلِ، اَللّٰھُمَّ أَصحِبنَا فَي سَفَرِنَا وَاخلُفنَا فِي أَھلِنَا "

اے اللہ! اس سفر میں تجھ سے نیکی وتقوی کا سوال کرتا ہوں اور ایسے عمل کا جس کو تو پسند کرے۔ اے اللہ! سفر آسان کر اور اس کی دوری سمیٹ دے۔ اے اللہ! تو سفر کا ساتھی اور گھر والوں کا محافظ ہے۔ اے اللہ! سفر میں ہمارے ساتھ رہ اور گھر والوں کی حفاظت فرما۔

اور جب سفر سے واپس ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

" آیِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ"(۱)

ہم لوٹ کر آتے ہیں، اللہ کے آگے توبہ کرتے ہیں، اور ہم اپنے رب کی عبادت اور تعریف کرتے ہیں۔

(۱) مسلم: ۱۳۴۲

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب آپ شہر میں ہوتے تو یہ دعا پڑھتے: (تو با تَوْبًا لِرَبِّنَا أَوْبًا لَا يُغَادِرُ حَوْبًا)

ہم لوٹ کر آتے ہیں، ہمارے رب کے آگے توبہ کرتے ہیں جو تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔

جب آپ سواری پر چڑھنے کے لئے رکاب میں پیر رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب اس کی پشت پر سوار ہو جاتے تو ''الحمد للہ'' کہتے، پھر '' سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِيْن'' والی دعا پڑھتے تھے۔(۱) جب آپ سفر پر جانے والے کسی صحابی کو رخصت کرتے تو یہ دعا پڑھتے:

''أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ، وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ''

میں تیرا دین تیری امانت اور تیرے عمل کا انجام اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔(۲)

ایک شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا ''میں تجھے اللہ سے ڈرنے اور اونچی جگہ پر اللہ اکبر کہنے

---

(۱) ترمذی: ۳۴۴۳، اور اس کو حسن صحیح کہا ہے۔

(۲) ترمذی: ۳۴۳۹، اور اس کو حسن صحیح کہا ہے۔

کی وصیت کرتا ہوں"۔(۱) آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نشیبی جگہ اترتے تو تسبیح کہتے،(۲) اسی حیثیت میں نماز بھی رکھی گئی ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی اونچی جگہ یا ٹیلہ پر چڑھتے تو یہ دعا پڑھتے:

" اَللّٰھُمَّ لَكَ الشَّرَفُ عَلَى كُلِّ شَرَفٍ وَلَكَ الْحَمْدُ عَلَى كُلِّ حَالٍ "

اے اللہ! ہر بلندی پر تجھے ہی بلندی حاصل ہے اور ہر حالت میں تیری ہی حمد ہے۔(۳)

اور آپ فرماتے تھے کہ "فرشتے ایسے قافلے کے ساتھ شریک نہیں ہوتے جس میں کتا یا گھنٹی اور باجا ہو"۔(۴)

آپ اس بات کو ناپسند فرماتے تھے کہ مسافر تنہا رات کو سفر کرے۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تنہا سفر کرنے میں کتنی قباحت ہے تو وہ رات کو تنہا سفر

(۱) ترمذی:۳۴۴۵، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) بخاری:۲۹۹۴

(۳) مسند احمد:۲۳۹، یہ روایت ضعیف ہے۔

(۴) مسلم:۲۱۱۳

نہیں کریں گے"۔(۱) بلکہ آپ تنہا سفر ہی نا پسند فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ"ایک مسافر ایک شیطان ہے، دو مسافر دو شیطان اور تین سے قافلہ بنتا ہے"۔(۲)

آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کسی جگہ اترے تو یہ دعا پڑھے:

" أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ "

ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کیا، اللہ کے کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں۔ پھر اسے کچھ ضرر نہ پہنچے گا، یہاں تک کہ وہ اس جگہ سے روانہ ہو جائے۔(۳)

آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم سبزہ زاروں میں سفر کرو تو اونٹوں کو بھی زمین میں سے ان کا حصہ دیا کرو، اور جب تم ویران مقام میں سفر کرو تو جلدی سے اسے عبور کر جاؤ۔ اور جب رات میں پڑاؤ کرو تو راستوں سے بچو کیونکہ وہ چلنے والوں کا راستہ اور رات میں زہریلے جانوروں کا ٹھکانہ ہیں۔(۴)

آپ ﷺ مسافر کو دشمن کے علاقے میں قرآن لے جانے سے منع فرماتے تھے

---

(۱) بخاری:۲۹۹۸

(۲) ابوداود:۲۶۰۷، اس کی سند حسن ہے۔

(۳) مسلم:۲۷۰۸

(۴) مسلم:۱۹۲۶

کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے اوراس کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔(۱) آپ عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے سے منع فرماتے تھے اگر چہ یہ ایک برید (۱۲ میل) کی مسافت کیوں نہ ہو۔(۲)

آپ مسافر کو حکم دیتے کہ جب سفر میں کام ختم ہو جائے تو جلدی سے اپنے گھر لوٹ آئے (۳) اور طویل سفر سے واپسی میں رات کے وقت گھر آنے سے منع فرمایا ہے۔(۴)

جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو خاندان کے بچوں سے ملتے۔اور سفر سے واپس آنے والے کے ساتھ آپ معانقہ فرماتے تھے اور اگر اہل بیت میں سے ہوتا تو اس کا بوسہ لیتے تھے۔

شعبی کا قول ہے کہ صحابہ کرام جب سفر سے واپس آتے تو معانقہ کرتے تھے۔آپ ﷺ جب سفر سے آتے تو پہلے مسجد جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔(۵)

(۱) بخاری:۲۹۹۰ و مسلم:۱۸۶۹
(۲) بخاری:۱۰۸۸، مسلم:۱۳۳۹
(۳) بخاری:۱۰۸۴ و مسلم:۱۹۲۷
(۴) مسلم:۲۴۲۸
(۵) بخاری:۲۷۵۷ و مسلم:۲۷۶۹

فصل (۴۶)

آپ ﷺ کا خطبہ حاجت کا طریقہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کو خطبہ حاجت کی اس طرح تعلیم دی:

”إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَن يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ،وَأَشْهَدُ أَن لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ،وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اسی کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، نفس کی برائیوں اور برے اعمال سے۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے گمراہ کرے اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس رسول ہیں۔

پھر درج ذیل تین آیتیں پڑھتے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ...﴾[آل عمران: ۱۰۲].

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جتنا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُم﴾[آل عمران: ١٠٢]

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾[الأحزاب: ٧٠]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔(۱)

شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو اسحاق سے دریافت کیا کہ آیا یہ خطبہ نکاح ہے یا کچھ اور ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ ہر ضرورت کے لئے ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی عورت یا غلام یا جانور حاصل کرے تو وہ اس کی پیشانی پکڑ کر اللہ سے برکت کی دعا کرے اور بسم اللہ کہے اور یہ دعا پڑھے:

" اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيرَهَا وَخَيرَ مَا جُبِلَتْ عَلَيهِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا جُبِلَتْ عَلَيهِ "(۲)

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اس کی بھلائی اور جس پر یہ پیدا کی گئی ہے

(۱) ابوداود: ۲۱۱۸ و ترمذی: ۱۱۰۵، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) ابوداود: ۲۱۶۰، یہ حدیث حسن ہے۔

اس کی بھلائی مانگتا ہوں، اور اس کی برائی اور جس پر یہ پیدا کی گئی ہے اس کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ نکاح کرنے والے سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

"بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ "(۱)

اللہ تمہارے لئے برکت دے اور تم پر برکت نازل کرے اور تم دونوں کو بھلائی پر جمع کرے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا، جو آدمی بھی کسی مریض کو دیکھے اور یہ دعا پڑھ لے، تو اسے وہ مرض کبھی نہ ہوگا چاہے کچھ بھی ہو۔ دعا یہ ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي عَافَانِي مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِي عَلٰى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيلًا"(۲)

سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا، جس میں تجھے مبتلا کیا اور مجھے بہت سی مخلوقات پر بطور خاص افضلیت دی۔

نبی کریم ﷺ کے پاس اچھا فال کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس میں اچھا فال ہے اور یہ مسلمانوں کو نقصان نہیں دے سکتی۔ جب تم کوئی برا شگون دیکھو، جسے تم برا

(۱) ترمذی: ۱۰۹۱، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔
(۲) ترمذی: ۳۴۲۸، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

سمجھتے ہو تو یہ دعا پڑھو:

” اللّٰھُمَّ لَایَأْتِي الْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ ،وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ ،وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ “(۳)

اے اللہ! تو ہی بھلائیاں عطا کرتا ہے اور صرف تو ہی تکالیف رفع کرتا ہے اور تیرے سوا نہ توفیق ہے اور نہ قوت ہے۔

(۱) ابوداود: ۳۹۱۹، اس کی سند ضعیف ہے۔

فصل (۴۷)

آپ ﷺ کا خواب دیکھنے کے متعلق اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ اچھے خواب اللہ کی جانب سے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے،اس لئے جو شخص کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو بائیں جانب معمولی تھوک کے ساتھ پھونک مار دے اور ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھ لے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور کسی کو اس کی خبر نہ دے۔اور اگر خواب اچھا دیکھے تو خوش ہو اور صرف اسی کو خبر دے جس سے محبت ہو۔(۱)

آپ نے برا خواب دیکھنے والے کو پہلو بدلنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیا ہے(۲) اسی طرح کل پانچ چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ۔(۱) بائیں طرف پھونک مارے (۲)اعوذ باللہ پڑھے(۳) کسی کو خبر نہ دے(۴) کروٹ بدل دے(۵) نماز پڑھے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ خواب کی جب تک تعبیر نہ کی جائے،اڑتا رہتا ہے اور جب تعبیر بیان کر دی جاتی ہے تو واقع ہو جاتا ہے،لہذا خواب دیکھنے والا صرف اسی کو

(۱) بخاری:۳۲۹۲،مسلم ۲۲۶۱

(۲) مسلم:۲۲۶۲

بتائے جس سے محبت ہو یا جو صاحب رائے(۱) ہو، نیز آپ سے منقول ہے کہ خواب دیکھنے والے سے آپ پہلے یہ فرما دیتے تھے کہ تم نے اچھا خواب دیکھا ہے، پھر اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے۔

(۱)ابوداود:۵۰۲۰،یہ حدیث جید ہے۔

فصل (۴۸)

وساوس کے متعلق آپ ﷺ کی سنت طیبہ

عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ انسان کے دل میں ایک القاء فرشتہ کی طرف سے ہوتا ہے اور ایک شیطان کی طرف سے، فرشتہ بھلائی کا وعدہ کرتا ہے، حق کی تصدیق کرتا ہے اور ثواب کی امید دلاتا ہے، اور شیطان کا القاء برائی کے وعدے، حق کی تکذیب اور بھلائی سے مایوسی پر مشتمل ہوتا ہے، لہذا تم جب فرشتے کا القاء محسوس کرو تو اللہ کی تعریف کرو اور اس کی مہربانی کا سوال کرو، اور جب شیطان کا القاء محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو اور اس سے بخشش طلب کرو۔(۱)

عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میرے اور میری نماز اور قراءت کے درمیان شیطان حائل ہوجاتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا نام خنزب ہے، جب تم اسے محسوس کرو تو اللہ کی پناہ طلب کرو اور اپنی بائیں جانب تین بار تھوک دو۔(۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے شکایت کی کہ ان کے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں جن کے اظہار کے مقابلے میں جل کر راکھ ہونے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ نے

---

(۱) ترمذی:۲۹۹۱، اس کی سند ضعیف ہے۔

(۲) مسلم:۲۲۰۳

فرمایا: اللہ اکبر، سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے شیطان کی چال کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا۔(۱)

کائنات کی خلقت وغیرہ کے سلسلہ میں کسی کو وسوسہ پیدا ہو اور یہ خیال آئے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ تو ایسے شخص کو نبی کریم ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ وہ یہ آیت کریمہ پڑھے:

﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾[الحديد:۳]

وہی اول و آخر، ظاہر اور باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اسی طرح ابو زمیل نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ مجھے سینے میں کچھ وسوسہ محسوس ہوتا ہے تو انہوں نے پوچھا، کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بخدا میں ہرگز زبان پر نہ لاؤں گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کوئی شک کی بات نہیں ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے کوئی بھی نجات نہ پاسکا یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَؤُونَ

(۱) ابوداود: ۵۱۱۲، اس کی سند صحیح ہے۔

الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ﴾[سورة يونس:٩٤].

اگر آپ اس کی طرف سے شک میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلی کتابوں کو پڑھتے ہیں۔

اگر دل میں کچھ محسوس کرو تو ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾[الحديد:٣] پڑھ لو۔(١)

اس طرح آیت کے ذریعہ آپ ﷺ نے رہنمائی فرمائی کہ تسلسل بدیہی طور پر باطل ہے۔ابتدا میں مخلوقات کا سلسلہ ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جس سے پہلے کچھ نہیں اور آخر میں ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جس کے بعد کچھ نہیں،اور اس ذات کے ظہور کا یہ معنی ہے کہ اس کے اوپر کچھ نہیں اس کے بطون کا معنی یہ ہے کہ اس کے احاطہ کے بعد کچھ نہیں باقی بچا۔اگر اس سے پہلے کوئی چیز مانی جائے جو اس میں موثر ہو تو وہی رب خلاق کی ذات ہوگی۔اس لئے ضروری ہوگا کہ یہ سلسلہ ایسے خالق پر ختم ہو جو دوسرے سے بے نیاز ہو اور ہر چیز اس کی محتاج ہو،وہ خود قائم ہو،اور جو خود قائم ہوگا وہ بذات خود موجود ہوگا اور جو خود ہوگا وہ قدیم اور بے ابتدا ہوگا۔اس کے علاوہ تمام چیزوں کا وجود اس کی ذات

(١)ابوداود:٥١١٠،اس کی سند حسن ہے۔

سے باقی ہے اور ہر چیز کی بقا اسی سے ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے حتی کہ کہنے والا کہے گا، یہ اللہ ہے جس نے مخلوق کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ اب جس کو اس قسم کا کوئی وسوسہ محسوس ہو وہ اللہ کی پناہ مانگے اور رک جائے اور مزید نہ سوچے (۱)''

اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (۲) اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کسی قسم کی چھیڑ پہنچے تو خدا کی پناہ لیا کرو۔

چونکہ شیطان کی دو قسمیں ہیں، ایک جو کہ بشکل انسان نظر آتا ہے اور دوسرا جو جن ہے اور نظر نہیں آتا۔ اس لئے اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ انسانی شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اعراض، عفو اور مناسب مدافعت سے کام لیں جبکہ جناتی شیطان کے شر سے بچنے کے لئے اعوذ باللہ پڑھا کریں۔ سورہ اعراف، مؤمنون اور فصلت میں دونوں قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک شعر ہے:

---

(۱) بخاری: ۶: ۳۲۷، مسلم: ۱۳۴

(۲) سورہ فصلت: ۳۶

فما هو الا الاستعاذة ضارعا أو الدفع بالحسنى هما خير مطلوب

عاجزی کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھنا اور بھلے طور پر مدافعت کرنا، یہی بہترین مطلوب ہے۔

فهذا دواء الداء من شر ما يرى وذاك دواء الداء من شر محجوب

یہ نظر نہ آنے والی چیزوں کے شر کی اور وہ پوشیدہ شر کی کامیاب دوا ہے۔

فصل (۴۹)

آپ ﷺ کی غصہ کے وقت کی تعلیمات حسنہ

نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ غصے کی آگ بجھانے کے لئے وضو کیا جائے یا کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے۔

جب انسان کے قلب میں غصہ اور شہوت، آگ کی دو چنگاریاں ہوتی ہیں تو آپ نے انہیں مذکورہ طریقے سے بجھانے کا حکم دیا جس طرح اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ:

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ﴾[البقرة:٤٤]

کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

اس پر آمادہ کرنے والی چیز چونکہ شہوت کی شدت ہوتی ہے۔ اس لئے اس شعلہ کو نماز اور صبر کے ذریعہ سے بجھانے کا حکم دیا گیا اور شیطانی وسوسہ کے وقت اس سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

چونکہ تمام معصیتوں کا صدور غضب اور شہوت ہی سے ہوتا ہے اور غضب کا انجام قتل اور شہوت کا انجام زنا ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالی نے قتل اور زنا کا ساتھ ساتھ ذکر کیا اور سورہ انعام، سورہ اسراء اور سورہ فرقان میں انہیں یکجا ذکر کیا ہے۔

جب نبی کریم ﷺ کسی پسندیدہ چیز کو دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے:

" الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ "

تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لئے ہیں جس کی نعمت سے اچھے کام پورے ہوتے ہیں۔

جب کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھتے تو یہ کہتے تھے:

" الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ "

ہر حال میں سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں (۱)، اور جب کوئی محبوب یا مناسب چیز پیش کرتا تو آپ اس کے لئے دعا فرماتے، چنانچہ جب ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کے لئے وضو کا انتظام کیا تو آپ نے دعا فرمائی:

" اللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ "

اے اللہ انہیں دین کی سمجھ عطا فرما اور تفسیر قرآن سکھا۔ (۲)

قتادہ رضی اللہ عنہ نے رات کے وقت سواری پر سہارا دیا تو آپ نے یہ دعا دی۔

" حَفِظَكَ اللّٰهُ بِمَا حَفِظْتَ بِهِ نَبِيَّهُ "

"اللہ تمہاری حفاظت کرے جس طرح تم نے اس کے نبی کی حفاظت کی" (۳) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: جس کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس نے "جزاک اللہ خیرا" کہہ دیا تو اس

(۱) ابن ماجہ: ۳۸۰۳، اس کی سند صحیح ہے

(۲) بخاری: ۱۴۳، مسلم: ۲۴۷۷

(۳) مسلم: ۶۸۱

نے گویاتعریف کردی۔(۱)

ایک قرض دار نے قرض ادا کردیا تو آپ ﷺ نے ان الفاظ سے دعا دی:

” بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ، إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ “

اللہ تمہارے مال واولاد میں برکت دے، بلا شبہ قرض کا بدلہ تعریف اور ادائیگی ہے۔(۲)

اور جب آپ کو کوئی تحفہ پیش کیا جاتا تو آپ بدلہ میں اورزیادہ تحفہ میں دے دیتے (۴) اور اگر آپ کو قبول کرنا ناپسند ہوتا تو آپ معذرت کرلیتے جس طرح آپ نے صہیب سے فرمایا تھا: (حالت احرام میں ہونے کی وجہ سے ہم تمہارے اس تحفے کو قبول نہیں کرتے) (۵) نے امت کو حکم دیا کہ جب گدھے کی آواز سنیں تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کریں اور جب مرغ کی آواز سنیں تو اللہ سے اس کا فضل مانگیں (۶)۔ یہ بھی مروی ہے کہ آگ لگ

---

(۱) مسلم:۶۸۱

(۲) ترمذی:۲۰۳۶

(۳) ابن ماجہ:۲۴۲۴

(۴) بخاری:۲۵۸۵

(۵) بخاری:۱۸۲۵

(۶) بخاری:۳۳۰۳

جائے تو اللہ اکبر کہیں، اس سے وہ بجھ جائے گی۔(۱)

اور اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ اہل مجلس اپنی مجلسوں کو ذکر الٰہی سے محروم رکھیں اور فرمایا کہ جو آدمی ایسی جگہ سے اٹھے جہاں اللہ کا ذکر نہ ہوا ہو اس پر اللہ تعالی کی طرف سے حسرت نازل ہوگی (۲) اور جو لیٹ جائے اور اللہ تعالی کو یاد نہ کرے تو اس پر بھی حسرت نازل ہوگی۔ نیز آپ نے فرمایا جو کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں بکثرت لغو باتیں کرڈالے۔ اگر اٹھنے سے قبل یہ کلمات کہہ لے تو اس مجلس میں جو کچھ بھی خطا ہو چکی ہوگی، معاف کردی جائے گی۔

" سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمدِكَ أَشهَدُ أَن لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنتَ أَستَغفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيكَ"

اے اللہ! ہم تیری پاکی اور حمد بیان کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تجھ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔(۳)

سنن ابوداؤد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مجلس سے اٹھنا چاہتے تھے تو مذکورہ دعا پڑھتے تھے۔ آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ مجلس میں جو کچھ ہوا، اس کا یہ کفارہ ہے۔(۴)

(۱) ابن السنی:۲۹۴، یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲) ابوداود:۴۸۵۶، اس کی سند حسن ہے۔

(۳) ترمذی:۳۴۹، یہ حدیث جید ہے۔

(۴) ابوداود:۴۸۵۹، اس کی سند حسن ہے۔

فصل (۵۰)

آپ ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ الفاظ وکلمات

بعض ایسے الفاظ جن کو کہنا اور سننا آپ ناپسند کرتے تھے، کچھ یہ ہیں: (خَبُثَتْ نفسی) کہنا کہ میں خبیث ہوگیا ہوں، انگور کو (کرم) کہنا، (ھلک الناس) کہ لوگ ہلاک ہوگئے کہنا، آپ ﷺ نے فرمایا، جس نے ایسا کہا گویا خود اس نے لوگوں کو ہلاک کیا(۱)، یا یہ کہنا: لوگ فاسد ہوگئے، زمانہ فاسد ہوگیا، فلاں فلاں پچھتر سے بارش ہوئی(۲)، جو اللہ چاہے اور تم چاہو(۳)، چنانچہ آپ نے اس طرح کے جملے کہنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح سے غیر اللہ کی قسم کھائی جائے یا قسم میں یہ کہے کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ یہودی ہے یا کسی بادشاہ کو شہنشاہ کہے اور آقا اپنے غلام یا لونڈی کو میرا بندہ یا میری بندی کہہ کر پکارے اور ہوا، بخار، مرغ وغیرہ کو برا بھلا کہنا، ان تمام چیزوں کے کہنے سے ممانعت آئی ہے۔

---

(۱) مسلم: ۲۶۲۳

(۲) بخاری: ۴۸۶، مسلم: ۷۱

(۳) بخاری فی الأدب المفرد: ۷۸۷، اس کی سند حسن ہے۔

اسی طرح جاہلیت کے نعرے لگانا، جیسے قبیلہ، قومیت اور مذہبی، گروہی ومشائخی طرق کے حق میں متعصّبانہ انداز اختیار کر کے نعرے بازی کرنا اور عشاء کی نماز کو عتمہ کہنا جس سے عشاء کا نام متروک ہو جائے، کسی مسلمان کو گالی دینا، تیسرے شخص کی موجودگی میں دو آدمیوں کا سرگوشی کرنا، عورت کا اپنے شوہر کے سامنے دوسری عورت کے محاسن بیان کرنا، ان تمام الفاظ وکلمات کے کہنے کی ممانعت آئی ہے۔

اسی طرح سے یہ بھی کہنا ممنوع ہے، یا اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ کثرت سے قسمیں کھانا، قوس وقزح کہنا، کسی سے اللہ کے نام پر سوال کرنا، مدینہ کو یثرب کہنا، بلا ضرورت کسی سے یہ دریافت کرنا کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا الا یہ کہ اس سوال کی ضرورت پڑ جائے، اور میں نے پورے رمضان کے روزے رکھے اور پوری رات کا قیام کیا، اس طرح کے الفاظ کہنا مکروہ ممنوع ہے۔

ممنوع کلمات میں یہ بھی داخل ہے کہ اشارہ سے بتائی جانے والی چیزوں کو صراحت کے ساتھ ذکر کیا جائے یا (اطال اللہ بقاءک) وغیرہ کہا جائے یا روزے دار یہ کہے: اس ذات کی قسم، جس کی مہر میرے منہ پر ہے، کیونکہ مہر تو کافر کے منہ پر لگتی ہے، یا زبردستی لی ہوئی چیز کو حقوق سے تعبیر کیا جائے یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا یہ کہے کہ دنیا میں میں نے بہت سا مال خرچ کیا، یا اجتہادی مسائل میں مفتی یہ کہے کہ اللہ تعالی نے

فلاں چیز حلال کی ہے اور فلاں چیز حرام، یا قرآن وسنت کے دلائل کو مجازی قرار دیا جائے اور متکلمین کے شبہات کو دلائل عقلی وقطعی سے تعبیر کیا جائے، اللہ گواہ ہے کہ اس طرح کے کلمات کہنے سے دین ودنیا کی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

نیز ممنوع ومکروہ باتوں میں یہ ہے کہ آدمی دوسروں سے اپنی بیوی کے ساتھ مابین چیزوں کا تذکرہ کرے جیسے بعض کمینوں کی عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح زعموا، ذکروا، قالوا، (لوگ دعوی کرتے ہیں، ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں) جیسے الفاظ سے حکایت کرنا، اور بادشاہ کو خلیفۃ اللہ کہنا منع ہے کیونکہ خلیفہ ایسی ذات کا ہوتا ہے جو غائب ہوتا ہے اور اللہ تعالی تو خود غائب شخص کے اہل وعیال کا خلیفہ اور محافظ ہے۔

نیز انا، لی، عندی، (میں، میرا، میرے نزدیک) کے الفاظ سے بچنا چاہیئے کیونکہ انہی تین الفاظ سے ابلیس فرعون اور قارون کی آزمائش ہوئی تھی۔

چنانچہ ابلیس نے کہا تھا ''انا خیر منہ'' (۱) (میں اسے سے بہتر ہوں) اور فرعون نے کہا تھا ''ولی ملک مصر'' (۲) (اور مصر ملک میرا ہے) اور قارون نے کہا تھا ''وانما انا اوتیتہ علی علم عندی'' (۳) اور مجھے یہ مال میرے علم کی بنا پر دیا گیا اور سب ان متکبرانہ جملوں

(۱) الأعراف: ۱۲

(۲) الزخرف: ۵۱

(۳) القصص: ۷۸

سے گمراہ ہوئے۔

سب سے بہتر (انا) یعنی (میں) ''بندے کے اس قول میں ہے'' انا العبد المذنب'' میں گناہگار توبہ کرنے والا اور اعتراف کرنے والا بندہ ہوں، اور لفظ (لی) جیسے لی الجرم، ولی الفقر'' (گناہ وجرم اور فقر وذلت میرا ہے) اور عندی جیسے'' اغـفِـرلِی جَدِّي وَهَزْلِي وَخَطئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذَلِكَ عِنْدِي''

میرا گناہ، لغزش، خطائیں، اور عمداً گناہ بخش دے اور میرے پاس یہ تمام نقائص ہیں۔

فصل (۵۱)

آپ ﷺ کا جہاد و غزوات میں اسوہ حسنہ

جہاد چونکہ اسلام کا ایک اعلیٰ وعظیم الشان مسئلہ ہے اور مجاہدین جنت میں بلند تر مقامات پر فائز ہوں گے اور دنیا میں بھی ان کی سر بلندی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ اس سلسلہ میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز تھے چنانچہ آپ ﷺ نے جہاد کی ہر قسم میں بنفس نفیس حصہ لیا اور اللہ کی راہ میں دل و جان، دعوت و بیان، سیف و سنان، غرض ہر چیز کے ذریعہ سے جہاد فرمایا اور آپ کے تمام اوقات جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف تھے اس لئے آپ کی شخصیت اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابل قدر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کرتے ہی جہاد کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَاداً كَبِيراً﴾[الفرقان:۵۲]

آپ کافروں کی اطاعت نہ کیجئے اور ان سے خوب جہاد کیجئے۔

یہ سورہ مکی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ساتھ جہاد بالبیان کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح منافقین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا کہ انہیں دلیل دی جائے یعنی جہاد بالحجہ کیا جائے جو کفار سے جہاد کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہے۔ یہ جہاد امت کے خواص اور وارثان رسول کا حصہ ہے۔ دنیا میں تھوڑے سے لوگ اس کو انجام دیتے ہیں اور اس راہ

میں تعاون کرتے ہیں۔ایسے لوگ تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ان کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے۔

چونکہ افضل ترین جہاد یہ میں ہے کہ شدید معارضت کے موقع پر حق بات کہی جائے جیسے جابر وظالم کے سامنے کلمہ حق کہنا جس سے ایذا کا خطرہ بھی ہو،اس قسم کے جہاد میں انبیاء کرام کا حصہ کافی ہوتا ہے اور ہمارے نبی کریم ﷺ اس سلسلہ میں کامل اور اعلی ترین مجاہد تھے۔ نیز اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں کیا جانے والا خارجی جہاد بندے کے داخلی جہاد نفس کی فرع اور شاخ ہے۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر اپنی ذات ونفس سے جہاد کیا''(۱)تو ظاہر ہے کہ جہاد بالنفس جہاد بالعدو پر مقدم ہے۔یہ دونوں دشمن ہیں اور بندے کو ان دونوں سے جہاد کرنے کا مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ان کے علاوہ ایک تیسرا دشمن بھی سامنے کھڑا ہے۔اس سے جہاد کئے بغیر ان دونوں کا مقابلہ کرنا بھی محال ہے،اور وہ تیسرا بندے کو ان دونوں کا مقابلہ کرنے سے باز رکھنے اور اسے کمزور کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے

(۱)ابن حبان:۴۶۲۴،اس کی سند صحیح ہے۔

(۲)فاطر:۶

اور وہ دشمن شیطان ہے۔

اللہ تعالی کا ارشادگرامی ہے:

﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾[الفاطر:٦]

شیطان تمہارا دشمن ہے،اس لئے تم اسے دشمن سمجھو۔

چنانچہ اسے دشمن سمجھنے کا حکم اس بات کا اشارہ ہے کہ اس سے جنگ کرنے اور مقابلہ کرنے کے لئے پوری وسعت اور ہمت سے کام لینا چاہیئے۔اس طرح یہ تین دشمن ہیں جن سے بندے کو جنگ کرنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالی کی طرف سے اس کی ایک آزمائش ہے۔اور بندے کو ان کے مقابلے کی قوت اور مدد بھی دی گئی ہے اور فریقین میں سے ایک کو دوسرے کے ذریعہ آزمایا گیا ہے۔اور بعض بعض کے لئے فتنہ ہیں تاکہ ان کے حالات ومعاملات کا امتحان ہوسکے، چنانچہ بندوں کو اللہ تعالی نے آنکھ، کان، عقل اور قوتوں سے نوازا ہے اور ان کے لئے کتابیں نازل فرمائی اور انبیاء کرام کی بعثت کی اور اپنے فرشتوں سے نصرت فرمائی۔دشمنوں سے جنگ کے دوران جو چیز مددگار ثابت ہوسکتی ہے، اس سے مطلع فرمایا، اور ان کو بتایا کہ اگر اس کی اطاعت کرتے رہیں گے تو اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہوتے رہیں گے۔ اگر اس کی اطاعت سے روگردانی کریں گے تو دشمنوں کو اللہ تعالی ان پر مسلط کردیں گے۔اور ایسی

صورت میں بھی مایوسی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ صبر واستقامت سے ان زخموں کا بھی مداوا کیا جا سکتا ہے اور دشمن پر غالب ہوا جا سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ وہ نیکوکاروں اور پرہیز گاروں اور صبر کرنے والوں اور ایمان والوں کے ساتھ ہے، اور وہ ذات پاک مومنین کی اس وقت مدافعت اور نصرت کرتی ہے جب وہ اپنے آپ مدافعت سے عاجز اور قاصر ہو جاتے ہیں اس کی نصرت اور مدافعت سے وہ فتحیاب ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دشمن انہیں تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔

یہ مدافعت ان کے ایمان ویقین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر ایمان قوی ہوگا تو مدافعت بھی قوی ہوگی۔ اس میں جو بھلائی پائے تو چاہیئے کہ اس پر اللہ تعالی کی حمد وثنا کرے اور جو بھلائی کے علاوہ کچھ اور دیکھے تو صرف اپنے آپ کو ملامت کرے۔

اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ اس کے راستے میں جہاد کرنے کا حق ادا کریں جس طرح ان کو تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ اطاعت کریں، نافرمانی نہ کریں۔ اسے یاد کریں، فراموش نہ کریں۔ اس کا شکر ادا کریں، ناشکری نہ کریں۔

اس طرح اللہ تعالی کے راستے میں جہاد کا یہ حق ہے کہ بندہ اپنے نفس سے جہاد کرے تاکہ اس کا قلب، زبان اور تمام جوارح اللہ تعالی کے فرمانبردار ہو جائیں بلکہ ہمہ

تن اللہ تعالی کا ہو جائے اور اپنی ذات کا نہ رہے۔

شیطان کے ساتھ جہاد کی صورت یہ ہے کہ اس کے وعدے کی تکذیب کی جائے۔ اس کے حکم کی نافرمانی کی جائے کیونکہ وہ جھوٹی امیدیں دلاتا اور غلط آرزوئیں دلاتا ہے، محتاجی کی طرف لے جاتا ہے اور خواہشات کی پیروی کراتا ہے۔ بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور ہدایت و ایمانی اخلاقیات سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں جہادوں سے بندے کے اندر ایک قوت و ہمت پیدا ہو جائے گی جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالی کے دشمنوں کے ساتھ قلبی، لسانی، اور مالی اور جسمانی جہاد کر سکے گا جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہوگا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں سلف صالحین کی مختلف تعبیرات اور توضیحات وارد ہوئی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جہاد نام ہے پوری قوت صرف کر دینے کا۔ اللہ جل شانہ کے متعلق کسی طرح کی ملامت سے خائف نہ ہو۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نفس اور خواہشات کے ساتھ مقابلے کا نام جہاد ہے۔

اس لئے ان لوگوں کی رائے درست نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ دونوں آیتیں جن میں جہاد اور تقوی کے سلسلہ میں ''حق تقاتہ'' و ''حق جہادہ'' مذکور ہے منسوخ ہیں کیونکہ بندہ ضعیف اس کا پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتا مگر درحقیقت کما حقہ تقوی اور جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اندر موجود طاقت کے مطابق کرے۔ بندوں کے حالات

کے مختلف ہونے سے بھی اس میں اختلاف ہوتا ہے۔غور کریں کہ کس طرح اس حکم کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾[الحج: ۷۸]

اسی نے تم کو برگزیدہ بنایا اور دین کے سلسلہ میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔

آیت میں حرج سے تنگی مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔(۱) تو دین میں آسانی سے مراد عقیدہ توحید اور عمل میں آسانی مراد ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر دین، روزی، عفو اور مغفرت کے سلسلہ میں بہت زیادہ وسعت سے کام لیا ہے اور جب تک جسم میں جان ہو توبہ کا موقع ہے۔ ہر برائی کا کفارہ ہے۔حرام کے بدلہ میں حلال چیز ہے۔ ہر تنگی سے پہلے اور بعد میں آسانی ہے،اس لئے اللہ تعالی ایسی تکلیف نہیں دیتا جس کی بندوں کو طاقت نہ ہو۔

---

(۱) مسند احمد: ۲۶۶۵،اس کی سند ضعیف ہے۔

فصل (۵۲)

جہاد کے درجات ومراتب

اس وضاحت کے بعد یہ جان لینا چاہئیے کہ جہاد کی چار قسمیں ہیں:

(۱) نفس سے جہاد (۲) شیطان سے جہاد (۳) کفار سے جہاد (۴) جہاد ارباب العلم والمنکر ات والبدع۔

(۱) جہاد نفس کے چار درجات ہیں، اول: ہدایت اور دین حق کی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش اور نفس کو اس کی جستجو پر مجبور کیا جائے۔ دوم: تحصیل علم کے بعد عمل کے لئے نفس پر جبر اور اس سے جہاد کرے۔ سوم: دعوت حق میں مصروف ہونا ورنہ صاحب حق ان بدبختوں میں گنا جائے گا جو اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو چھپاتے ہیں۔ چہارم: دعوت کی راہ میں جو مصائب وآلام پیش آئیں انہیں صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرنا۔ جس خوش نصیب نے جہاد نفس کے یہ چاروں مرحلے کامیابی سے طے کر لئے، ربانی ہو گیا، کیونکہ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ عالم اس وقت تک عالم ربانی نہیں بن سکتا جب تک حق کو نہ پہچان سکے، اس پر عمل نہ کرے اور دوسرے کو بھی نہ سکھلائے اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت نہ دے۔

(۲) شیطان سے جہاد کے دو درجے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ شیطان ایمان کے

اندر شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔اس معرکہ میں اس سے دست وگریبان ہونا۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ شیطان کی طرف سے جن فاسد ارادوں اور شہوتوں کی تلقین ہوتی ہے، ان کے رد کرنے میں جدوجہد کرنا۔ پہلے درجہ میں کامیابی ''یقین'' سے حاصل ہوتی ہے اور دوسرے درجہ میں کامرانی ''صبر'' سے حاصل ہوتی ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾[السجدة : ٢٤]

اور بنادیئے ہم نے ان میں سے امام جو راہ چلتے ہیں ہمارے حکم سے، کیونکہ انہوں نے صبر واستقامت دکھائی اور یقین کرتے رہے ہماری نشانیوں پر۔

(۳) منافقین وکفار سے جہاد کے بھی چار درجے ہیں: (۱) قلب سے (۲) زبان سے (۳) مال سے (۴) جان سے۔ کفار کے ساتھ جہاد کو ہاتھ کے ساتھ، اور منافقین کے ساتھ جہاد کو زبان کے ساتھ زیادہ تعلق ہے۔

(۴) ظالمین اور اہل بدعت ومنکرات سے جہاد کے صرف تین درجے ہیں:

پہلا ہاتھ کے ذریعہ اگر قدرت ہو، دوسرا زبان کے ذریعہ جب کہ پہلی صورت ممکن نہ ہو، تیسرا دل کے ذریعہ جب کہ سابقہ دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں۔

اس طرح مجموعی طور پر جہاد کی تیرہ قسمیں ہوئیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے''

جوکوئی جہاد کے بغیر یا کم ازکم اس کی تمنا کئے بغیر مرجائے۔اس کی موت نفاق کے ایک حصہ پر ہوئی۔(۱)

جہاد ہجرت سے مکمل ہوتا ہے اور ہجرت و جہاد دونوں ایمان کے ساتھ صحیح و مکمل ہوتے ہیں۔ جہاد کی ان تمام قسموں کی توفیق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو رحمت الٰہی کے امیدوار اور قرب باری تعالی کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّهِ أُولَـئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّهِ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾[البقرة: ٢١٨]

جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں، وہی اللہ کی رحمت کی امید کرتے ہیں اور اللہ تعالی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جس طرح ہر شخص پر ایمان فرض ہے،اسی طرح دوطرح کی ہجرتیں ہمہ وقت فرض ہیں۔ایک ہجرت اللہ کی طرف بذریعہ اخلاص،اور دوسری ہجرت رسول اللہ ﷺ کی طرف بذریعہ اتباع۔اسی طرح نفس کے اور شیطان کے ساتھ جہاد بھی فرض عین

(۱) مسلم:۱۹۱۰

ہے۔کوئی بشر بھی اس سے مستثنی نہیں اور کوئی کسی کی نیابت نہیں کرسکتا۔ کفار ومنافقین سے جہاد کبھی فرض عین ہوتا ہے اور کبھی فرض کفایہ۔ اگر ضرورت کے مطابق لوگ اس میں مشغول رہے تو باقی پر فرض نہیں ہوتا۔

فصل (۵۳)

جہاد میں مومن کامل کا امتحان

اللہ تعالی کے نزدیک کامل ترین انسان وہ ہے جو جہاد کی ان تمام قسموں اور مرتبوں میں کامل ترین اترے، پھر کمال کے بھی درجے ہیں۔ بعض معمولی ہیں، بعض بلند ہیں، بعض بلند تر ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کو چونکہ جہاد کی ان سب قسموں میں بلند ترین درجہ حاصل تھا، اس لئے اللہ تعالی کی نظر میں آپ تمام انسانوں سے افضل واشرف تھے۔ آپ بعثت کے وقت سے وفات کے دن تک اللہ تعالی کی راہ میں پورا پورا جہاد کرتے رہے۔ جب آپ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾[المدثر: ١-٤]

اے چادر پوش، اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور کپڑوں کو پاک کر۔

تو آپ ﷺ دعوت کے لئے فی الفور آمادہ اور کھڑے ہوگئے اور اللہ تعالی کی طرف سے سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے لگے۔ لوگوں کو دعوت حق دینے میں شب وروز خاموشی سے اور علی الاعلان مشغول ہوگئے۔ پھر جب آپ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾[الحجر: ٩٤]

جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے، اسے کھول کر بیان کریں۔

تو اس وقت آپ علانیہ طور پر دعوت دین دینے لگے اور کسی کی ملامت وغیرہ کی پرواہ کئے بغیر اللہ تعالی کے حکم کا اعلان شروع کر دیا۔ آپ ﷺ نے بڑے چھوٹے، آزاد و غلام، مرد و عورت، جن و انس ہر ایک کو اللہ تعالی کا پیغام پہنچا دیا اور اس کے دین کی دعوت دی۔

کفار نے جب دیکھا کہ ان کے آبائی دین کی برملا مذمت ہو رہی ہے تو غیظ و غضب سے بھر گئے اور رسول اللہ ﷺ اور پیروان اسلام کو سخت سے سخت تکلیفیں دینے لگے۔ اس پر اللہ تعالی نے آپ کو تسکین دی کہ گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمام انبیاء کرام کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کہ جھٹلائے گئے اور گوناگوں مصائب میں مبتلا کئے گئے تھے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ﴾[فصلت: ٤٣]

تمہیں بھی وہی کہا جا رہا ہے جو تم سے پہلے رسولوں کو کہا جا چکا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ﴾[الأنعام: ١١٢]

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے انسان اور جن کے شیاطین سے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾[الذاريات:٥٢-٥٣]

اسی طرح جب ان سے پہلوں کے پاس رسول بھیجا تو انہوں نے اسے یا تو ساحر بتایا یا مجنون کہا، کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے بلکہ وہ سرکش قوم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دی اور بتایا کہ گزشتہ انبیاء کرام کی زندگی میں آپ کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم﴾[البقرة:٢١٤]

کیا تم نے سمجھ رکھا کہ جنت میں (اسی طرح) داخل ہو جاؤ گے، جب کہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو پہلے لوگوں پر گزرے تھے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿الم أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾[العنكبوت:١-٢]

کیا لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ انہیں ایمان کا دعوی کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

اور فرمایا:

﴿أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ﴾[العنکبوت:١٠]

کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ ان آیات کا سیاق اور ان میں بیان کردہ احکام اور عبرتوں کے خزانے دیکھے کیونکہ جب انسان کی طرف انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا تو دو باتیں کھل کر سامنے آ گئیں۔ایک یہ کہ کسی نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور کسی نے کہا ہم ایمان نہیں لائے، بلکہ وہ کفر اور برائیوں پر جم گئے۔اب جس نے آمنا کہا (کہ ہم ایمان لائے) پروردگار نے اس کا امتحان لیا، اس کی آزمائش کی، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنے کے لئے اسے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جس نے کفر اور انکار کیا، وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اللہ تعالی کو عاجز کر دے گا اور اس پر سبقت لے جائے گا۔جو شخص رسولوں پر ایمان لائے گا، اسے دشمنوں کی طرف سے مخالفت اور تکلیف کا سامنا کرنا ہوگا اور اس طرح اس کی آزمائش ہوگی لیکن جو ان کی اطاعت نہیں کرے گا، اسے دنیا و آخرت میں سزا ملے گی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو تکلیف کا سامنا کرنا ضروری ہے۔فرق یہ ہے کہ

مومن کو ابتدا میں تکلیف ہوگی پھر دنیا و آخرت دونوں جگہ اچھا نتیجہ سامنے آئے گا، اور ایمان سے منہ پھیرنے والے کو شروع میں لذت ملے گی، پھر اسے دائمی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ انسان کے لئے کیا بات بہتر ہے، وہ سطوت حاصل کرے یا ابتلاء میں رہے؟ آپ نے فرمایا: تب تک اسے تسلط حاصل نہ ہوگا جب تک اس امتحان (ابتلاء) میں نہ پڑ جائے۔

اللہ تعالی نے بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء کرام کو ابتلاء میں ڈالا، آخر جب انہوں نے صبر کیا تو انہیں سطوت حاصل ہوئی۔ اس لئے کوئی بھی یہ خیال نہ کرے کہ وہ ضرور دکھوں سے محفوظ رہے گا۔

مصائب اور آلام میں مبتلا لوگوں کی عقلوں میں بھی تفاوت ہے۔ سب سے بڑا عقلمند وہ ہے جس نے تھوڑے سے ختم ہوجانے والے دکھ کے عوض طویل ترین اور دائمی دکھ کو بیچ دیا، اور سب سے بڑا بدبخت وہ ہے کہ جس نے طویل ترین اور دائمی دکھ مول لے کر تھوڑا سا ختم ہوجانے والا دکھ بیچ دیا۔

اگر یہ سوال ہو کہ انسان ایسی صورت کیوں پسند کرتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نقد اور ادھار کا معاملہ ہے، نفس ہمیشہ سامنے کی چیز پر جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ☆ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ﴾[القيامة: ٢٠-٢١]

ہرگز نہیں بلکہ تم عجلت والی چیز کو پسند کرتے ہو اور آخرت کی چیز کو چھوڑ دیتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ﴾[الدھر: ٢٧]

یہ لوگ فوری ملنے والی چیز کو پسند کرتے ہیں۔

ایسا ہر شخص کو پیش آتا ہے، اس لئے کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا پڑتی ہے اور وہ اس سے اپنے ارادوں کی موافقت چاہتے ہیں اور جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے عذاب اور تکلیف دیتے ہیں۔ اور اگر وہ ان کی مرضی کا ساتھ دیتا ہے تو خود عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے ایک دیندار اور متقی آدمی فاسقوں اور فاجروں کے درمیان آجائے جو اس کی موافقت کے بغیر فسق وفجور نہ کرسکیں۔ اب اگر وہ موافقت کرے تو ابتدا میں ان کے شر سے محفوظ رہے گا، پھر وہ لوگ اس کے ساتھ توہین وتکلیف کا وہی معاملہ شروع کردیں گے۔ جس سے بچنے کے لئے اس نے ابتدا میں ان کی موافقت کی تھی اور اگر توہین کا یہ معاملہ وہ خود نہ کریں گے تو کوئی دوسرا ایسا کرے گا۔

اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول پر عمل کیا جائے جسے انہوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: (لوگوں کو ناراض کرکے جو اللہ کو خوش کرے گا

اس کی کفایت اللہ تعالی کرے گا، اور جو اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کو خوش کرے گا، اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے)(۱) دنیا کے احوال پر غور کرنے سے ان لوگوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملیں گی جو لوگ حکمرانوں اور اہل بدعت کی مدد ان کی سزاؤں سے بچنے کے لئے کرتے ہیں جسے اللہ تعالی نفس کے شرور وفتن سے بچا لے گا وہ شخص حرام کی موافقت نہ کرکے ان کے ظلم وستم کو صبر واستقامت سے سہے گا اور دنیا وآخرت میں اچھے انجام سے نوازا جائے گا، جس طرح کہ علمائے کرام اور ان کے پیروکار اچھے انجام کے مستحق ہوئے ۔ چونکہ مصائب وآلام سے پوری طرح چھٹکارا ممکن نہ تھا، اس لئے اللہ تعالی نے ان لوگوں کو تسلی دی، جنھوں نے دائمی اور بڑی تکلیف کے بدلے میں معمولی اور عارضی تکلیف اختیار کیا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿مَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾[العنکبوت:۵]

جو اللہ سے ملنے کی امید رکھے تو اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے والا ہے اور وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

(۱) ترمذی:۲۴۱۶، یہ حدیث صحیح ہے۔

یعنی عارضی تکلیف کا ایک وقت ہے جو اللہ کی ملاقات سے ختم ہو جائے گا اور اس سے بندہ کو بے حساب لذت حاصل ہوگی اور اللہ تعالی نے بندہ کو اس ملاقات کی انتہائی قوی امید دلائی ہے تا کہ اس کے شوق میں بندہ یہاں کی تکلیف کو برداشت کر لے، بلکہ بعض لوگوں کو تو اس کا اشتیاق اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ تکلیف کا احساس نہیں کر پاتے۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالی سے اس کی ملاقات کے شوق کا سوال کیا(۱)، اور یہ شوق و ذوق بڑی نعمتوں میں سے ہے، لیکن اس نعمت کے لئے بطور سبب کچھ اقوال و اعمال ہیں جن سے اس نعمت کا حصول ہوتا ہے اور اللہ تعالی اقوال کو سنتا اور اعمال کو جانتا ہے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نعمت کا اہل کون ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَ كَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ﴾[الأنعام:٥٣]

اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا۔

لہذا جب بندہ سے کوئی نعمت فوت ہو جائے تو اسے اپنے لئے یہ آیت پڑھنا چاہئیے:

﴿أَلَيْسَ اللّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ﴾[الأنعام:٥٣]

---

(۱) ابن حبان:۱۹۷۱، اس کی سند جید ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو جانتا نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ایک دوسری تسلی یہ دی کہ اللہ کی راہ میں ان کا جہاد ان کے لئے ہے ورنہ اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے، اس طرح جہاد کا فائدہ خود بندوں کو حاصل ہوتا ہے پھر بتایا کہ اس جہاد کی وجہ سے ان کو صالحین کی جماعت میں شامل کرے گا۔ مزید اس شخص کا حال بتایا جو بغیر بصیرت کے ایمان میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکلیف کو اللہ کے اس عذاب کی طرح سمجھتا ہے جس کے بچنے کے لئے مومن ایمان لاتا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ اپنے لوگوں کی مدد کرتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو تمہارے ہی ساتھ ہوں، حالانکہ اس کے سینہ میں نفاق چھپا ہوا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ لوگوں کا ضرور امتحان لے تا کہ اس کے ذریعہ پاک اور ناپاک کا امتیاز ہو جائے، کیونکہ نفس اصل کے لحاظ سے جاہل اور ظالم ہے اور ظلم و جہالت کے باعث اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کی صفائی کی جائے۔ اگر اس گھر سے صفائی وطہارت کے ساتھ نکلا تو ٹھیک ہے، ورنہ جہنم کی بھٹی میں جانا پڑے گا اور جب بندہ وہاں پاک وصاف ہو جائے گا تو اسے جنت میں داخلہ کی اجازت مل جائے گی۔

فصل (۵۴)

آپ ﷺ کی دعوت اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قبول اسلام

جب نبی کریم ﷺ نے اللہ کی طرف دعوت دی تو ہر قبیلہ سے لوگوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، چنانچہ اس میدان میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب پر سبقت حاصل کی اور اللہ کے دین کو پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا۔ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ دین اسلام کی دعوت وتبلیغ میں مکمل طور پر تعاون کیا اور آپ ہی کی دعوت سے عثمان، طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح خدیجہ رضی اللہ عنہا اسلام قبول کرنے میں سبقت لے گئیں اور صدیقانہ صفات کی حامل ہوئیں اور اس کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے کہا مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے تو خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "آپ مطمئن رہیں، اللہ کی قسم اللہ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا" انہوں نے آپ ﷺ کی صفات حسنہ سے استدلال کیا تھا کہ ایسی صفات کے حامل کو اللہ تعالی رسوا نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فطرت سلیمہ اور غیر معمولی فہم وفراست سے یہ جان لیا کہ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ اللہ تعالی کی عظمت واحسان کے مناسب ہے اور ذلت ورسوائی اس کے شایان شان نہیں۔ ایسی فراست کاملہ اور فطرت سلیمہ کے باعث وہ اس بات کی مستحق ہوئیں کہ اللہ تعالی نے انہیں جبریل علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے

ذریعہ ہدیہ سلام ارسال فرمایا۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ایک قول میں آپ کی عمر زیادہ مروی ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی زیر کفالت تھے۔ انہیں آپ ﷺ نے اپنے چچا سے قحط سالی میں مدد کی غرض سے اپنی کفالت و تربیت میں لے لیا تھا۔

زید بن حارثہ نے بھی اسلام قبول کیا۔ یہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ نبی کریم ﷺ نے جب خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو انہوں نے زید رضی اللہ عنہ کو آپ کی خدمت میں ہبہ کر دیا۔ ان کے والد اور چچا جب فدیہ دے کر ان کی آزادی کے لئے حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس سلسلہ میں کوئی اور چیز نہ کر لیں۔ انہوں نے کہا: وہ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ زید کو بلا کر اختیار دے دو۔ اگر وہ تمہیں اختیار کر لے تو تمہارا ہے اگر مجھے اختیار کر لے تو میرے پاس رہ جائے تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ بہت عدل وانصاف کی بات ہے، چنانچہ انہیں بلایا گیا اور انہیں اس بات سے مطلع کیا تو انہوں نے عرض کیا، میں کبھی بھی آپ کے علاوہ کسی اور کو اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں کہنے لگے: اے زید! تعجب کی بات ہے، تمہارا ناس ہو، غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو اور اپنے گھر والوں کے بجائے دوسروں کو اختیار کر رہے ہو تو زید نے فرمایا: ہاں

میں نے آپ کی شخصیت میں ایسی خوبی دیکھی ہے اور اپنے ساتھ ایسا حسن سلوک اور برتاؤ دیکھا کہ اس کے بعد کسی اور کو آپ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

جب نبی کریم ﷺ نے یہ معاملہ دیکھا تو آپ نے ان کے سامنے مقام حجر میں اعلان کر دیا کہ "میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ زید میرے بیٹے ہیں، میں ان کا وارث اور وہ میرے وارث ہیں" جب ان کے والد اور چچا نے یہ منظر دیکھا تو دونوں بہت خوش ہوئے اور واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد زید، زید بن محمد کے نام سے مشہور ہو گئے، اور پھر جب دین آیا اور قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ﴾[الأحزاب:٥]

لوگوں کو ان کے باپ کے نام سے پکارا کرو، یہ اللہ کی نظر میں زیادہ درست ہے۔

تو اس وقت سے لوگ انہیں زید بن حارثہ کہنے لگے۔(۱) معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ زید سے پہلے ہمیں کسی کے اسلام کا علم نہیں۔(۲)

ورقہ بن نوفل بھی مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں خواب میں اچھی حالت میں دیکھا تھا۔(۳)

---

(۱) بخاری:۴۷۸۲، مسلم:۲۴۲۵

(۲) یہ مرسل روایت ہے۔

(۳) ترمذی:۲۲۸۹، مگر یہ روایت ضعیف ہے۔

آخر لوگ ایک ایک کرکے دین میں داخل ہونے لگے اور قریش نے اس کی مخالفت کی۔ آخر جب آپ نے ان کے بناوٹی خداؤں کا پردہ چاک کیا کہ یہ نفع ونقصان کے مالک نہیں تو یہ لوگ بھی نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ کی ان کے چچا ابوطالب کے ذریعہ حفاظت فرمائی جو قریش کے ایک شریف سردار تھے۔ یہ اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا تھا کہ ابوطالب اپنے مذہب پر باقی رہیں۔ اس کے فوائد غور کرنے سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حالت تھی کہ جو صاحب خاندان ہوتا، وہ خاندان کے باعث مشرکوں کی ایذاؤں سے محفوظ رہتا، ورنہ نہیں۔ چنانچہ بہت سے صحابہ کرام کو مشرکین مکہ سے مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے عمار بن یاسر، ان کی والدہ اور ان کے اہل خاندان ہیں جنہیں شدید ترین ایذائیں دی گئیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوتا تو آپ فرماتے "اے آل یاسر! صبر کرو کیونکہ تم سے جنت کا وعدہ ہے"۔(۱)

ایذائیں دیئے جانے والوں میں بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہیں اللہ کے راستے

(۱) مجمع الزوائد: ۹/۲۹۳، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

میں سخت ترین ایذائیں دی گئیں اور وہ اللہ کے دین کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر چکے تھے۔ جوں جوں تکلیف زیادہ دی جاتی، ان کے منہ سے ’’احد احد‘‘ نکلتا تھا۔ ورقہ بن نوفل وہاں سے گزرتے تو کہتے کہ ہاں، اللہ کی قسم اے بلال! ایک ہی (اللہ) ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم انہیں مار ڈالو گے تو میں ان پر گریہ وزاری کروں گا۔(۱)

جب مسلمانوں کے خلاف کفار کی ایذائیں سخت ترین ہو گئیں اور انہیں طرح طرح کے دکھ و درد دیئے جانے لگے اور ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جانے لگے اور شدید ترین شرور وفتن سے دوچار ہو گئے تو اللہ تعالی نے ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ پہلے مہاجرین میں سے عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ اور دوسرے لوگ جن کی مجموعی تعداد سولہ افراد پر مشتمل تھی جن میں بارہ مرد اور چار عورتیں تھیں۔

یہ لوگ مکہ سے خفیہ حالت میں نکلے اور جب سمندر کے ساحل پر پہنچے تو اتفاق سے انہیں دو کشتیاں مل گئیں، جن پر یہ لوگ سوار ہو کر حبشہ پہنچے۔ ان لوگوں نے بعثت کے پانچویں سال رجب کے مہینے میں ہجرت کی تھی۔ ان کے تعاقب میں قریش نکل کھڑے ہوئے اور ساحل تک آئے لیکن ان میں کسی کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصے

(۱) یہ روایت ضعیف ہے۔

کے بعد ان مہاجرین کو اطلاع ہوئی کہ قریش مکہ نبی کریم ﷺ کی ایذا رسانی سے باز آ گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ لوٹ پڑے۔ جب یہ لوگ مکہ سے صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھے تو خبر ملی کی قریش مکہ تو آپ ﷺ کی ایذا رسانی میں اور زیادہ شدت سے کام لے رہے ہیں اور ان کی عداوت ومخالفت شباب پر ہے، چنانچہ ان میں سے بعض پناہ لے کر مکہ میں داخل ہو گئے جن میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ آپ نے نماز کی حالت میں ہونے کی وجہ سے سلام کا جواب نہیں دیا۔ (۱) یہی صحیح ہے اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے کہ جب مکہ سے قریب پہنچے اور انہیں معلوم ہوا کہ پہلی خبر غلط تھی، پھر حمایت کے سہارے یا خفیہ طور پر وہ مکہ میں داخل ہوئے۔ واپس آنے والوں میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مدینہ ہجرت کرنے تک مکہ ہی میں مقیم رہے، پھر بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ رہی زید بن ارقم کی حدیث (۲) (جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں بات چیت کی ممانعت مدینہ کا واقعہ ہے) تو اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔

اول یہ کہ ممانعت مکہ میں ہوئی تھی۔ پھر مدینہ میں اجازت مل گئی تھی اور پھر اس کے

(۱) بخاری: ۱۱۹۹، مسلم: ۳۸۷۵

(۲) بخاری: ۱۲۰۰، مسلم: ۵۳۸

بعد منع کیا گیا۔

دوم یہ ہے کہ زید چھوٹے صحابیوں میں سے تھے۔ یہ اور دوسرے ساتھی اپنی عادت کے مطابق نماز میں بولتے تھے کیونکہ انہیں ممانعت کا علم نہ تھا پھر جب علم ہوا تو انہوں نے بھی بات چیت بند کر دی۔

پھر جب حبشہ سے واپس آنے والوں اور دیگر مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے جانے لگے۔ خصوصاً جب قریش کو نجاشی کے حسن سلوک کی خبر ملی۔ دوسری مرتبہ جن لوگوں نے ہجرت کی، ان کی تعداد تراسی (۸۳) مردوں پر مشتمل تھی اگر اس ضمن میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شمار کئے جائیں اور اس قافلہ میں انیس عورتیں شامل تھیں۔ ان میں عثمان رضی اللہ عنہ اور کچھ دوسرے بدری صحابہ کا بھی نام شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک وہم ہے یا پھر یہ کہا جائے کہ وہ بدر سے پہلے ایک بار اور حبشہ سے آئے تھے۔ اس طرح ان کی ہجرت تین مرتبہ میں ہو جائے گی۔

اسی وجہ سے ابن سعد نے کہا ہے کہ ان لوگوں نے جب نبی کریم ﷺ کی ہجرت کی خبر سنی تو ان میں سے ۳۳ مرد اور آٹھ عورتیں واپس آ گئیں جن میں دو مرد مکہ ہی میں انتقال کر گئے اور سات مکہ ہی میں قید کر لئے گئے اور ۲۴ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔

ماہ ربیع الاول ۷ھ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے عمرو بن امیہ کے ذریعہ نجاشی کو خط

بھیجا جس میں انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور کہا: اگر میں حاضر ہونے پر قادر ہوتا تو ضرور خدمت میں حاضری دیتا(۱) اور آپ نے نجاشی کو یہ بھی لکھا کہ ام حبیبہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیں، یہ اپنے شوہر عبداللہ بن جحش کے ساتھ ہجرت کرکے حبشہ گئی تھیں اور انہوں نے وہاں عیسائیت کو قبول کرلیا تھا اور اسی حالت میں انتقال کر گئے، چنانچہ نجاشی نے ان کو آپ کی زوجیت میں دے دیا اور آپ کی طرف سے چار سو دینار مہر کی ادائیگی کردی۔ خالد بن سعید بن العاص اس نکاح کے ولی تھے۔(۲)

آپ ﷺ نے نجاشی کو یہ بھی لکھا تھا کہ جو صحابہ وہاں باقی رہ گئے ہیں، انہیں سواری کا انتظام کرکے مدینہ بھیج دیں۔ نجاشی نے عمرو ابن امیہ کے ساتھ تمام لوگوں کو کشتیوں میں بھیج دیا۔ جب یہ لوگ خیبر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو وہ فتح ہو چکا تھا۔(۳)

اس طرح وہ اشکال بھی ختم ہوجاتا ہے جو ابن مسعود اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۸/ ۹ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲) ابوداود: ۲۰۸٦، اس کی سند صحیح ہے۔

(۳) بخاری: ۳۱۳۳، مسلم: ۲۵۰۲

حدیثوں کے مابین نظر آتا ہےاور یہ سمجھا جائے گا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت مدینہ میں ہوئی تھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ تطبیق اچھی ہےلیکن ابن اسحاق کے اس بیان کا کیا جواب ہوگا جس میں یہ وضاحت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مکہ میں تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ابن سعد نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ مکہ میں تھوڑے دن مقیم تھے پھر حبشہ واپس چلے گئے تھے۔یہی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ مکہ میں ان کا کوئی محافظ و مدگار نہ تھا۔

اس توجیہ میں جو بات ہے،وہ ابن اسحاق پر واضح نہیں ہوسکی اور ابن اسحاق نے روایت کرنے والوں کا نام نہیں ذکر کیا ہےلیکن ابن سعد نے اسے مطلب بن عبداللہ بن خطب کی طرف منسوب کیا ہے۔اس طرح دونوں روایتوں کا اشکال دور ہوجائے گا اور صحیح مفہوم واضح ہوجائے گا۔ والحمدللہ!

ابن اسحاق نے اس ہجرت میں ابوموسی اشعری کا نام بھی لیا ہےلیکن واقدی وغیرہ نے اس کی تردید کی ہےاور کہا ہے کہ کس طرح یہ بات ابن اسحاق سے مخفی رہ گئی؟ میرا جواب یہ ہے کہ یہ بات مخفی نہیں تھی لیکن مذکورہ وہم اس طرح پیدا ہوا کہ ابوموسی رضی اللہ عنہ یمن سے ہجرت کرکے جعفر رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے اورانہی کے ساتھ واپس آئے۔ اس کو ابن اسحاق نے ان کی ہجرت شمار کرلیا ہےلیکن انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ مکہ سے ہجرت کرکے گئے تھے کہ ان کی تردید کی جائے۔

فصل (۵۵)

آپ ﷺ کو ایذارسانی اور سفر طائف

مہاجرین حبشہ نجاشی کی سلطنت میں اطمینان وسکون سے رہنے لگے تھے لیکن قریش نے انہیں مکہ واپس بلانے کی غرض سے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو تحفہ وتحائف دے کر نجاشی کی طرف بھیجا اور انہوں نے وہاں بڑے بڑے دینی قائدین سے بھی سفارش کروائی، لیکن نجاشی نے ان کی واپسی کا انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ سازش اور ریشہ دوانی کر کے بہکانا چاہا کہ یہ لوگ عیسی علیہ السلام کے متعلق گستاخانہ عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے تھے، چنانچہ اس نے ان مسلمانوں کو دربار میں بلوایا۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کے سربراہ تھے، جب ان لوگوں نے داخل ہونے کا ارادہ کیا تو جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کی جماعت آپ سے اجازت چاہتی ہے۔ اس نے دربان سے کہا کہ ان سے کہو کہ یہ لوگ اپنی درخواست پھر دہرائیں۔ انہوں نے دوبارہ اسی طرح عرض کیا، پھر جب یہ جماعت ان کے دربار میں داخل ہوئی تو اس نے دریافت کیا، آپ لوگ عیسی علیہ السلام کے متعلق کیا کہتے ہیں تو جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہنے لگا: بخدا عیسی علیہ السلام اس سے ایک تنکا بھی زیادہ

نہ تھے۔ پادریوں نے اس پر اظہار حیرت کیا تو ان سے کہا کہ تم جو کچھ بھی کہو میرا یہی قول ہے اور مسلمانوں سے کہا کہ جاؤ تم لوگ میری سلطنت میں مامون ومحفوظ ہو، جو تمہیں ایذا دے گا، اس کو سزا دی جائے گی۔ پھر وہ قریش کے دونوں قاصدوں سے کہنے لگا کہ اگر تم مجھے سونے کا گرجا بلکہ پہاڑ بھی دے دو پھر بھی میں مسلمانوں کو تمہارے حوالے نہ کروں گا۔ اس کے بعد اس نے سرداران قریش کے تحائف لوٹا دینے کا حکم دیا۔ آخر یہ لوگ رسوا ہو کر واپس ہوئے۔(۱)

پھر حمزہ اور ایک بڑی جماعت نے اسلام قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔ جب قریش نے نبی کریم ﷺ کی اس دعوت کو ترقی پذیر دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ کام بڑھ رہا ہے اور ان کی حیثیت مضبوط ہو رہی ہے تو انہوں نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے خلاف ایک معاہدہ طے کیا جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ نہ ان کے ساتھ خرید وفروخت کریں گے، نہ شادی بیاہ کریں گے اور نہ کسی قسم کے معاملات وتعلقات قائم کریں گے، جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالے نہ کر دیں گے۔

(۱) مسند احمد: ۱/۲۰۲ اور اس کی سند صحیح ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک عہد نامہ کعبہ کی چھت پر لٹکا دیا۔ اسے مغیض بن عامر بن ہاشم نامی ایک شخص نے لکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے بددعا کی جس سے اس کا ہاتھ شل ہوگیا تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے ابولہب کے علاوہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے تمام افراد کا خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اس طرح بائیکاٹ ہوا تھا کہ سب لوگ شعب ابی طالب میں محصور ہوگئے۔ ابولہب اس سازش میں قریش کے ساتھ شریک کار تھا۔

یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال پہلی محرم کی رات پیش آیا تھا۔ تمام لوگ تقریباً تین سال تنگی ودشواری میں رہے تھے۔ مصیبت کا یہ عالم تھا کہ بچوں کے گریہ وزاری کی آواز گھاٹی کے باہر سے سنائی دیتی تھی۔ اس موقع پر ابو طالب نے اپنا مشہور قصیدہ لامیہ لکھا تھا۔ قریش کے بعض لوگ اس بائیکاٹ کو ناپسند کرتے تھے اور کچھ لوگ پوری طرح مؤید تھے، جو لوگ ناپسند کر رہے تھے، انہوں نے اس عہد نامہ کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی اور وہ اسے توڑنے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔

اس کے دوران اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو اس عہد نامہ کے متعلق آگاہ فرما دیا کہ اس پر اللہ تعالی نے دیمک بھیجی ہے، جس نے ظلم، قطع تعلق، اور ستم رسائی کی باتیں چاٹ ڈالیں اور اس صرف اللہ کا مبارک نام باقی رہنے دیا۔ آپ نے اپنے چچا کو

اس کی خبر دی کہ وہ قریش کے پاس جا کر ان سے کہیں کہ میرے بھتیجے کی بات غلط ثابت ہو جائے تو ہم تمہارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں گے، اور اگر ان کی خبر صحیح ثابت ہو جائے تو تمہیں رجوع کرنا پڑے گا۔ان لوگوں نے کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں، پھر اس عہد نامہ کو اتار کر دیکھا تو درحقیقت نبی کریم ﷺ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا لیکن اس سے کفار کے کفر وعناد میں اور اضافہ ہو گیا۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء اس گھاٹی سے نکل آئے۔اس کے چھ ماہ بعد ابو طالب نے وفات پائی اور اس کے تین دن بعد ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی انتقال فرما گئیں، چند روایتوں میں کچھ اور تاریخ ذکر کی گئی ہے۔ان دونوں حادثوں سے آپ کو شدید صدمہ پہنچا اور قریش کے اوباشوں سے سخت ترین ایذاؤں کا پھر لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور ظلم وستم کے نت نئے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ طائف تشریف لے گئے تاکہ اہل طائف کو دعوت اسلام دیں اور وہ لوگ آپ کے ساتھ مدد وتعاون کا معاملہ کریں۔آپ نے انہیں اللہ کی طرف بلایا لیکن ان میں سے کسی نے بھی دعوت اسلام پر لبیک نہ کہا اور نہ کوئی آپ کا حامی ومددگار نکلا، بلکہ اس کے برعکس سخت تکلیفیں پہنچائیں اور اس سلسلہ میں قریش سے بھی زیادہ ایذائیں دیں اور ان سے بڑھ کر بدسلوکی کی۔آپ کے غلام زید بن حارثہ آپ

کے ساتھ تھے۔آپ وہاں دس دن قیام کے دوران بعد سرداران طائف کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے جواب دیا کہ آپ ہمارے شہر سے نکل جائیں۔انہوں نے غنڈوں اور اوباشوں کو آپ کے خلاف اکسایا اور پیچھے لگا دیا۔وہ آپ پر پتھر پھینکتے تھے یہاں تک کہ آپ کے پائے مبارک لہولہان ہوگئے ۔ زیدرضی اللہ عنہ بھی آپ کو بچانے میں سخت زخمی ہوگئے ، چنانچہ رسول اللہ ﷺ انتہائی حزین وغمزدہ ہوکر مکہ تشریف لائے۔واپسی میں یہ مشہور دعا فرمائی:

" اللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي وَقِلَّةَ حِيْلَتِي وَهَوَانِي عَلَى النَّاسِ "(۱)

اے اللہ! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی نظر میں بے وقعتی کا تجھ سے شکوہ کرتا ہوں، اس موقع پر اللہ تعالی نے پہاڑوں کے فرشتے کو بھیجا۔جس نے آ کر پوچھا کہ اگر آپ ﷺ حکم فرمائیں تو میں ان سب کو مکہ کے اردگرد کے دونوں پہاڑوں کے مابین دبادوں ،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کے معاملہ میں اس امید پر توقف کررہا ہوں کہ اللہ تعالی ان سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو اس کی عبادت کرے گی اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے گی۔(۲)

(۱) طبرانی:۱۰۳۶،مگر یہ مرسل روایت ہے۔
(۲) بخاری:۳۲۳۹،مسلم:۱۷۹۵

واپسی پر جب آپ ﷺ ایک کھجور کے جھرمٹ کے پاس اترے تو رات کی نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اسی اثناء میں جنات کی ایک چھوٹی سی جماعت آپ کی طرف آئی اور آپ کی تلاوت سننے لگی۔ آپ کو اس کی اطلاع اس وقت ہوئی جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ﴾[الأحقاف:۲۹]

اور جب ہم نے آپ کے پاس چند جنوں کو بھیجا۔

آپ ﷺ نے چند روز یہیں قیام فرمایا۔ زید رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا کہ قریش کے پاس آپ کس طرح جائیں گے جب کہ انہوں نے آپ کو نکال دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ زید! جو مصیبت تم دیکھ رہے ہو اسے اللہ تعالی ضرور دور کرے گا۔ وہ اپنے دین کی مدد کرے گا اور اپنے نبی کو غالب کر دے گا۔

پھر آپ ﷺ مکہ پہنچ گئے چنانچہ آپ نے بنی خزاعہ کا ایک آدمی مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ کیا میں تمہاری پناہ میں داخل ہو جاؤں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں ضرور آپ ہماری پناہ میں آسکتے ہیں۔ اور اس نے اپنی قوم اور بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لے لو اور خانہ کعبہ کے کونوں کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ کیونکہ ہم نے محمد ﷺ کو پناہ دے دی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ زید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے اور

مسجد حرام تک تشریف لے گئے۔

مطعم نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر پکارا، اے قریش کے لوگو! میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے۔اس لئے تم میں سے کوئی بھی ان کی اہانت اور برائی نہ کرے۔

نبی کریم ﷺ رکن کے پاس پہنچے تو اس کو چھوا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر گھر تشریف لے گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹے ہتھیار لئے ہوئے گھر تک آپ کے ساتھ گئے۔

فصل (۵٦)

آپ ﷺ کے معراج کا واقعہ

مسجد حرام سے لے کر بیت المقدس تک براق پر سوار ہو کر جبریل علیہ السلام کی رفاقت میں آپ ﷺ کو جسمانی سیر کرائی گئی۔ آپ ﷺ وہاں اترے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو امام بن کر نماز پڑھائی اور مسجد اقصی کے دروازے پر براق کو باندھ دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ بیت لحم میں اترے اور وہاں نماز پڑھائی لیکن یہ قول درست نہیں ہے۔

پھر اسی رات بیت المقدس سے آسمان دنیا کی طرف تشریف لے گئے۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کے لئے اجازت چاہی۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ وہاں آپ نے ابوالبشر آدم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر خوش آمدید کہا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ اللہ تعالی نے آپ کو دکھایا کہ ان کی اولاد میں نیک لوگوں کی روحیں ان کے دائیں اور برے لوگوں کی بائیں جانب ہیں۔ پھر آپ ﷺ کو دوسرے آسمان پر لے جایا گیا جہاں آپ نے یحییٰ وعیسی علیہما السلام کو دیکھا پھر تیسرے آسمان پر یوسف علیہ السلام کو، چوتھے پر ادریس علیہ السلام کو، پانچویں پر ہارون علیہ السلام کو اور چھٹے پر موسی علیہ السلام کو دیکھا۔ جب موسی سے آگے بڑھے تو وہ رونے

لگے۔ پوچھا گیا، کیوں روتے ہیں وہ فرمانے لگے کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ میرے بعد ایک جوان کو نبی بنایا گیا اور اس کی امت میری امت سے بہت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی، پھر ساتویں آسمان پر تشریف لے گئے، وہاں آپ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ پھر آپ ﷺ کو سدرہ المنتہیٰ اور بیت المعمور تک اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد آپ کو اللہ جل شانہ کی جناب اعلیٰ میں لے جایا گیا۔ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قریب ہو گئے، حتیٰ کہ دو کمان یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا(۱)۔ پھر اللہ نے آپ ﷺ کی طرف جو چاہا وحی بھیجی۔

آپ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں چنانچہ آپ لوٹے اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا حکم ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا، پچاس نمازوں کا۔ وہ کہنے لگے آپ کی امت کو اس کی استطاعت نہ ہوگی۔ آپ اپنے پروردگار کے پاس جائیے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی طرف التفات فرمایا گویا ان سے مشورہ چاہتے ہوں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ ہاں اگر آپ کی خواہش ہو۔ آخر آپ جبریل علیہ السلام کے ساتھ دوبارہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے اور وہیں کھڑے رہے۔ یہ صحیح بخاری کے

(۱) یہ عبارت راوی کی طرف سے اضافہ ہے جوان کا اپنا خیال ہے اور دوسری صحیح روایات کی مخالف ہے۔

الفاظ ہیں۔(۱) اس کے بعد اللہ تعالی نے دس نمازیں معاف فرمادیں۔ پھر آپ ﷺ اترے یہاں تک کہ موسی علیہ السلام کے پاس سے گزرے اور انہیں خبر دی۔ انہوں نے فرمایا کہ اپنے پروردگار کے حضور پھر جایئے اور تخفیف کی درخواست کیجئے۔ اس طرح موسی علیہ السلام اور اللہ تعالی کے درمیان آتے جاتے رہے، یہاں تک کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔ موسی نے اب بھی واپس جانے اور تخفیف کی درخواست کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے بلکہ اب تو میں راضی ہو گیا اور سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

جب آپ ﷺ چلے تو ندا دینے والے نے ندا کی اور کہا کہ میں نے اپنا فریضہ مقرر کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی۔(۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے اس رات اللہ تعالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے باری تعالی کو دیکھا۔ ایک قول یہ بھی ان سے منقول ہے کہ قلب سے دیکھا(۳)۔

---

(۱) بخاری: ۳۲۰۷

(۲) بخاری: ۳۸۸۷، مسلم: ۱۶۴

(۳) مسلم: ۱۷۶

عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انکار بھی ثابت ہے۔ ان دونوں نے فرمایا ہے کہ ﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى﴾ (۱) سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں (۲) ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ ﷺ نے اللہ تعالی کو دیکھا تو آپ نے فرمایا، میں نے ایک نور دیکھا ہے یعنی میرے اور اس کی رویت کے درمیان ایک نور حائل ہو گیا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے نور دیکھا۔ (۳)

عثمان بن سعید دارمی نے عدم رویت پر صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ آپ نے اللہ تعالی کو دیکھا اور قلب سے دیکھا، آپس میں متضاد نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب تعالی کو دیکھا (۴) لیکن یہ واقعہ شب معراج کا نہیں بلکہ یہ واقعہ مدینہ میں پیش آیا جب آپ نے اللہ تعالی کی خواب میں زیارت کی خبر دی۔

اس بنا پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں نبی کریم ﷺ نے فی الحقیقت

---

(۱) سورۃ النجم: ۱۳

(۲) مسلم: ۱۷۷، بخاری: ۳۲۳۴

(۳) مسلم: ۱۷۸

(۴) ترمذی: ۱۲۳۱، اور یہ حدیث صحیح ہے۔

دیکھا اور رویت انبیاء حق ہے اور امام احمد نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے دو آنکھوں سے بیداری میں دیکھا اور جس نے ان سے ایسا قول نقل کیا ہے، اسے غلط فہمی ہوئی، چونکہ امام احمد نے ایک بار فرمایا کہ آپ نے دیکھا اور جس نے ان سے ایسا قول نقل کیا ہے، اسے غلط فہمی ہوئی، چونکہ امام احمد نے ایک بار فرمایا کہ آپ نے دیکھا، اور ایک بار فرمایا کہ آپ نے روحانی طور پر دیکھا تو دونوں قول منقول ہو گئے۔ امام احمد سے ایک تیسرا قول بھی منقول ہے کہ آپ نے سر کی آنکھوں سے دیکھا لیکن یہ ان کے بعض اصحاب کے تصرف کا نتیجہ ہے۔ امام احمد کے نصوص موجود ہیں لیکن ان میں یہ قول نہیں ملتا۔ رہا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ دل دو مرتبہ دیکھا اگر ان کا اس استدلال اس آیت سے ہے:

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَأَى﴾[النجم:١١]

جو کچھ اس نے دیکھا اسے دل نے جھوٹ نہ سمجھا۔

پھر فرمایا:

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى﴾[النجم:٢٩]

حالانکہ اس نے ایک بار اور اسے دیکھا۔

بظاہر ان کا اس سے استدلال ہے، تو صحیح بات یہ ہے کہ یہاں دیکھے جانے والے

سے مراد جبرئیل ہیں، آپ ﷺ نے انہیں ان کی اصلی صورت میں دو مرتبہ دیکھا تھا، اور ابن عباس کا مذکورہ قول ہی امام احمد کے اس قول کی دلیل ہے کہ آپ نے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا۔

اور اللہ تعالی کے اس قول ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى﴾ (۱) کا تعلق واقعہ معراج والے ''دنو'' اور ''تدلی'' سے نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں ''دنی فتدلی'' سے حضرت جبریل مراد ہیں جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن مسعود کا قول ہے نیز کلام کے سیاق سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ: ﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى﴾ [النجم: ۵] ان کو ایک طاقتور فرشتہ سکھا تا ہے۔

اور حدیث میں جس ''دنو وتدلی'' (قرب اور جھکاؤ) کا ذکر ہے اس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کا قرب اور تدلی مراد ہے۔

جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اپنی قوم کو خبر دی کی اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو عظیم آیات دکھائیں۔ انہوں نے سختی سے تکذیب کی اور انتہائی شدت سے ایذا دہی او رضرر رسانی پر اتر آئے اور آپ ﷺ سے مطالبہ کرنے لگے کہ بیت المقدس کا حلیہ بیان

(۱) سورۃ النجم: ۸

کریں، چنانچہ اللہ تعالی نے (بیت المقدس) کو آپ ﷺ کے سامنے ظاہر کر دیا چنانچہ آپ نے اسے دیکھا اور اس کی تمام علامتیں بتانی شروع کیں۔ وہ آپ کی کسی بات کو رد نہیں کر سکے۔(۱) آپ نے اس قافلہ کے سفر اور واپسی کی خبر دی اور یہ کہ کس وقت وہ آئے گا اور کون سا اونٹ آگے ہوگا۔ واقعہ آپ ﷺ کی خبر کے عین مطابق ہوا(۲) لیکن اس سے ان کی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

ابن اسحاق نے عائشہ اور معاویہ سے نقل کیا ہے کہ معراج روحانی تھی، یہاں مناسب ہے کہ معراج بحالت خواب اور معراج روحانی کے باہمی فرق کو سمجھا جائے۔ خواب کی حالت میں سونے والے کو چند مثالی باتوں کو محسوس صورتوں میں پیش کیا جاتا ہے جسے محسوس صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ سونے والا یہ دیکھتا ہے کہ اسے آسمان کی طرف چڑھایا گیا یا مکہ لے جایا گیا، حالانکہ اس کی روح چڑھتی نہیں نہ وہ جاتا ہے بلکہ خواب کا فرشتہ اس کے لئے ایک تمثیل پیش کر دیتا ہے۔

جو لوگ معراج روحانی کے قائل ہیں ان کا مطلب نہیں کہ وہ خواب تھا بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ روح کو حقیقتاً لے جایا جاتا ہے اور وہی کام کرتی ہے جو جسم سے بذریعہ موت جدا

---

(۱) بخاری:۳۸۸۶

(۲) دلائل النبوۃ للبیہقی:۲/۳۵۵

ہونے بعد کرتی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ خرق عادت کے مقام پر تھے چنانچہ زندگی کی حالت میں آپ کا شکم چاک کیا گیا اور آپ کو اس کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔اس لئے آپ کی روح کو بغیر موت کے آسمان کی سیر کرائی گئی، لیکن دوسرے لوگوں کے حق میں یہ کام موت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ انبیاء کی روحیں بدن سے جدا ہو کر آسمان میں ہیں لیکن نبی ﷺ کی روح زندگی کی حالت میں ہی وہاں لے جائی گئی، پھر واپس آ گئی۔ وفات کے بعد انبیاء کی روحیں رفیق اعلی میں مستقر ہوگئی لیکن اس کے باوجود جسم سے اس کا ایک طرح کا تعلق ہے جس سے آپ سلام کا جواب دیتے ہیں اور جس سے موسی علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے اور آسمان میں بھی دیکھا تھا۔

کیونکہ یہ معلوم ہے کہ موسی علیہ السلام کو قبر سے اٹھا کر نہیں لے جایا گیا تھا، بلکہ ان کی روح کا وہ مستقر تھا اور قبر بدن کا مستقر ہے۔اگر کسی کے ادراک میں یہ بات نہ آ سکے تو وہ سورج پر غور کرے کہ وہ اپنی اونچائی کے باوجود زمین اور نباتات وحیوانات کی زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے، روح کا مرتبہ تو اس سے بھی بلند ہے۔علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ہجرت اور معراج کے درمیان ایک سال دو ماہ کا وقفہ تھا اور معراج ایک بار ہوئی۔ ایک قول میں دو مرتبہ ہوئی۔ایک بار بیداری میں اور ایک بار خواب میں۔اس قول کے حاملین کا خیال ہے کہ حدیث شریک اور آپ ﷺ کے فرمان ”پھر میں بیدار ہو گیا“

اوردوسری روایات کوجمع کیا جاسکتا ہے۔بعض نے کہا کہ تین بار واقعہ معراج ہوا۔لیکن یہ سب اقوال محض ایک تخمینہ ہیں اورضعیف روایات نقل کرنے والوں کے کارنامے ہیں۔ اورصحیح وہی ہے کہ جس پر ائمہ حدیث متفق ہیں کہ واقعہ اسراءایک ہی بار پیش آیا۔

بڑی تعجب کی بات ہے کہ ایک سے زائد بار کے قائلین نے کس طرح سوچ لیا کہ ہر مرتبہ آپ پر پچاس وقت کی نماز پیش کی جاتی رہی ۔حفاظ حدیث نے معراج کی حدیث کے الفاظ کے بارے میں شریک (راوی حدیث) کوغلط ٹھہرایا ہے اورامام مسلم نے اس حدیث کومستند ذکرکر کے کہا ہے کہ اس نے اس میں تقدیم وتاخیراورکمی وزیادتی کردی ہے اور پوری حدیث بھی بیان نہیں کی ہے،اوران کی رائے مناسب ہے۔

فصل (۵۷)

آپ ﷺ کے ہجرت کا واقعہ

ہجرت ایک ایسا واقعہ ہے جسے اللہ تعالی نے اپنے اولیاء اور اعداء کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے کی کسوٹی بنائی ہے، جس سے دین کا غلبہ اور انبیاء کرام کی نصرت کا آغاز ہوتا ہے۔

امام زہری نے محمد بن صالح اور انہوں نے عاصم بن عمران بن قتادہ اور یزید بن رومان وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نبوت کے ابتدائی ایام میں تین سال تک مکہ میں چھپ کر رہے پھر چوتھے سال اعلان عام کیا اور لوگوں کا دس سال تک دعوت اسلام دی۔ حج کے موسم میں آپ حجاج کی قیام گاہوں پر تشریف لے جاتے، نیز عکاظ، مجنہ اور ذی المجاز کے موسمی تہواروں اور بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور دعوت اسلام دیتے اور اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتے۔ اور یہ مطالبہ کرتے کہ لوگ آپ کو اپنی حمایت میں لے لیں تا کہ آپ اسلام کا پیغام اچھی طرح لوگوں تک پہنچا سکیں اور اس کے عوض انہیں اللہ تعالی کے ہاں جنت نصیب ہوگی لیکن آپ کو کوئی مددگار نہ ملتا نہ کوئی آپ کی دعوت قبول کرتا، پھر آپ ایک ایک قبیلہ کی اقامت گاہ پر جاتے اور فرماتے: ”اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو تو کامیاب رہو گے اور عرب قوم کے حاکم بن جاؤ

گے۔اس کلمے کے سبب عجم کے لوگ تمہارے تابع بن جائیں گے اور مرنے کے بعد جنت میں بادشاہ بن جاؤ گے"۔

ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے رہتا اور کہتا، خبردار اس شخص کی اطاعت نہ کرنا، یہ اپنے مذہب کا باغی اور جھوٹا ہے۔ چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کا شدت سے انکار کردیتے اور آپ کو ایذائیں دیتے اور کہتے کہ آپ کا خاندان اور قبیلہ آپ کو زیادہ جانتا ہے۔اس لئے انہوں نے آپ کی اتباع نہیں کی۔ آپ انہیں اللہ کی طرف دعوت دیتے چلے جاتے اور فرماتے "اے اللہ! اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے"۔

راوی کہتے ہیں کہ جن قبائل کے پاس نبی کریم ﷺ دعوت وتبلیغ کے لئے تشریف لے گئے، ان میں میں بعض کے نام یہ ہیں۔

بنو عامر بن صعصعہ، محارب بن خصفہ، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نضر، بنو البکاء، کندہ، کلب، الحارث بن کعب، عذرہ، الحضارمہ۔ لیکن ان میں سے کسی نے دعوت اسلام قبول نہیں کی۔

اہل مدینہ کو دعوت اسلام: اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کی نصرت کے لئے کچھ انتظامات کر رکھے تھے۔اوس وخزرج مدینہ میں دو قبائل تھے جو یہودیوں کے حلیف تھے اوران سے یہ سنا کرتے تھے کہ اس زمانے میں ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کی

ہم پیروی کریں گے اور تمہیں عاد اور ارم کی طرح قتل کریں گے، تمام عرب قبائل کی طرح مدینہ کے یہ دونوں انصاری قبیلے بھی یہودیوں کے علاوہ کعبہ مشرفہ کا حج کیا کرتے تھے۔ جب انصار مدینہ نے رسول اللہ ﷺ کو دعوت دین دیتے دیکھا تو اپنے احوال کا بغور مطالعہ کیا اور بعض انصاری کہنے لگے کہ خدا کی قسم لوگو! جانتے ہو؟ یہی وہ شخص ہیں جن کا نام لے کر مدینہ کے یہودی تمہیں دھمکایا کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر سبقت لے جائیں۔

سوید بن صامت اوس کا ایک آدمی تھا جو مکہ آیا ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے دعوت دی۔ اس نے نہ انکار کیا اور نہ اقرار کیا۔ اس دوران انس بن رافع، بنی عبدالاشہل کے چند نوجوانوں کے ہمراہ کسی معاہدہ کے لئے آیا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔

ایاس بن معاذ نامی ایک نوجوان کہنے لگا اے قوم! اللہ کی قسم! ہم جس کام کے لئے آئے ہیں، اس سے یہ (اسلام) بہت بہتر ہے۔ اس پر اسے انس نامی نوجوان نے ڈانٹا اور مارا تو وہ خاموش ہو گیا اور ان کا معاہدہ بھی مکمل نہ ہو سکا اور وہ مدینہ واپس چلے گئے۔

بیعت عقبہ اولی: پھر نبی کریم ﷺ حج کے موقعہ پر مقام عقبہ پر انصار کے چھ آدمیوں سے ملے جو خزرج کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: اسعد بن

زرارہ ، جابر بن عبداللہ، عوف بن الحارث ، رافع بن مالک ، عقبہ بن عامر، قطبہ بن عامر۔ نبی کریم ﷺ نے ان سب کو اسلام کی دعوت دی۔ یہ سبھی لوگ مشرف بہ اسلام ہوگئے اور مدینہ واپس چلے گئے ۔ وہاں انہوں نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی اور وہاں اسلام پھیلنا شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں اسلام داخل نہ ہوا ہو۔

آئندہ سال بارہ افراد پر مشتمل ایک قافلہ حاضر ہوا۔ چھ سابقہ میں سے صرف جابر بن عبداللہ نہ تھے۔ نیز ان کے ہمراہ معاذ بن الحارث جو عوف کے بھائی تھے، ذکوان بن عبدقیس بھی حاضر ہوئے اور یہ مکہ ہی میں مقیم ہو گئے ۔ بعد میں مدینہ ہجرت کی جس کی وجہ سے انہیں مہاجر انصاری کہا جاتا ہے۔ نیز عبادہ بن الصامت، یزید بن ثعلبہ، ابوالہیثم بن التیہان، عویمر بن مالک، ان بارہ افراد میں سے تھے۔

ابوزبیر جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حج کے ایام میں لوگوں کی قیامگاہوں پر تشریف لے جاتے ۔ اس طرح مجنہ وعکاظ کے بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے: ”کون ہے جو مجھ پر ایمان لائے ؟ میری حمایت ونصرت کرے کہ میں اللہ تعالی کا پیغام پہنچادوں ؟ اس کے عوض اسے جنت ملے گی“۔ لیکن کسی کو بھی حامی وناصر نہ پاتے اور یہ حال ہوگیا کہ کوئی آدمی مصر یا یمن سے اپنے

رشتہ داروں سے ملنے آتا تو آپ کی قوم اس کے پاس آتی اور کہتی: دیکھنا بچنا، قریش کا یہ نوجوان تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دے۔ لیکن آپ ﷺ ان لوگوں میں تشریف لے جاتے اور انہیں دین اسلام کی دعوت دیتے اور قریش آپ کی طرف انگلیوں سے اشارے کر رہے ہوتے تا آنکہ اللہ تعالی نے یثرب (مدینہ) سے ''انصار'' بھیجا، ہم میں سے کچھ لوگ آپ کے پاس آتے، ایمان لانے کے بعد قرآن سیکھ کر واپس جاتے تو اپنے گھر والوں کو مسلمان بناتے، پھر ہم نے اکٹھا ہو کر سوچا کہ آخر کب تک رسول اللہ ﷺ مکہ کی پہاڑیوں میں در بدر رہیں گے۔ یہ سوچ کر ہم حج کے موقع پر مکہ آئے اور بیعت عقبہ کی۔ آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں یثرب والوں کو جانتا تو ہوں لیکن ان لوگوں سے میری گہری واقفیت نہیں کہ کون ہیں۔ پھر ہم میں سے ایک ایک سے دو دو آدمی ان کے پاس جمع ہو گئے۔ ہماری شکل دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ہم انہیں نہیں پہچانتے ہیں۔ یہ نوجوان لوگ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم کس چیز پر بیعت کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر حالت میں خواہ سستی ہو یا چستی، تنگی ہو یا فراخی، سمع وطاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہنے پر نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ملامت کی پرواہ کئے بغیر، حقوق اللہ کی ادائیگی پر، اور اس بات پر کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو میری مدد کرو اور جس طرح تم اپنی جان اور

اپنے اہل وعیال کی حفاظت و مدافعت کرتے ہو، اسی طرح میری مدافعت کرو اور اس کے بدلہ میں تمہیں جنت ملے گی۔ جب ہم بیعت کے لئے کھڑے ہوئے تو اسعد بن زرارہ نے جو ان میں سب سے چھوٹی عمر کے تھے۔ آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اہل یثرب ٹھہرو، ہم آپ کے پاس اونٹوں پر سوار ہو کر یہ جاننے کے بعد آئے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آج آپ کو نکالنے کا معنی پورے عرب سے جدائی اور ان کی تلواروں کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے اگر تم اس پر صبر کر سکتے ہو تو آپ ﷺ کو لے چلو۔ اللہ تمہیں اجر دے گا اور اگر تمہیں اپنی جان کا خوف ہو تو پھر آپ کو چھوڑ دو۔ آپ اللہ کے یہاں تمہیں معذور سمجھیں گے۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا: ہاتھ اٹھاؤ ہم اس بیعت کو چھوڑ نہیں سکتے، نہ اس سے چھٹکارہ ڈھونڈنے کی سوچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم میں سے ایک ایک آدمی نے کھڑے ہو کر بیعت کی اور آپ نے ہر ایک کو جنت کی بشارت دی (۱)، پھر یہ لوگ مدینہ واپس آ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ ابن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر کو بھیجا، جو لوگوں کو قرآن سکھاتے تھے اور اسلام کی دعوت پھیلاتے تھے۔ یہ دونوں اسعد بن زرارہ کے مہمان تھے۔ حضرت مصعب ان کے امام تھے۔

جب مسلمانوں کی تعداد چالیس ہو گئی تو انہیں حضرت مصعب بن عمیر نے جمعہ بھی

(۱) مسند احمد: ۳۲۲/۳

پڑھانا شروع کیا۔ان دونوں اصحاب کے ہاتھ پر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، انہی میں اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ ہیں ۔ان کے مسلمان ہونے کے بعد بنو عبدالاشہل کے تمام لوگ مسلمان ہو گئے صرف اصیرم باقی رہ گئے تھے جنہوں نے احد کے دن اسلام قبول کیا اور جہاد میں حصہ لے کر شہادت سے مشرف ہوئے ۔انہیں ایک وقت کی بھی نماز ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔انہی کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''تھوڑا عمل کیا اور زیادہ اجر پائے'' (۱) اور اسلام تیزی سے مدینہ میں پھیلنے لگا اور غالب ہونے لگا۔اس کے بعد مصعب مکہ واپس آ گئے ۔اس سال حج کے موقع پر انصار مدینہ کی بڑی تعداد، خواہ مسلمان ہوں یا مشرک مکہ آئے اور ان کے سردار براء بن معرور بھی شریک ہوئے ۔ وہ عقبہ کی آخری شب میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ یہ معاملہ میں سبقت لے گئے اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ اس شب میں نبی کریم ﷺ نے ان میں سے بارہ اشخاص کو بطور نقیب منتخب کیا۔ جب بیعت مکمل ہو گئی تو لوگوں نے عقبہ میں آباد مشرکین پر حملہ کی اجازت مانگی۔لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔اس موقع پر شیطان نے چیخ کر کہا: اہل جباجب! کیا تمہیں معلوم ہے

(۱) بخاری:۲۸۰۸، مسلم:۱۹۰۰

کہ محمد (ﷺ) اور ان کے بے دین ساتھی تم سے جنگ کے لئے اکٹھے ہوگئے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ عقبہ کا شیطان ہے، اے دشمن خدا! میں تیرے لئے فارغ ہوں گا'' (۱) پھر آپ نے لوگوں سے اپنے اپنے خیموں میں جانے کے لئے کہا۔ صبح کو اشراف قریش آئے اور انصار سے کہا: ہمیں معلوم ہوا کہ تم لوگوں نے رات محمد (ﷺ) سے مل کر ہمارے خلاف جنگ کا معاہدہ کیا ہے۔ بخدا! عرب کے تمام قبائل کے مقابلہ میں تمہارے ساتھ جنگ کو ہم زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ یہ سن کر مشرکین قسم کھا کر کہنے لگے کہ ایسا نہیں ہوا ہے۔ ابن ابی نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ میری قوم میرے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کرسکتی۔ اگر میں یثرب میں ہوتا تو مجھ سے مشورے کے بغیر میری قوم ایسا نہ کرتی۔ یہ سن کر قریش کے لوگ لوٹ گئے۔

براء رضی اللہ اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بطن یأجج کی طرف چلے گئے۔ قریش کے لوگ ان کی تلاش میں نکلے اور سعد بن عبادہ کو پکڑ لیا اور مارتے ہوئے مکہ لے آئے۔ پھر مطعم بن عدی اور حارث بن حرب بن امیہ نے آکر انہیں چھڑایا۔

انصار نے ان کی گمشدگی کے بعد مشورہ کیا کہ واپس لوٹیں۔ اس دوران وہ نظر آئے، پھر ان کے ساتھ سب لوگ مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اب نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دی اور لوگ تیزی سے

ہجرت کرنے لگے۔ سب سے پہلے وہاں کے لئے ابو سلمہ اور ان کی بیوی روانہ ہوئے لیکن ان کی بیوی ام سلمہ کو روک دیا گیا اور ایک سال تک قید میں رکھا گیا۔ نیز ان کا بچہ بھی ان سے الگ کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد یہ اپنے بچے کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئیں اور عثمان بن ابی طلحہ ان کے مرافق تھے۔

اس کے بعد لوگ کثرت سے یکے بعد دیگرے مدینہ جانے لگے۔ آخر مکہ میں رسول اللہ ﷺ، ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔ جو آپ کے حکم کی بنا پر وہاں ٹھہرے ہوئے تھے یا وہی لوگ رہ گئے تھے جن کو مشرکین نے قید کر رکھا تھا، نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر پوری ہجرت کی تیاری کر کے اللہ تعالی کی طرف سے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

جب مشرکین نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام مدینہ ہجرت کر چکے ہیں اور اپنے اہل وعیال اور مال ودولت لے کر مدینہ منورہ جا چکے ہیں، انہیں یقین ہو گیا کہ مدینہ ان کے لئے دارالامن بن چکا ہے جس کے باشندے طاقت وقوت رکھتے ہیں تو انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ وہیں تشریف نہ لے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ معاملہ سنگین صورت اختیار کر لے گا چنانچہ وہ دارالندوہ میں (بغرض مشورہ) جمع ہوئے۔ اس موقع پر ابلیس نجدی بوڑھے کی شکل وصورت میں کمبل اوڑھے شریک ہوا۔ ان سب

نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ ہر آدمی اپنی رائے پیش کرتا لیکن یہ بوڑھا (ابلیس) اسے رد کر دیتا اور اس پر رضا مندی ظاہر نہ کرتا۔ آخر ابوجہل کہنے لگا: میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی ہے جس تک ابھی تمہارا ذہن نہیں پہنچ سکا۔ سب کہنے لگے، وہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، میرا خیال ہے کہ ہم قریش کے ہر قبیلہ کا ایک مضبوط اور نوجوان آدمی لیں پھر انہیں تیز تلواریں دیں اور وہ یکبارگی ایک آدمی کی طرح محمد (ﷺ) پر ٹوٹ پڑیں۔ اس طرح ان کا خون قبائل میں منقسم ہو جائے گا۔ اس کے بعد بنی عبد مناف کی کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ اب کیا کیا جائے۔ کس سے انتقام لیں۔ کیونکہ تمام قبائل سے دشمنی مول لینا ان کے لئے محال ہوگا۔ آخر ہم سب مل کر ان کی دیت ادا کر دیں گے۔ بوڑھا (ابلیس) کہنے لگا اس نوجوان نے کیا خوب کہا۔ خدا کی قسم! رائے ہے تو یہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس عہد کے بعد یہ لوگ منتشر ہو گئے۔ اس وقت جبریل علیہ السلام نے آ کر آپ کو اس کی اطلاع دی اور ہدایت کی کہ اس شب اپنے بستر پر نہ لیٹیں۔

نبی کریم ﷺ دوپہر کی وقت چہرہ ڈھانکے ہوئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لائے، یہ تشریف آوری بالکل خلاف معمول تھی۔ آتے ہی آپ نے فرمایا، جو بھی آدمی ہوں انہیں باہر نکالو۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ ہی کے

گھر کے لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا، اللہ تعالی نے مجھے یہاں سے ہجرت کا حکم فرمایا ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان، میرے پاس دو سواریاں ہیں۔ایک قبول فرمائیے۔آپ نے فرمایا قیمت دے کر لوں گا اور علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا آج کی رات میرے بستر پر سو جائیں۔

ادھر قریش کے منتخب لوگ جمع ہو کر دروازے کی نگرانی کرنے لگے کہ موقع پاتے ہی ٹوٹ پڑیں۔یہ باہم مشورہ کرنے لگے کہ کون سب سے بڑا بد بخت اور شقی ہوگا جو یہ کام انجام دے گا۔

جناب رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ایک مٹھی کنکری لے کے ان کے سروں پر پھینک دی۔کیفیت یہ تھی کہ وہ آپ کو دیکھ نہیں رہے تھے اور آپ یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے:

﴿وَجَعَلْنَا مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ [یس:۹]

اور ہم نے ان کے سامنے اور پیچھے آڑ کر دی اور ان پر غشی طاری کر دی جس سے وہ دیکھ نہ سکے۔

پھر دونوں حضرات شب ہی میں گھر سے باہر نکلے، اس کے بعد ایک شخص نے

لوگوں کو نبی کریم ﷺ کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پوچھا، کس کا انتظار کررہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا محمد (ﷺ) کا، وہ کہنے لگا تم ناکام ونامراد رہے، اللہ کی قسم وہ تمہارے قریب سے گزر کر جاچکے ہیں اور تمہارے سر پر مٹی ڈال کر گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے، اللہ کی قسم! ہم نے انہیں نہیں دیکھا اور اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اٹھے۔

جب صبح ہوئی تو علی رضی اللہ عنہ بستر سے اٹھے، کفار نے علی سے نبی کریم ﷺ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا، میں کیا جانوں۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر غار ثور کی طرف تشریف لے گئے اور اس میں داخل ہوگئے تو اللہ تعالی نے مکڑی کو بھیجا، اس نے غار پر جالا بن دیا۔(۱)

عبداللہ بن اریقط لیثی کو جو ایک ماہر راہ نما مشرک تھا، اجرت پر لے لیا اور اس کو امین سمجھ کر آپ نے دونوں سواریاں اس کے حوالے کیں اور تین دن کے بعد غار ثور پر ملنے کا وعدہ فرمایا۔ ادھر قریش نے آپ لوگوں کی جستجو میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور نشان قدم کے ماہرین کی مدد سے غار تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور وہاں ٹھہر کر اسے دیکھنے لگے۔

(۱) مسند احمد: ۱/ ۳۴۸، یہ روایت حسن ہے۔

عامر بن فہیرہ بکریاں چرانے کے بہانے آپ کے پاس آیا کرتے اور دودھ اور مکہ کی خبریں پہنچا دیا کرتے تھے۔اس طرح تین دن غار میں مقیم رہے یہاں تک کہ تلاش اور جستجو کی مہم سرد پڑ گئی۔اس کے بعد عبداللہ بن اریقط دونوں سواریاں لے کر حاضر ہو گیا اور سفر شروع ہو گیا۔ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عامر بن فہیرہ کو اپنے پیچھے بٹھالیا اور رہنما ان کے سامنے چلنے لگا اور اس طرح اللہ تعالی کی حفاظت اور نصرت کے سایہ میں یہ قافلہ نبوی رواں دواں ہو گیا۔

جب کفار آپ کی گرفتاری سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے آپ کی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کرنے والوں کے لئے انعام کا اعلان کر دیا، چنانچہ لوگوں نے اس کے بعد غیر معمولی سرگرمی سے تلاش شروع کر دی لیکن اللہ تعالی کی تدابیر بالا و برتر تھیں۔ جب آپ لوگ بنی مدلج کے ایک محلے کے پاس سے گزرے تو محلے کے ایک آدمی نے انہیں دیکھ لیا اور لوگوں سے کہا کہ میں نے ساحل پر چند سایے دیکھے ہیں۔میرا خیال ہے کہ وہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

سراقہ یہ سن کر تاڑ گیا اور سوچا کہ کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہے، کہنے لگا کہ نہیں، وہ فلاں فلاں لوگ اپنی کسی ضرورت سے گئے تھے، تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ اپنے خیمہ میں داخل ہوا اور خادم سے کہا کہ خیمہ کے پیچھے سے گھوڑا نکالو۔ میں تمہیں ٹیلے کے پیچھے ملوں گا۔

پھر اپنا نیزہ اٹھایا اور بالائی حصہ نیچے کر کے زمین پر لکیر بناتا ہوا گھوڑے تک پہنچا اور سوار ہو کر چل پڑا۔ جب آپ لوگوں سے قریب ہو گیا تو نبی کریم ﷺ کی تلاوت کی آواز سننے لگا اور آپ یکسو ہو کر قراءت میں مشغول تھے اور حضرت ابوبکر بار بار مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! سراقہ ہمارے پاس آ پہنچا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے بددعا کی اور اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر کہنے لگا، مجھے معلوم ہے کہ کس جرم کی مجھے سزا ملی ہے، یہ آپ کی بددعا کا نتیجہ ہے میرے لئے اللہ تعالی سے دعا کیجیئے، میں عہد کرتا ہوں کہ لوگوں کو آپ کی تلاش سے واپس کر دوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اور وہ آزاد ہو گیا۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے ایک تحریر مرحمت فرما دیجیئے۔ آپ کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چمڑے پر ایک تحریر لکھ دی (۱) یہ تحریر فتح مکہ تک سراقہ کے پاس موجود تھی۔ اسے لے کر جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور فرمایا کہ آج وفاداری اور بھلائی کا دن ہے۔ سراقہ نے تحریر حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کے سامنے توشہ اور سواری پیش کی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کی ہمیں ضرورت نہیں، البتہ تعاقب کرنے والوں کو تاریکی میں رکھو۔ سراقہ نے کہا میں ضرور ایسا کروں گا۔ آپ

(۱) بخاری:۳۹۰۶، مسلم:۲۰۰۹

لوگ مطمئن رہیں۔

وہ واپس لوٹا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ جستجو میں لگے ہیں۔ سراقہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے لئے واضح خبر لایا ہوں۔ وہ لوگ ادھر نہیں ہیں، دیکھیں یہ شخص دن کی ابتدا میں آپ کا دشمن تھا اور دن کے آخر میں آپ کا جاں نثار بن چکا تھا۔

پھر آپ ﷺ چلتے رہے یہاں تک کہ ام معبد الخزاعیہ الکعبیہ کے خیموں کے پاس سے گزرے اور ان سے کھانا طلب کیا۔ اس نے عرض کیا اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم آپ کی مہمان نوازی سے محروم نہ رہتے۔ نبی کریم ﷺ نے خیمے ایک طرف بکری دیکھی۔ آپ نے فرمایا کیا یہ دودھ دیتی ہے؟ ام معبد نے کہا کہ یہ بے حد کمزور اور لاغر بکری ہے۔ اس کی وجہ سے چرنے نہیں جا سکی۔ بھلا یہ دودھ کیسے دی گی؟ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور اس کے تھن پر ہاتھ لگایا اور بسم اللہ پڑھ کر دوہنا شروع کیا۔ برتن جھاگ سے بھر گیا تو آپ نے ام معبد اور اپنے اصحاب کو پلایا پھر خود نوش فرمایا۔ اس کے بعد دوبارہ دودھ دوھ کر وہیں چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔

ادھر مکہ میں ایک آواز سنائی دینے لگی، کوئی بلند آواز سے چند اشعار پڑھ رہا تھا مگر نظر نہ آتا تھا:

جَزَى اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيرَ جَزَائِهِ رَفِيقَينِ حَلَّا خَيمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدٍ

اللہ لوگوں کا مالک ان دونوں ساتھیوں کو بہترین جزادے جو ام معبد کے خیمہ میں اترے۔

اسماء رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرف گئے ہیں لیکن مکہ کے نشیبی حصہ میں سے کسی جن نے آ کر ان اشعار کو سنایا۔ لوگ اس کے پیچھے آواز سن کر چلتے لیکن کسی کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ پھر وہ بالائی حصہ سے نکل گیا۔

اسماء کہتی ہیں کہ ان اشعار کو سن کر ہم نے سمجھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے ہیں۔

فصل (۵۸)

آپ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری

انصار کو معلوم ہو چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ ہر روز مدینہ سے نکل کر دو پہر تک آپ کا انتظار کرتے۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو گھروں کو واپس آ جاتے۔

بعثت کے تیرہویں سال ۱۲/ ربیع الاول کو وہ لوگ حسب عادت آپ ﷺ کے انتظار میں نکلے تھے۔ جب دھوپ تیز ہوگئی تو وہ لوٹ آئے۔ اتفاق سے اس وقت ایک یہودی کسی ضرورت سے کسی ٹیلے پر چڑھا تو اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء کے سفید کپڑوں کو چمکتے ہوئے دیکھا، جن کے آگے بڑھنے سے سراب زائل ہو رہا تھا۔ وہ زور سے چیخا: اے بنی قیلہ! یہ ہیں تمہارے سردار اور بزرگ جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

انصار نے جلدی سے ہتھیار سنبھال لئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کا شایان شان استقبال کریں اور (مرحبا اہلا وسہلا) کی آوازیں بنی عمرو بن عوف کے محلے سے گونجنے لگیں اور مسلمانوں نے آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خوشی میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے اور شان نبوت کے مطابق خوش آمدید کہا (۱) انہوں نے پروانوں کی طرح آپ کو گھیر

(۱) بخاری: ۳۹۰۶

لیا۔اس موقع پرآپ مکمل سکون وطمانینت سے تھےاوراس آیت کریمہ کا نزول ہورہا تھا:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾ التحریم[۴:]

بے شک اللہ ہی اس کا رفیق ہےاور جبریل اور نیک مسلمان اوراس کے بعد فرشتے مددگار ہیں۔

پھرآپ ﷺ روانہ ہوکر بنی عمرو بن عوف کے علاقے قبا میں کلثوم بن ہدم یا سعد بن خیثمہ کے یہاں اترے۔ پہلاقول زیادہ راجح ہے۔چنانچہ آپ ﷺ یہاں چودہ راتیں قیام پذیر رہےاوراسی اثناء مسجد قبا کی تعمیر فرمائی اورنبوت کے بعد یہ سب سے پہلی مسجد تھی جس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔[بخاری:۳۹۰۵]

جب جمعہ کا دن آیا تو آپ اللہ کے حکم کے مطابق سوار ہوئے اورمحلّہ بنی سالم بن عوف میں پہنچےتو جمعہ کی نماز کا وقت ہوگیا۔بطن وادی کی مسجد میں آپ ﷺ نے جمعہ کی نماز پڑھائی، پھرسوار ہوکرروانہ ہوئے۔جاں نثاروں نے اونٹنی کی مہار پکڑ لی اور کہنے لگے کہ آپ ایسی جگہ اتریں جہاں سازوسامان اور طاقت وقوت کی فراوانی ہو۔آپ نےفرمایا کہ اس کا راستہ چھوڑ دو کہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔جس جگہ مشیئت ہوگی، وہیں بیٹھ جائے گی۔اونٹنی چلتی رہی۔ ہر انصاری سراپا تمنا تھا کہ آپ ﷺ اس کے

غریب خانہ پر قیام فرمائیں۔ جب لوگ اپنی خواہش کا اظہار کرتے تو آپ فرماتے کہ چھوڑ دو یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے۔

اونٹنی چلتے چلتے مسجد نبوی کی جگہ بیٹھ گئی لیکن آپ اترے نہیں۔ اونٹنی کھڑی ہوئی اور تھوڑی دور چل کر واپس ہوئی اور پہلی جگہ پر پھر بیٹھ گئی۔ اب آپ ﷺ نیچے اترے۔ یہ جگہ بنو نجار میں آپ کے ننھیالی رشتہ داروں کی تھی۔ اللہ تعالی نے انہیں یہ توفیق دی اور یہ اعزاز بخشا۔ اس کی مشیت یہ تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف انہی کو ملے۔ یہ لوگ آپ (ﷺ) سے اپنے یہاں اترنے کی درخواست کرنے لگے۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور سواری کا کجاوہ اپنے گھر میں داخل کرلیا تو آپ فرمانے لگے: آدمی اپنے کجاوے کے ساتھ ہے، اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور آپ کی اونٹنی کو تھام لیا اور وہ انہی کے پاس رہی۔(۱) آپ کے مدینہ میں قیام کا قیس بن حرمہ انصاری کے اشعار میں یوں ذکر ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس جا کر ان اشعار کو حفظ کیا تھا۔

ثَوَى فِي قُرَيشٍ بِضعَ عَشرَةَ حَجَّةً　　　يُذَكِّرُ لَو يَلْقَى حَبِيبًا مَوَاتِيًا

قریش میں آپ نے دس سال سے زائد قیام فرمایا اور چاہا کہ کوئی دوست اور حامی

---

(۱) بخاری:۳۹۱۱

مل جائے۔

ویعرض في أهل المواسم نفسه　　فلم یر من یؤوي ولم یر داعیا

حج وغیرہ کے اجتماعات میں آپ خود کو لوگوں کی سامنے پیش کرتے تھے لیکن کوئی ٹھکانہ یا دعوت دینے والا نہ ملا۔

فلما أتانا واستقرت به النوی　　وأصبح مسرورا بطیبة راضیا

جب آپ ہمارے یہاں مقیم ہو گئے تو مدینہ میں راضی خوشی رہنے لگے۔

وأصبح لا یخشی ظلامة ظالم　　بعید ولا یخشی من الناس باغیا

اور آپ ﷺ کو کسی کے ظلم اور زیادتی کا اندیشہ باقی نہ رہا

بذلنا له الأموال من حل مالنا　　وأنفسنا عند الوغی والتأسیا

تو ہم نے لڑائی وغیرہ کے مواقع پر آپ کے لئے جان و مال کی قربانی پیش کی۔

نعادي الذی عادی من الناس کلهم　　جمیعا وإن کان الحبیب المصافیا

ہمارا دوست بھی اگر آپ سے دشمنی رکھے تو ہم اس کے دشمن ہیں۔

ثَوَی ونعلم أن الله لا رب غیره　　وإن کتاب الله أصبح هادیا

ہمارا یقین ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور اس کی کتاب ہماری رہنما ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں تھے تو آپ کو ہجرت کا

حکم دیا گیااور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَاناً نَّصِيراً﴾ [الإسراء: ٨٠]

کہہ دیجیئے کہ اے ہمارے رب! مجھے جہاں لے جا اچھی طرح لے جا اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال اور میرے لئے اپنے پاس سے غلبہ اور امداد مقرر فرما۔

قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے آپ کو مکہ سے مدینہ کی طرف اچھی جگہ نکال دیا اور نبی کریم ﷺ کو اس کا علم تھا کہ یہ کام بغیر اللہ تعالی کی نصرت وقوت کے نہیں ہوسکتا تھا۔اسی لئے آپ نے سلطان نصیر کے لئے دعا مانگی۔

اللہ تعالی نے آپ کو مکہ ہی میں دارالھجر ت کا مشاہدہ کرادیا تھا۔آپ نے ارشاد فرمایا، مجھے تمہاری ہجرت کا مقام دکھادیا گیا۔ جو کھجور کے درختوں والی شورزمین میں سیاہ کنکریوں والے دوحصوں کے مابین واقع ہے۔(۱)

براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے ہمارے پاس سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم تشریف لائے۔ یہ دونوں بزرگ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے لگے پھر عمار بن یاسر، بلال واسعد (رضی اللہ عنہم) تشریف لائے۔ ان کے بعد

(۱)ترمذی:۳۱۳۸

عمر رضی اللہ عنہ بیس سواروں کے ساتھ تشریف لائے۔ان کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کو اس قدر کبھی بھی فرحت وخوشی نہ ہوئی، جس قدر آپ کی تشریف آوری کے باعث ہوئی ، یہاں تک کہ عورتوں ،بچوں اور لونڈیوں کو کہتے دیکھا، یہ اللہ کے رسول تشریف لا چکے۔(۱) بہر حال آپ ﷺ ابوایوب کے گھر قیام پذیر تھے تا آنکہ حجرے اور مسجد کی تعمیر ہوگئی۔ زید بن حارثہ اور ابورافع کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر مکہ بھیجا، چنانچہ یہ دونوں آپ کی دونوں صاحبزادیوں فاطمہ اور ام کلثوم نیز ام المؤمنین سودہ بنت زمعہ اور اسامہ بن زید اور ان کی والدہ ام ایمن کو لے کر واپس آگئے۔(۲)

البتہ زینب کو ان کے خاوند ابوالعاص بن ربیع نے نہ آنے دیا۔عبداللہ بن ابی بکر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال کو لے کر چلے آئے جن میں عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ یہ سب لوگ حارثہ بن نعمان کے گھر میں اترے۔(۳)

---

(۱) بخاری نے معلقاً ذکر کیا ۲۲۹۷

(۲) بخاری:۳۹۲۵

(۳) الطبقات الکبری لابن سعد:۱/ ۲۳۷

فصل (۵۹)

آپ ﷺ کا مسجد نبوی کی تعمیر کا طریقہ

امام زہری فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی مسجد والی جگہ پر بیٹھ گئی۔اس وقت مسلمان یہاں نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن یہ جگہ دو یتیم انصاری لڑکوں، سہل اور سہیل کی ملکیت میں تھی جن کی پرورش اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھی۔ نبی کریم ﷺ نے ان لڑکوں سے زمین کی فروخت اور پھر تعمیر مسجد کے متعلق گفتگو کی۔وہ دونوں کہنے لگے، نہیں بلکہ یا رسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں اسے مسجد کے لئے ہبہ کرتے ہیں۔آپ نے اسے منظور نہ فرمایا بلکہ دس دینار ادا کر کے زمین خرید لی۔اس میں اس وقت صرف چار دیواریں تھیں، چھت نہ تھی اور اس کا قبلہ رخ بیت المقدس کی جانب تھا اور نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اسعد بن زرارہ یہیں مسلمانوں کو نماز اور جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور اس میں غرقد اور کھجور کے درخت تھے اور مشرکین کی قبریں تھی۔رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق مشرکین کی چند قبریں اکھاڑ دی گئیں۔کھجور اور دوسرے درخت کاٹ دیئے گئے اور قبلہ کی طرف سے مسجد ہموار کی گئی۔مسجد کے قبلہ سے پیچھے تک اس کا طول سو گز اور باقی دونوں جانب بھی اسی قدر یا اس سے کچھ کم تھا۔ بنیادیں تقریباً تین گز تھیں۔اس کے بعد کچی اینٹوں سے مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔رسول

اللہ ﷺ بھی تعمیر میں حصہ لیتے اور اینٹیں اور پتھر اٹھا کر لاتے اور لے جاتے ہوئے آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ   فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَة

اے اللہ! زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے۔ پس انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

آپ یہ بھی پڑھتے تھے:

هَذَا الْحِمَالُ لَا حِمَالَ خَيْبَرَ   هَذَا أَبَرُّ رَبِّنَا وَأَطْهَرَ

یہ خیبر سے آنے والی کھجور اور غلہ وغیرہ کا بوجھ نہیں بلکہ اینٹوں کا بوجھ ہے اور یہی خیر اور پاکیزگی کا باعث ہے۔

صحابہ کرام بھی اینٹیں ڈھوتے ہوئے رجز پڑھتے تھے۔ بعض لوگ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالرَّسُوْلُ يَعْمَلُ   لِذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

اگر ہم بیٹھے رہیں اور رسول کام کریں تو یہ ہماری غلطی ہوگی۔

اس مسجد کا قبلہ بیت المقدس کی طرف کیا گیا اور تین دروازے بنائے گئے۔ ایک دروازہ پیچھے، دوسرا جسے باب الرحمہ کہتے ہیں اور تیسرا وہ جس سے نبی کریم ﷺ

تشریف لاتے تھے،ستون کھجور کے تنے سے بنائے گئے اور چھت کھجور کے پتوں سے بنائی گئی۔عرض کیا گیا آپ ﷺ اس کی چھت نہ ڈالیں گے۔آپ نے فرمایا کہ نہیں، موسی علیہ السلام کے چھپر کی طرح رہے گی۔

آپ نے مسجد سے متصل کچی اینٹوں سے ازواج مطہرات کے لئے حجرے تعمیر کروائے اوران پر کھجور کے پتوں اور شاخوں کی چھت ڈلوائی۔جب اس کام سے فارغ ہو گئے تو مسجد کے مشرقی حصہ سے متصل عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے لئے جو حجرہ بنایا گیا تھا اس میں آپ نے ازدواجی زندگی کی ابتدا فرمائی اور سودہ رضی اللہ عنہا کے لئے دوسرا حجرہ تعمیر کروایا گیا۔(۱)

پھر آپ نے مہاجرین وانصار کے مابین اخوت کا رشتہ قائم کیا۔یہ کل نوے آدمی تھے نصف مہاجرین میں سے اور نصف انصار سے۔غزوہ بدر تک یہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔پھر جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَأُوْلُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ ﴾[الأحزاب:٦]

رشتہ داروں میں سے بعض بعض کے زیادہ مستحق ہیں۔

تو مرنے کے بعد توارث کا معاملہ صرف اقارب تک محدود ہو گیا۔ایک قول یہ بھی

(۱) طبقات ابن سعد:۱/۲۴۰

ہے کہ آپ ﷺ نے دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی اور اس دوسری مرتبہ میں علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا۔لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ کی اخوت کے زیادہ مستحق ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ ''اگر زمین والوں میں سے کسی کو میں دوست بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا لیکن وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں''۔(۱)

یہ اخوت اگرچہ عام تھی جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میں اپنے بھائیوں کو دیکھنے کا خواہشمند ہوں''۔صحابہ نے پوچھا کہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ آپ نے فرمایا ''تم میرے ساتھی ہو۔میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھ پر بغیر دیکھے ایمان رکھیں گے''۔(۲)

لیکن اس عمومیت کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق اعلی مقام پر فائز تھے۔اس طرح مصاحبت کا بھی اعلی مرتبہ آپ ہی کو حاصل تھا۔

نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے یہود سے معاہدہ صلح کیا اور ایک عہدنامہ لکھا گیا اور یہودیوں کے ایک بڑے عالم عبداللہ بن سلام نے اسلام قبول کیا(۳) لیکن عام یہودی

---

(۱) بخاری:۴۶۶، مسلم:۲۳۸۲

(۲) مسلم:۲۴۹

(۳) بخاری:۳۹۳۸

کفر پر قائم تھے۔

قوم یہود کے تین قبیلے تھے۔بنوقینقاع،بنونضیراور بنو قریظہ۔تینوں نے آپ ﷺ سے جنگ کی۔آپ نے بنوقینقاع پر احسان فرمایا،بنونضیر کو جلا وطن کردیا اور بنوقریظہ قتل کئے گئے اوران کی اولاد کو غلام بنالیا گیا۔بنونضیر کے متعلق سورہ حشر اور بنو قریظہ کے متعلق سورہ احزاب نازل ہوئی۔

مدینہ میں آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے اورحضرت جبریل سے یہ فرمایا تھا کہ میری تمنا ہے کہ اللہ تعالی میرے رخ کو یہود کے قبلہ سے پھیر دے۔انہوں نے کہا کہ میں تو بندہ ہوں۔آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اوراس کا سوال کیجئے۔یہ سن کرآپ امید باندھے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے۔پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ﴾[البقرة:١٤٤]

ہم آپ کے آسمان کی طرف رخ کرنے کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ واقعہ مدینہ تشریف آوری کے سولہ ماہ بعد غزوہ بدر سے دو ماہ قبل پیش آیا(١) اس میں بڑی حکمتیں تھیں اوراصل میں یہ مسلمانوں،مشرکوں،یہودیوں اور منافقوں کا ایک

(١) بخاری:٣٩٩،مسلم:٥٣٥

امتحان تھا، مسلمانوں کے لئے تو یہ چیز مشکل نہ تھی۔ خدا کی ہدایت کی وجہ سے انہوں نے یہ کہا کہ ہم ایمان لے آئے، سب کچھ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے۔ مشرکین کہنے لگے کہ جس طرح قبلہ کی طرف لوٹے ہیں، اسی طرح جلد ہی ہمارے مذہب کو بھی اختیار کرلیں گے اور ہمارے قبلہ کی طرف واپس اس کے برحق ہونے کی دلیل ہے۔

یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ انہوں نے سابقہ انبیاء کے قبلہ کی مخالفت کی۔ منافقین کا یہ کہنا تھا کہ ہم نہیں جانتے کہ کدھر رخ کریں؟ اگر پہلا حق تھا تو اسے تو انہوں نے چھوڑ دیا اور اگر دوسرا حق ہے تو اب تک یہ باطل پر تھے۔ اس طرح ان نادانوں کی طرف سے باتیں بنائی گئیں، اللہ تعالی نے خود فرما دیا تھا کہ:

﴿وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾[البقرة:١٤٣]

بے شک یہ تبدیلی ہدایت یافتہ لوگوں کے علاوہ دوسروں کے حق میں یقیناً بڑی تھی۔

بلا شبہ اللہ تعالی کی جانب سے اچھے بندوں کا یہ امتحان تھا تا کہ دیکھے کہ کون رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔

چونکہ قبلہ کا معاملہ ایک عظیم واقعہ تھا اس لئے اللہ تعالی نے بطور تمہید اس سے پہلے نسخ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب وہ کسی حکم کو ختم کرتا ہے تو اس جیسا یا اس سے اچھا دوسرا حکم لے آتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کی سرزنش کی جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہٹ دھرمی

کرتے ہیں اور آپ کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے ۔ پھر اللہ تعالی نے یہود ونصاری کے اختلاف کا ذکر کر کے بتایا کہ یہ آپس میں کہا کرتے ہیں کہ تم کسی طریقے پر نہیں ہو اور بندوں کو ان کی موافقت کرنے اور خواہشات کی اتباع سے منع فرمایا۔اس کے بعد ان کے کفر وشرک کو بیان کیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا ہے۔

پھر اللہ تعالی نے بتایا کہ مشرق ومغرب اسی کا ہے اور بندے جدھر اپنا رخ کرتے ہیں وہ اس طرف اس کا رخ ہوتا ہے ۔ وہ وسعت اور علم والا ہے ۔ اس کی عظمت ووسعت اور احاطہ کا تقاضا ہے کہ بندہ جدھر رخ کرے ادھر اس کا رخ ہو۔ پھر بتایا کہ رسول سے ان دوزخیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جنھوں نے ان کی پیروی نہیں کی۔

پھر بتایا کہ اہل کتاب نبی کریم ﷺ سے تب تک راضی نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ان کی اطاعت نہ کریں اور انہوں نے ایسا کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی کارساز نہ ہوگا اور نہ مددگار، اس کے بعد اہل کتاب پر کئے گئے انعامات کو یاد دلایا اور اپنے عذاب سے ڈرایا پھر بیت اللہ کے معمار حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا تذکرہ اور ان کی مدح وتعریف فرمائی اور بتایا کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کا امام بنایا۔اس کے بعد اپنے گھر بیت الحرام کا اور حضرت ابراہیم کی تعمیر کا تذکرہ کیا اور انہیں دنیا کا ''امام'' بنایا ہے اور بیت اللہ

کو بھی ان سب کا قبلہ ومرکز قرار دیا ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ جو اس امام سے سرکشی کرے گا، وہ ناداں اور بے وقوف ہوگا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی اقتدا کریں اور جو کچھ آپ ﷺ، ابراہیم علیہ السلام اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لائیں، پھر جن لوگوں نے ابراہیم اور ان کے اہل بیت کو یہودی یا نصرانی کہا، ان کے قول کو رد کیا۔

ان تمام مذکورہ مباحث کو تحویل قبلہ کے لئے تمہید اور مقدمہ بنا کر ذکر کیا، اس معاملہ کو اللہ نے بار بار تاکید سے بیان فرمایا اور رسول کو یہ حکم دیا کہ جہاں تھے اور جہاں سے نکلے، اس کی پیروی کریں۔

اللہ تعالی نے یہ بھی بتایا کہ جو ذات صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرتی ہے، اسی نے اس قبلہ کی طرف رہنمائی کی ہے۔ یہ قبلہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ وہی اس کے اہل ہیں۔ کیونکہ یہ سب سے افضل قبلہ اور مسلمان سب سے افضل امت ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کے لئے سب سے افضل رسول اور سب سے افضل کتاب کو پسند کیا ہے۔ انہیں بہترین زمانہ میں پیدا کیا اور بہترین شریعت سے نوازا۔ بہترین اخلاق سے متصف کیا، بہترین زمین میں آباد کیا، جنت میں بہترین جگہ مقرر کی، قیامت کے دن سب سے اچھی قیام گاہ متعین کی جو ایک بلند ٹیلہ پر ہوگی۔ پس پاک ہے وہ ذات جو جسے چاہتی ہے، اپنی رحمت سے مختص فرماتی ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے جسے

چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔

اللہ تعالی نے یہ بھی بتایا کہ ایسا اس لئے کیا گیا کہ لوگوں کو مسلمانوں پر کسی حجت کا موقع نہ مل سکے مگر ظالم اور ملحد لوگ مختلف بے بنیاد حجتیں پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے اقوال پر دوسری چیزوں کو مقدم کرتے ہیں، ان کی حجتیں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں۔

پھر بتایا کہ اس نے ایسا اپنی نعمت کو تمام کرنے اور لوگوں کو ہدایت دینے کے لئے کیا ہے اور اس کی نعمتوں میں سے رسول کو بھیجنا، کتاب نازل کرنا تاکہ لوگوں کو پاک اور صاف کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دینا اور ایسی باتیں بتانا جنہیں وہ جانتے نہیں ہیں۔

آگے ذکر وشکر کا حکم دیا جس سے نعمت کی تکمیل اور محبت کا حصول ہوتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ اللہ تعالی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالی نے پانچ وقت کی اذان بھی قبلہ کے ساتھ مشروع فرمائی اور ظہر، عصر اور عشاء میں دو دو رکعت کا اضافہ فرمایا۔ یہ نمازیں پہلے دو رکعت تھیں، (۱) یہ تمام چیزیں آپ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد ہوئیں۔

---

(۱) بخاری: ۳۵۰، مسلم: ۶۸۵

فصل (٦٠)

آنحضرت ﷺ کا مدینہ میں قیام اور جہاد کی مشروعیت

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں قیام پذیر ہوگئے اور اللہ تعالی نے اپنی نصرت اور مومنوں کی ایک جماعت سے آپ کی مدد فرمائی اور عداوت کے بعد ان کے دلوں میں الفت پیدا کردی۔ اللہ کے مددگاروں اور اسلام کے سپاہیوں نے آپ کی حفاظت کی، اور آپ ﷺ کے لئے اپنی جانوں کو قربان کردیا۔ ماں باپ اور آل اولاد کی محبت پر آپ کی محبت کو مقدم رکھا اور آپ کو خود اپنی ذات سے بھی زیادہ قریب تصور کرنے لگے تو ان حالات میں عرب اور یہودیوں نے متحدہ طور پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا اور ان کے ساتھ دشمنی پر کمر بستہ ہوگئے۔ ہر طرف سے ان کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اللہ تعالی نے اب تک مسلمانوں کو صبر وعفو اور درگزر کا حکم دیا تھا لیکن ان کی حیثیت بھی مضبوط ہوگئی اور دشمنوں سے مقابلہ کی قوت پیدا ہوئی تو پھر لڑائی کی اجازت ملی لیکن لڑائی کو پھر بھی فرض نہیں قرار دیا گیا بلکہ ارشاد ہوا کہ:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾[الحج:٣٩]

مظلومیت کے سبب مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ ان کی مدد پر

قادر ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ مکہ کا ذکر ہے کیونکہ سورہ مکی ہے لیکن یہ قول کئی وجوہ سے غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ اللہ تعالی نے مکہ میں جہاد کی اجازت نہیں دی تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ آیت کے سیاق وسباق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت مکہ سے نکلنے کے بعد نازل ہوئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے قول ﴿هَذَانِ خَصْمَانِ﴾[الحج: ۱۹] کا نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو بدر کی لڑائی میں مقابلہ کے لئے نکلے تھے۔(۱)

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ میں ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب کیا گیا ہے اور اس طرح کا خطاب مدنی آیتوں میں ہوتا تھا۔

پانچویں وجہ یہ کہ اس میں ایسے جہاد کا حکم ہے جو ہاتھ کے ساتھ مخصوص نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق جہاد کا حکم ہجرت کے بعد ہی ہوا۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ امام حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ

---

(۱) بخاری: ۳۹۶۵

عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے نکلے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا ہے۔" إنا لله وإنا إليه راجعون " یہ ضرور تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔اس وقت اللہ تعالی نے ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ﴾ والی آیت نازل فرمائی اور یہ قتال کی پہلی آیت ہے۔(۱)

سورہ کا سیاق یہ بھی بتا تا ہے کہ اس میں مکی و مدنی دونوں آیتیں ہیں کیونکہ القاء شیطان کا قصہ مکی ہے، واللہ اعلم! پھر مسلمانوں پر ان لوگوں سے لڑنا فرض قرار دیا گیا جو ان سے قتال پر آمادہ ہو جائیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُم﴾[البقرة:۱۹۰]

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالی نے تمام مشرکوں سے قتال فرض قرار دے دیا جو پہلے حرام تھا پھر اجازت ملی، پھر قتال کرنے والوں کے ساتھ قتال کرنے کا حکم ہوا، پھر تمام مشرکین کے ساتھ قتال کرنے کا حکم ہو گیا اور اس حکم کو بعض لوگوں نے فرض عین کہا اور بعض نے فرض کفایہ۔

لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ جنس جہاد فرض عین ہے، خواہ دل سے ہو یا زبان سے،

(۱) مستدرک للحاکم:۲/۶۶، یہ حدیث صحیح ہے۔

ہاتھ سے ہو یا مال سے۔اس لئے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان میں سے کسی بھی قسم کا جہاد کریں لیکن جہاد بالنفس فرض کفایہ ہے اور جہاد بالمال کے بارے میں دو قول ہیں جن میں صحیح وجوب والا قول ہے، کیونکہ قرآن میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا حکم یکساں طور پر دیا گیا ہے۔جہنم سے نجات ومغفرت اور جنت میں داخلہ کو اس پر موقوف قرار دیا گیا ہے۔چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾[الصف:١٠]

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتا دوں جو دردناک عذاب سے تم کو نجات دے۔

اللہ تعالی نے یہ بتایا کہ اس نے مسلمانوں کی جان ومال کو خرید لیا ہے اور اس کے بدلہ انہیں جنت دے دی ہے۔اس معاملہ اور وعدہ کا ذکر افضل ترین کتاب میں وارد ہے پھر اللہ تعالی نے اس میں یہ بتا کر مزید تاکید پیدا کی ہے کہ اس سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کوئی نہیں۔پھر یہ فرما کر تاکید کی کہ مسلمانوں کو اس سے بشارت حاصل کرنی چاہیئے پھر یہ بتایا کہ یہی بڑی کامیابی ہے۔اب عقلمندوں کو غور کرنا چاہیئے کہ یہ معاملہ کس قدر برتر ہے۔اس میں اللہ تعالی خریدار ہے۔قیمت جنت ہے۔جس کے ہاتھ پر معاملہ

طے پایا وہ سب سے اشرف رسول ہے اور ظاہر ہے کہ جس سامان کی یہ شان ہو اس کو کسی عظیم کام ہی کے لئے تیار کیا جائے گا۔

قد هيؤوك لأمر لو فطنت له　　　فأربأ بنفسك أن ترعى مع الهمل

تمہیں بہت بڑے کام کے لئے تیار کیا گیا ہے لہذا اپنے نفس کو جانوروں کے ساتھ رہنے سے بچاؤ۔

جنت ومحبت کا مہر مالک کی راہ میں جان ومال کی قربانی ہے۔اس لئے بزدل اور مفلس اس کا بھاؤ تاؤ کریں اور نہ تنگدست اسے ادھار بیچ دیں۔اسے چاہنے والوں کے بازار میں پیش کیا گیا ہے اور مالک کی نظر میں جان کے علاوہ اس کی کوئی قیمت نہیں۔یہ دیکھ کر بیکار لوگ پیچھے ہٹ گئے اور محبت منتظر کھڑی رہی کہ دیکھیں کس کی جان قیمت بننے کے اہل ہوتی ہے پھر سامان ان کے درمیان گھوم کر ایسے ہاتھوں میں پڑ گیا جو مومنوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت تھے۔

جب محبت کے دعویدار زیادہ ہو گئے تو ان سے اس پر مطالبہ کیا گیا کیونکہ اگر صرف دعوے کی بنیاد پر عطیات سے نوازا جائے گا تو غم وفکر کی سوزش سے محروم ہر شخص دعوی کرے گا۔جب شہود کے مدعی مختلف ہو جائیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے اس دعوی پر دلیل پیش کرو ورنہ یہ دعوی ثابت نہیں ہوگا:

﴿قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ﴾[آل عمران: ۳۱]
آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔

چنانچہ لوگ یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے اور وہی لوگ ثابت قدم رہے جو صحیح معنوں میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع آپ کے اقوال وافعال واخلاق وعادات میں کرتے رہے تھے۔ پھر ان سے دلیل کی عدالت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ عدالت بغیر تزکیہ کے نا قابل قبول ہے:

﴿يُجَٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ﴾[المائدة: ٥٤]
وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

یہ سن کر محبت کے بھی اکثر دعویدار پیچھے ہٹ گئے اور اس وقت مجاہدین کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ محبت کرنے والوں کی جان و مال ان کی نہیں ہوتی۔ اس لئے جس چیز پر معاملہ طے ہوا، اسے حوالہ کردو کیونکہ بیع وشراء میں جانبین سے ادائیگی اور سپردگی ہوتی ہے۔

جب تاجروں کو خریدار کی عظمت، اس کی قدر و قیمت اور معاملہ کرنے والے کی

جلالت شان کا اندازہ اور اس وثیقہ کی اہمیت کا علم ہوا جس میں یہ باتیں درج کی گئیں تو انہیں اس معاملے اور سودے کے عظیم الشان ہونے کا اندازہ ہوا۔ اسے معدودے چند درہموں کے عوض بیچ دینا سراسر گھاٹا سمجھا اس طرح اس کی لذت تو ختم ہوجائے گی لیکن تاوان باقی رہے گا۔ اب انہوں نے خریدار کے ساتھ برضا ورغبت بیعت رضوان طے کی جس میں فسخ کا اختیار نہیں۔ جب معاملہ طے ہوگیا اور چیز حوالہ کردی گئی تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری جان اور تمہارا مال ہمارا ہوگیا۔ اب ہم نے اسے پہلے سے بھی زیادہ مکمل حالت اور کثیر تعداد میں تمہیں لوٹا دیا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَحۡسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمۡوَٰتَاۢ﴾[آل عمران:١٦٩].

آپ ہرگز اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھیں۔

ہم نے تمہاری جان اور تمہارے مال کو کسی منفعت کے لئے نہیں خریدا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ بیع کو قبول کرنے اور اچھی قیمت دینے میں جود وکرم اثر انداز ہو۔ پھر ہم نے قیمت اور سامان دونوں تمہارے لئے اکھٹا کردیا۔

نیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر غور کریں جنہیں نبی کریم ﷺ نے پوری قیمت دے کر پھر اس پر اضافہ کیا اور ان کا اونٹ بھی واپس کردیا پھر ان سے فرمایا کہ کیا

تمہیں نہ بتاؤں کہ اللہ تعالی نے تمہارے والد سے کیا فرمایا؟ انہوں نے عرض کیا، ارشاد ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے تمہارے والد سے کھلم کھلا گفتگو کی، فرمایا کہ اے میرے بندے! میرے حضور سب تمنائیں کر، میں اسے پورا کروں گا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ! مجھے دوبارہ زندہ کردے تاکہ میں تیری راہ میں پھر سے لذت شہادت حاصل کروں۔(۱)

پاک ہے وہ ذات جس کا جودوکرم مخلوقات کے دائرہ علم سے باہر ہے۔ وہ سامان اور قیمت دونوں حوالہ کردیتا ہے پھر معاملہ کو مکمل کرنے کی توفیق دیتا ہے۔ سامان کو عیب کے باوجود قبول کرلیتا ہے۔ اعلی ترین قیمت ادا کرتا ہے۔ بندہ کو اپنے مال سے خریدتا ہے پھر قیمت وسامان دونوں دے کر بندہ کی تعریف کرتا ہے۔ اور اس معاملہ پر اس کی تعریف کرتا ہے حالانکہ اس کی توفیق ومشیت سے یہ معاملہ تمام ہوتا ہے۔

اللہ تعالی اور جنت کی طرف بلانے والوں نے خوددار نفوس اور بلند ہمتوں کو متحرک کردیا۔ ایمان کے منادی نے گوش ہوش رکھنے والوں کو اور اللہ نے تمام زندہ لوگوں کو سنادیا اور اس سماع سے منازل ابرار کی طرف حرکت ہوئی اور سفر کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا

(۱) بخاری:۳۰۴۳، مسلم:۱۵۰۷

جب دارالقرار کی منزل آئی۔

رسول اللہ ﷺ اللہ تبارک وتعالی سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں سے جو بندہ بھی میرے راستہ میں میری رضا کی خاطر نکلے گا، میں اسے ضمانت دوں گا کہ اسے جو اجر یا غنیمت ملے گا، اس کے ساتھ واپس کروں گا اور اگر میں نے اس کو لے لیا تو اسے بخش دوں گا۔ اس پر رحم کروں گا اور اسے جنت میں داخل کروں گا، اور فرمایا کہ اگر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوتا۔ میری خواہش ہے کہ اللہ تعالی کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔(۱)

اور فرمایا کہ میں اس شخص کا ذمہ دار ہوں جو محمد (ﷺ) پر ایمان لایا اور فرمانبرداری کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کہ اس کے لئے جنت کے نچلے حصے میں ایک گھر، جنت کے درمیانی حصے میں ایک گھر اور جنت کے بلند حصے میں ایک گھر ہوگا۔ جو ایسا کرے گا، اس سے کوئی خیر فوت نہیں ہوگا اور نہ کسی شر کا ڈر رہے گا خواہ وہ جہاں چاہے مرے۔(۲)

اور فرمایا جو مسلمان اللہ کی راہ میں اونٹنی دوہنے بھر بھی جنگ کرے گا، اس کے لئے

(۱) بخاری:۳۶، مسلم:۱۸۷۶

(۲) ابن حبان:۴۶۱۹، اس کی سند صحیح ہے۔

جنت واجب ہو جائے گی۔(۱) مزید فرمایا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس شخص جیسی ہے جو روزہ رکھے، قیام کرے، تلاوت کرے اور اس میں کسی طرح سستی نہ کرے یہاں تک کہ وہ جہاد سے لوٹ آئے۔(۲)

اور فرمایا: اللہ کی راہ میں صبح وشام کو چلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے(۳) اور اللہ کی راہ میں جہاد جنت کا ایک دروازہ ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالی رنج وغم سے نجات دیتا ہے۔(۴) نیز فرمایا کہ: جنت میں سو درجات ہیں، جنہیں اللہ تعالی نے جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان آسمان وزمین کے برابر فاصلہ ہے۔ اس لئے جب اللہ سے درخواست کرو تو جنت الفردوس کی درخواست کرو کیونکہ یہ افضل ترین اور اعلی جنت ہے اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش بریں ہے اور یہیں سے جنت کی نہریں شروع ہوتی ہیں۔(۵)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جو اللہ کی راہ میں مجاہد اور مقروض کی ادائیگیِ قرض اور

(۱) ابوداود: ۲۵۴۱، اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) بخاری: ۲۷۸۵، مسلم: ۱۸۷۸

(۳) مسند احمد: ۳۱۴/۵

(۴) بخاری: ۲۷۹۰

(۵) یہ حدیث ضعیف ہے۔ دیکھئے ضعیف الجامع

غلام کی آزادی میں مدد کرے، اللہ تعالی اسے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا۔جس دن اس کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔(۱)

اور فرمایا کہ جس کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے، اللہ تعالی انہیں آگ پر حرام کردیتا ہے اور فرمایا بخل اور ایمان ایک آدمی کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔اللہ کی راہ کا غبار اور جہنم کا دھواں ایک بندے کے چہرے پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔(۲)

فرمایا کہ ایک رات اور دن کے لئے اللہ کی راہ میں پہرہ دینا گھوڑے کا باندھنا مہینہ بھر کے روزے اور قیام سے بہتر ہے۔اگر ایسی حالت میں بندے کی موت ہوجائے تو اسے برابر اس عمل کا ثواب اور رزق ملتا رہے گا اور وہ فتنے سے مامون ہوجائے گا۔(۳)ایک آدمی نے شروع رات سے صبح تک گھوڑے پر سوار ہوکر مسلمانوں کی پہریداری کی، اور نماز اور ضرورتوں کے سوا کسی اور کام کے لئے نہیں اترا، اس کے حق میں آپ ﷺ نے فرمایا: جنت اس پر واجب ہوگئی، اب اگر کچھ اور نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔(۴)

(۱)بخاری:۹۰۷

(۲)نسائی:۶/۱۲، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۳)مسلم:۱۹۱۳

(۴)ابوداود:۲۵۰۱، اس کی سند صحیح ہے۔

ابوداود نے آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جو جہاد نہ کرے، کسی غازی کا سامان نہ تیار کرے یا اس کے بال بچوں کی خبر گیری نہ کرے تو اللہ تعالی اسے قیامت سے پہلے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔(۱)

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے خود کو ہلاکت میں ڈالنے کی تفسیر ''ترک جہاد'' سے کی ہے۔ آپ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہنم کی آگ ریا کار خرچ کرنے والے اور ریا کار مقتول فی الجہاد سے بھڑکائی جائے گی۔(۲)

(۱) ابوداود: ۲۵۰۱، اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) مسلم: ۱۹۰۵

فصل (٦١)

آپ ﷺ کا جہاد میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ دن کے ابتدائی حصہ میں جہاد اور سفر میں نکلنے کو مستحب سمجھتے تھے۔ اگر ابتدائی حصہ میں لڑائی کی نوبت نہ آتی تو پھر زوال شمس کے بعد لڑائی شروع کرتے جب ہوائیں چلنے لگتیں اور نصرت خداوندی کا نزول ہوتا۔(۱) صحابہ کرام سے فرار نہ ہونے کی بیعت لیا کرتے۔ بسا اوقات آپ ﷺ نے موت پر بھی بیعت لی ہے اور فتح سے قبل ہجرت پر بیعت لی ہے۔ اللہ کی توحید اور اس کے رسول کی اطاعت پر بیعت لی ہے۔ فقراء صحابہ سے اس بات پر بیعت لی ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے۔ اس کے بعد حال یہ تھا کہ کسی کے ہاتھ سے کوڑا اگر جاتا تو وہ اسے اٹھانے کے لئے خود اترتا لیکن کسی سے اٹھانے کے لئے نہ کہتا۔(۲) نیز آپ ﷺ جہاد اور اس کی حکمت عملی تیار کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے اور دوران سفر پیچھے رہنے والے کمزور کو ساتھ ملا کر چلتے تھے۔ اور چل نہ سکنے والے کو ساتھ سوار کر لیتے اور چلنے میں آپ

---

(۱) ابوداود: ۲٦۵۵

(۲) مسلم: ۱۰۴۳

ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ نرم روی سے کام لیتے۔(۱) اور جب آپ کسی غزوے کے لئے نکلتے تو توریہ سے کام لیتے۔(۲)

جب آپ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو جنگی چال سے کام لیتے اور فرماتے تھے: ''لڑائی فراست کا نام ہے''(۳) نیز آپ جاسوسوں کو بھی بھیجا کرتے تا کہ دشمن کی خبریں لائیں اور ان کی نقل وحرکت سے مطلع کریں۔ آپ ﷺ مقدمۃ الجیش روانہ فرماتے اور محافظوں کو متعین فرماتے (۴) جب دشمن کا سامنا ہو جاتا تو کھڑے ہو کر دعا فرماتے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت طلب فرماتے اور آپ اور صحابہ کرام ایسے نازک موقعوں پر کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے اور اپنی آواز نرم رکھتے۔(۵)

میدان جنگ میں آپ لشکر کی صف آرائی فرماتے اور ہر جانب خیال رکھتے ہوئے صفیں مرتب فرماتے تھے اور آپ کے سامنے لوگ میدان میں مبارزت کے لئے نکلتے اور آپ جنگ کے لئے مخصوص لباس زیب تن فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ نے دو

---

(۱) ابوداود: ۲۶۳۹، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(۲) بخاری: ۲۷۵۷، مسلم: ۲۷۶۹

(۳) بخاری: ۳۰۳۰، مسلم: ۱۷۳۹

(۴) مسلم: ۱۹۰۱

(۵) مسلم: ۱۷۶۳

زرہیں زیب تن کیں (۱) نیز آپ کے پرچم اور جھنڈے بھی ہوتے۔(۲)

جب آپ کسی قوم سے مقابلہ کرتے تو فتح کے بعد تین دن تک وہاں ٹھہرتے، پھر واپس آتے تھے۔(۳)

جب حملہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو انتظار فرماتے۔ اگر وہاں اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ حملہ کردیتے تھے(۴)۔ کبھی آپ دشمن پر رات کو حملہ کرتے اور کبھی دن کو اچانک حملہ کردیتے(۵) جمعرات کو صبح سویرے نکلنا پسند کرتے(۶) اور جب لشکر کسی جگہ اترتا تو آپ ﷺ ایک دوسرے کو اس طرح ترتیب دیتے کہ اگر ان پر چادر ڈال دی جاتی تو سب کو کافی ہوجاتی۔(۷)

نیز آپ ﷺ صفیں مرتب کرتے(۸) اور جنگ کے وقت اپنے ہاتھ سے انہیں

(۱) ابوداود: ۲۵۹۰

(۲) بخاری: ۴۲۸۰

(۳) بخاری: ۳۰۶۵، مسلم: ۲۸۷۵

(۴) بخاری: ۶۱۰، مسلم: ۱۳۶۵

(۵) مسلم: ۱۷۳۰

(۶) بخاری: ۲۷۵۷

(۷) ابوداود: ۲۶۲۸، اس کی سند صحیح ہے۔

(۸) بخاری: ۲۹۳۰

درست فرماتے اور کہتے اے فلاں آگے بڑھو، اے فلاں پیچھے ہٹ جاؤ۔ آپ اس آدمی کو پسند فرماتے جو اپنی قوم کے جھنڈے تلے جنگ کرے اور جب دشمن کے سامنے ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

" اللّٰهُمَّ مُنزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ "(۱)

اے اللہ! کتاب نازل کرنے والے! اور بادل چلانے والے! اور لشکروں کو شکست دینے والے! انہیں شکست دے اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔

نیز یہ آیت بھی پڑھا کرتے تھے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ☆ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ﴾ [القمر: ٤٥-٤٦]

جماعت کو شکست ہوگی اور وہ پیٹھ پھیر لیں گے بلکہ ان کا وعدہ قیامت ہے اور قیامت زیادہ سخت اور تلخ ہے۔

اور آپ ﷺ یہ دعا بھی پڑھتے تھے:

---

(۱) بخاری: ۲۹۳۳

(۲) ابوداود: ۲۶۳۲، اس کی سند صحیح ہے۔

"اللّٰهُمَّ أَنزِلْ نَصْرَكَ اللّٰهُمَّ أَنْتَ عَضُدِي وَأَنْتَ نَصِيرِي بِكَ أُقَاتِلُ "(۱)

اے اللہ اپنی مدد نازل فرما، اے اللہ تو میرا بازو ہے، تو میرا مددگار ہے، تیرے ہی سہارے سے میں جنگ کرتا ہوں۔

جب جنگ خوب تیز ہوجاتی اور لڑائی شدت اختیار کر جاتی اور دشمن آپ ﷺ کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتا تو فرمایا کرتے:

"أنا النبی لا کذب أنا ابن عبدالمطلب "(۲)

میں سچا نبی ہوں اور عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں۔

اور جب لڑائی گھمسان کی ہوجاتی تو صحابہ کرام آپ کے پاس آ کر بچاؤ حاصل کرتے تھے (۳) میدان جنگ میں آپ دشمن کے سب سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔

نیز آپ ﷺ لڑائی کے دوران صحابہ کا ایک خفیہ کلمہ مقرر فرما دیتے جو ایک طرح کا شناختی کلمہ ہوتا تھا۔ جب وہ آپس میں بولیں تو پہچان لئے جائیں۔ ایک مرتبہ ان کا خفیہ کلمہ یہ تھا امت امت اور ایک بار حم لا ینصرون تھا اور ایک دفعہ یا منصور امت مقرر

---

(۱) بخاری:۲۸۶۴

(۲) مسلم:۱۷۷۶

(۳) ابوداود:۲۵۹۶، اس کی سند صحیح ہے۔

کیا گیا تھا۔(۱)

اور جنگ کے موقع پر آپ ﷺ زرہ اور خود پہن لیتے اور تلوار لٹکاتے۔ نیزہ اور عربی کمان اٹھاتے اور ڈھال لیتے تھے اور لڑائی میں آپ اکڑ کر چلنے کو پسند کرتے تھے اور فرماتے تھے بعض اکڑ اللہ کو محبوب ہے اور بعض ناپسند۔ لڑائی اور صدقہ کے موقع کی اکڑ کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور فسق و فجور کی اکڑ اسے ناپسند ہے۔

جنگ میں ایک دفعہ اہل طائف کے خلاف آپ نے منجنیق کا بھی استعمال کیا۔ آپ بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرماتے تھے(۲)۔ لڑائی کے دوران میں آپ جسے بالغ سمجھتے اسے قتل کرتے اور جو بالغ نہ ہوتا، اسے قتل کرنے سے گریز کرتے تھے(۳) جب کوئی لشکر بھیجتے تو اسے اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتے اور فرماتے:

اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جاؤ، کافروں سے جنگ کرو، مثلہ نہ کرو (یعنی حلیہ نہ بگاڑو) بدعہدی نہ کرو، زیادتی نہ کرو اور بچوں کو قتل نہ کرو۔(۴)

آپ ﷺ قرآن لے کر دشمن کی سرزمین میں جانے سے منع کرتے تھے اور

(۱) ابوداود: ۲۶۵۹، یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲) بخاری: ۳۰۱۴

(۳) ابوداود/۴۴۰۴، اس کی سند حسن ہے۔

(۴) مسلم: ۱۷۳۱

آپ لشکر کے امیر کو حکم دیتے کہ دشمن سے جنگ کرنے سے قبل اسے دعوت دی جائے، یا اسلام اور ہجرت قبول کرلے یا ہجرت کے بغیر محض اسلام قبول کرلے لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی طرح غنیمت کا حقدار نہ ہوگا یا پھر جزیہ ادا کرے۔ اگر یہ شرائط قبول ہوں تو ٹھیک ورنہ اللہ سے نصرت کی امید کرتے ہوئے ان سے جہاد کرو۔(۱)

اور جب آپ ﷺ دشمن پر فتحیاب ہوتے تو منادی کرنے کا حکم فرماتے اور تمام غنائم جمع کی جاتیں اور چھینی ہوئی چیزیں مالکوں کو دی جاتیں۔ پھر مال غنیمت میں پانچواں حصہ (خمس) نکالتے اور باقی فوج پر تقسیم فرمادیتے۔ سوار کو تین حصے مرحمت فرماتے۔ ایک حصہ آدمی کا اور دو حصے گھوڑے کے اور پیدل کو ایک حصہ عطا فرماتے (۲) پہلے اسلامی مصالح میں خرچ فرماتے، جہاں مناسب خیال کرتے۔ اسی طرح کچھ حصہ ان افراد کو عطا فرماتے جن کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے جیسے عورتیں، بچے اور غلام، اس طرح سے آپ سے مال غنیمت کا تقسیم کرنا صحیح طور پر ثابت ہے۔

مال غنیمت سے آپ بتقاضائے مصلحت بعض لوگوں کو مزید دیتے تھے۔ بعض غزوات میں سلمہ بن اکوع کو آپ نے سوار اور پیدل دونوں کے حصے دیئے تھے۔ یعنی

---

(۱)(۴) مسلم: ۱۷۳۱

(۲) بخاری: ۲۸۶۳، مسلم: ۱۷۶۲

کل پانچ حصے انہیں ملے کیوں کہ ان کی کارگزاری عظیم تھی (۱)۔زائد حصے کے علاوہ آپ ﷺ کمزور و مضبوط سب کو برابر دیتے تھے۔جب دشمن کے علاقے پر آپ چڑھائی کرتے اور وہاں پہلے کوئی لشکر بھیجتے تو اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی غنیمت کا پانچواں حصہ نکال کر بقیہ مال کا چوتھا حصہ اس لشکر کو دے دیتے۔پھر باقی مال کو اس لشکر اور بقیہ تمام مجاہدوں کے مابین تقسیم فرمادیتے اور جب لشکر لوٹ آتا تو غنیمت حاصل کرنے والی ٹولی کو تیسرا حصہ دیتے اور اس کے باوجود زائد حصہ کو ناپسند کرتے اور فرماتے،مسلمانوں میں قوی ضعیف کو یہ حصہ لوٹا دے۔(۲)

مال غنیمت میں آپ ﷺ کا بھی حصہ ہوتا تھا،اسے صفی کہتے تھے۔عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ صفیہ رضی اللہ عنہا صفی میں سے تھیں (۳) آپ کی ذوالفقار نام کی تلوار بھی صفی میں سے تھی (۴) مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر جو غزوہ سے غائب ہوتا تو اس کا بھی آپ حصہ مقرر فرماتے جیسے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غزوہ بدر میں حصہ مقرر کیا جب وہ غزوہ بدر میں آپ کی صاحبزادی کی تیمارداری کے باعث حاضر نہ

(۱) مسلم:۱۸۰۷

(۲) احمد ۵/۳۲۳،اس کی سند قوی نہیں ہے۔

(۳) ابوداود:۲۹۹۴،اس کی سند قوی ہے۔

(۴) ترمذی:۱۵۶۱،اس کی سند حسن ہے۔

ہوسکے۔ آپ نے فرمایا: عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام میں ہیں، چنانچہ ان کا حصہ نکالا گیا۔(۱)

نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ کے موقع پر خرید و فروخت کرتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں دیکھتے اور منع نہ فرماتے۔ صحابہ کرام غزوات میں دو طرح سے خدمات مستعار لیتے تھے۔ ایک یہ کہ آدمی جہاد کے لئے جائے اور اثنائے سفر خدمت کے لئے آدمی نوکر رکھ لے۔ دوسرے یہ کہ جو جہاد میں نکلا اس میں سے کسی کو اجرت پر متعین کر لے، اسے جاعل کہا کرتے تھے۔ اس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ”غازی کے لئے اس کا اپنا اجر ہے اور جاعل کے لئے اس کی اجرت اور غازی کے حصہ میں بھی برابر کا شریک ہوگا“۔(۲)

مال غنیمت میں دو طرح شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک شرکت بدنی، دوسرے یہ کہ ایک آدمی اپنا اونٹ یا گھوڑا دوسرے کو اس شرط پر دیتا تھا کہ اس پر سوار جہاد کرے اور جو مال غنیمت ملے اس کا نصف اسے ادا کرے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک تیر کے دو حصے کئے گئے، چنانچہ ایک کو تیر مل گیا اور دوسرے کو اس کا پھل اور پر ملا۔

(۱) ابوداود: ۲۷۲۶، اس کے تمام روای ثقہ ہیں۔
(۲) ابوداود: ۲۵۲۶، اس کی سند صحیح ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں، عمار اور سعد (رضی اللہ عنہم) نے غزوہ بدر کے دن مشارکت کی۔ سعد دو قیدی لے آئے۔ میں اور عمار خالی ہاتھ آئے۔(۱)

کبھی آپ ﷺ سوار فوج اور کبھی پیدل فوج بھیجتے تھے لیکن فتح مکہ کے بعد جو آتا اس کا حصہ مقرر نہ فرماتے (۲) قرابت داروں کا حصہ آپ بنو عبد شمس اور بنو نوفل کے سوا صرف بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ بنو عبد المطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک چیز ہیں (انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کر کے آپ اشارہ فرماتے) انہوں نے ہم کو دور جاہلیت اور اسلام دونوں میں نہیں چھوڑا۔ (۳)

غزوات میں آپ کے ہمراہ مسلمان شہد، انگور اور کھانے کی چیزیں حاصل کرتے تو کھا لیتے اور اسے بطور مال غنیمت نہ شمار کرتے تھے (۴) ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا، کیا آپ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں کھانے کی اشیاء کا خمس دیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: فتح خیبر کے دن ہمیں کھانے کی چیزیں ہاتھ لگیں۔ جو بھی آتا

---

(۱) ابوداود: ۳۳۸۸، مگر یہ روایت منقطع ہے۔

(۲) بخاری: ۴۲۳۷

(۳) بخاری: ۳۱۴۰

(۴) بخاری: ۳۱۵۴

حسب ضرورت لے کر چلا جاتا(۱) بعض صحابہ سے مروی ہے کہ ہم غزوات میں اخروٹ کھالیا کرتے تھے اور تقسیم نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم اپنے سامان سفر کے پاس آتے اور اسے بھرا ہوا پاتے۔(۲)

آپ ﷺ نے مال غنیمت پر لوٹ مار کرنے اور غزوات میں دشمن کی ناک، کان کاٹنے سے بھی منع فرمایا ہے۔آپ نے فرمایا"مال غنیمت میں لوٹ مار کرنے والا ہم میں سے نہیں"۔(۳)

نیز آپ نے مال غنیمت کے جانور پر سواری کرنے کی ممانعت فرمائی کہ جب کمزور ہو جائے تو لوٹا دے اور اس طرح مال غنیمت میں سے لباس پہنے کہ جب پرانا ہو جائے تو لوٹا دے۔(۴) البتہ حالت جنگ میں اس سے استفادہ کرنے کی ممانعت نہیں فرمائی۔

مال غنیمت میں خیانت سے آپ انتہائی سختی سے ممانعت کرتے اور فرماتے تھے:(یہ قیامت کے دن اس کے مرتکب پر باعث عار، باعث آگ اور باعث رسوائی ہوگی)(۵) جب آپ کا

---

(۱)ابوداود:۲۷۰۱،اس کی سند صحیح ہے۔

(۲)ابوداود:۲۷۰۶،یہ روایت ضعیف ہے۔

(۳)ترمذی:۱۶۰۱،اس کی سند صحیح ہے۔

(۴)ابن ماجہ:۲۷۰۸،اس کی سند صحیح ہے۔

(۵)ابن ماجہ:۲۸۴۰،یہ حدیث حسن ہے۔

غلام مدعم زخمی ہوا تو بعض صحابہ نے کہا کہ اسے جنت مبارک ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، خیبر کے دن مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے جو چادر اس نے لی تھی وہ آگ بن کر اس پر بھڑک رہی ہے۔ یہ سن کر ایک شخص دو تسمے لے آیا۔آپ نے فرمایا کہ ایک یا دو تسمے بھی آگ ہو جائیں گے۔(۱)

جب آپ ﷺ کے سامان کے نگہبان کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس کے متعلق فرمایا: وہ جہنم میں ہے۔لوگ اس کو دیکھنے گئے تو اس نے ایک عبا چرا رکھی تھی۔(۲)

اسی طرح بعض غزوات میں لوگوں نے کہا: فلاں شہید ہے، فلاں شہید ہے، یہاں تک کہ ایک شخص کے متعلق کہا کہ یہ بھی شہید ہے۔تو یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا: ہرگز نہیں، میں نے اس کو جہنم میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے ایک عبا یا چادر چرائی تھی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے ابن خطاب! لوگوں میں جا کر تین بار یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومنین ہی داخل ہوں گے۔(۳)

جب مال غنیمت حاصل ہوتا تھا تو آپ ﷺ حضرت بلال کو حکم دیتے تھے کہ

---

(۱) بخاری:۴۲۳۴، مسلم:۱۱۵

(۲) بخاری:۳۰۷۴

(۳) مسلم:۱۱۴

لوگوں میں اعلان کرو کہ اپنا مال غنیمت لے کر حاضر ہوں تو آپ خمس نکالنے کے بعد اسے تقسیم فرما دیتے تھے۔ایک دفعہ ایک شخص منادی اور تقسیم کے بعد ایک بال والی لگام لے کر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا تم نے بلال کی منادی نہیں سنی۔اس نے کہا: سنی تھی آپ نے فرمایا'' پھر کیوں نہیں لے کر آئے''۔اس نے معذرت چاہی تو آپ نے کہا: اب تو تم اسے قیامت کے دن لے کر آؤ گے۔میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔(۱)

آپ نے مال غنیمت میں چوری کردہ مال کو جلا دینے کا حکم فرمایا۔اسی طرح آپ کے دونوں خلفاء نے ایسا ہی کیا اور خائن کو مارا بھی گیا(۲) علماء کا قول ہے کہ یہ مذکورہ احادیث سے منسوخ ہے کیونکہ ان میں جلانے کا ذکر نہیں۔بعض علماء کا قول ہے کہ ایسا کرنا ایک طرح کی تعزیر اور مالی سزا ہے جس کا تعلق مصلحت کے مطابق ائمہ کے اجتہاد سے ہے، جیسا کہ شراب پینے والوں کو تیسری یا چوتھی بار قتل کر دیا جاتا ہے۔

(۱)ابوداود:۲۷۱۲،اس کی سند حسن ہے۔

(۲)ابوداود:۲۷۱۳،مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔

فصل (٦٤)

آپ ﷺ کا قیدیوں کے ساتھ معاملے کا طریقہ

جنگی قیدیوں میں سے بعض کو ازراہ احسان آپ ﷺ رہا کر دیتے تھے اور بعض سے فدیہ لے کر اور چھوڑ دیتے اور بعض کو قتل کر دیتے اور بعض کو مسلمان قیدیوں کے عوض میں رہا کرا دیتے تھے ۔ حسب تقاضائے مصلحت آپ نے یہ تمام صورتیں اختیار فرمائیں۔

انصار نے اجازت چاہی کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے فدیہ کی رقم نہ لی جائے۔ آپ نے فرمایا ایک درہم بھی نہ چھوڑا جائے۔ (١)

ہوازن کے قیدیوں کو آپ ﷺ نے تقسیم کے بعد واپس کر دیا تھا اور غنیمت کے مستحق صحابہ نے اسے بخوشی منظور کر لیا تھا۔ جن لوگوں کو کچھ تردد تھا، انہیں آپ ﷺ نے فی کس کے عوض چھ حصے دیئے۔ (٢)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس کی حدیث نقل کی ہے کہ کچھ قیدی ایسے تھے جن کے پاس فدیہ دینے کے لئے مال نہ تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کا فدیہ یہ مقرر فرمایا

(١) بخاری: ٢٥٣٧

(٢) بخاری: ٢٣٠٧

کہ وہ انصار کے بچوں کولکھنا سکھا دیں (۱) اس سے معلوم ہوا کہ مال کے علاوہ کسی کام کوبھی فدیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

آپ ﷺ کے اور صحابہ کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہے کہ عرب قیدیوں کوغلام بنانا اور لونڈیوں کوخرید کر صحبت کرنا صحیح ہے، اسلام کی شرط اس میں نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ باندی سے اس کے بچے کوعلیحدہ کرنے سے منع فرماتے تھے (۲)۔

اہل بیت کے سبھی لوگوں کوعطا فرماتے تا کہ ان میں جدائی نہ پیدا ہو۔ آپ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مشرکین میں سے ایک جاسوس کوقتل کیا (۳) اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حاطب کوقتل نہیں کیا، حالانکہ انہوں نے جاسوسی کی تھی۔ اورغزوہ بدر میں موجود تھے۔ (۴)

اس واقعہ سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کوقتل نہ کیا جائے اور امام مالک اور امام احمد کے شاگرد ابن عقیل وغیرہ قتل کا فتوی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ

(۱) مسند احمد: ۱/ ۲۴۷

(۲) ترمذی: ۱۵۶۶، اس کی سند جید ہے۔

(۳) بخاری: ۳۵۱

(۴) بخاری: ۳۰۰۷

اس واقعہ میں غزوہ بدر میں حاضری ایک ایسی وجہ ہے جو قتل کی مانع ہے جو کہ دوسرے مسلمان جاسوسوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر صرف اسلام مانع قتل ہوتا تو یہ وجہ نہ بتائی جاتی بلکہ ان کا صرف مسلمان ہونا کافی سمجھا جاتا اور یہی رائے زیادہ قوی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ مشرکین کے غلام اگر مسلمانوں کے علاقہ میں آجاتے تو انہیں آزاد سمجھتے جب وہ مسلمان ہو جاتے۔ نیز آپ ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ کوئی مسلمان ہو جاتا تو اس کے پاس جو کچھ ہوتا اس کے پاس رہنے دیتے۔

نیز زمانہ کفر اور حالت جنگ میں کافر مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی جانی و مالی نقصان پہنچا چکے ہوں اسلام لانے کے بعد ان سے وہ اموال واپس نہیں کرواتے تھے۔

فصل (٦٣)

آپ ﷺ کا غنیمت کی زمین کی تقسیم کا طریقہ

آپ سے ثابت ہے کہ آپ نے بنی قریظہ، بنی نضیر اور خیبر کی نصف زمین غانمین کے درمیان تقسیم فرمائی اور خیبر کی زمین کا دوسرا نصف حصہ وفود کے استقبال وضیافت اور ناگہانی حوادث سے متاثر افراد کے تعاون کے لئے مختص فرما دیا، اور مکہ کی زمینیں تقسیم نہیں فرمائی، کیونکہ وہ مناسک حج کی جگہ ہے اور مسلمانوں پر وقف ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا زمینوں کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ تقسیم کر دے یا وقف رہنے دے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا اور مکہ مکرمہ کی زمینوں کو نہیں تقسیم فرمایا اس سے دونوں امور کا جواز نکلتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زمین غنائم مامورہ میں شامل نہیں ہے بلکہ غنائم کا اطلاق تو صرف چوپایوں اور منقولہ جائداد پر ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے امت مسلمہ کے سوا کسی دوسری امت پر غنائم کو حلال قرار نہیں دیا، اور ان کے لئے دارالکفر مباح قرار دیا جیسا کہ اللہ تعالی فرمایا ہے۔ جس میں فرعون اور اس کی قوم اور ان کی زمینوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو ان زمینوں کا وارث بنا دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین غنائم کے تحت شمار نہیں ہوتی۔ امام کو اختیار حاصل ہے کہ مصلحت وقت کے لحاظ سے جو چاہے کرے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے تقسیم بھی کیا اور ترک بھی کیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم نہیں کیا، بلکہ اسی طرح رہنے دیا اور اس پر دائمی ٹیکس عائد کر دیا تاکہ امور جنگ میں اس سے مدد لی جا سکے اور زمین کے وقف کا یہی مفہوم ہے، نہ یہ کہ اس سے ملکیت کی منتقلی ناجائز ہے، بلکہ اس کی بیع جائز ہے جیسا کہ امت کا تعامل ہے، اور علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایسی زمین کی وراثت جائز ہے۔ امام احمد نے وضاحت کی ہے کہ ایسی زمین کو مہر میں دیا جا سکتا ہے اور وقف کو بیچنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے جن پر وقف کیا گیا ہے ان کا حق ضائع ہو جاتا ہے اور فوجیوں کو خراج کی زمین میں حق ہوتا ہے جو بیع سے باطل نہیں ہوتا۔ اس کی نظیر مکاتب غلام کی بیع ہے اس کے اندر کتابت سے حریت کا سبب منعقد ہے۔ اس لئے وہ مشتری کی طرف مکاتب ہی منتقل ہوگا جیسا کہ بائع کے پاس تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے درمیان کسی مسلمان کی رہائش کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر وہ وہاں سے ہجرت کر سکتا ہو، اور فرمایا: میں ہر مسلمان سے بیزار ہوں جو کہ مشرکین کے درمیان رہائش پذیر ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کیوں؟ فرمایا کہ کیا تو ان دونوں کی آگ یکجا دیکھ نہیں رہا (۱) پھر فرمایا کہ جو کوئی کسی کے ساتھ اکٹھا رہا وہ اسی طرح ہے (۲)

(۱) ابوداود: ۲۶۴۵، اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(۲) ابوداود: ۲۷۸۷، اس کی سند ضعیف ہے۔

مزید فرمایا" جب تک توبہ منقطع نہیں ہوتی، اس وقت تک ہجرت منقطع نہ ہوگی اور جب تک سورج مغرب سے نہیں نکلتا، اس وقت تک توبہ منقطع نہ ہوگی" (۱) اور مزید فرمایا: عنقریب ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی۔ اس لئے زمین پر سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام ہجرت سے پیوستہ رہیں اور زمین پر شریر لوگ باقی رہ جائیں گیا اور وہ انہیں پھینک دے گی۔ اللہ تعالی بندروں اور سوروں کے ساتھ ان کا حشر کرے گا۔ (۲)

(۱) ابوداود: ۲۴۷۹، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) ابوداود: ۲۴۸۲، اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔

فصل (٦٤)

آپ ﷺ کا امان، صلح، جزیہ، اہل کتاب اور کفار و منافقین کے ساتھ معاملے کا طریقہ

آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: مسلمانوں کا ذمہ ایک ہے، معمولی مسلمان بھی اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ جو کسی مسلمان کے ساتھ غداری کرے گا تو اس پر اللہ کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالی اس کی کوئی عبادت قبول نہ کرے گا''(۱)

نیز آپ نے فرمایا: جس شخص کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس کی مدت گزرنے تک اسے نہ توڑے البتہ آگاہی کے بعد اسے ختم کر سکتا ہے(۲) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے کسی آدمی کو امان دینے کے بعد قتل کر دیا میں اس سے بری ہوں (۳) آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اس پر دشمن مسلط کر دیا جاتا ہے(۴)

نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو کفار کے تین گروہ تھے:

(۱) بخاری: ۱۱۱، مسلم: ۱۳۷۰

(۲) ابوداود: ۲۷۵۹، اس کی سند صحیح ہے۔

(۳) ابن ماجہ: ۲۶۸۸، اس کی سند صحیح ہے۔

(۴) بیہقی: ۳/ ۳۴۶، اس کی سند میں ضعف ہے۔

۱- ایک گروہ نے آپ سے صلح کر لی اور وعدہ کیا نہ آپ سے جنگ کریں گے، نہ آپ پر حملہ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف دشمنوں کی مدد کریں گے۔

۲- دوسرے گروہ نے آپ سے جنگ کی اور مخالفت پر اتر آیا۔

۳- تیسرے گروہ نے نہ جنگ کی اور نہ صلح کی، بلکہ خاموشی سے مستقبل کے نتائج پر نظر رکھے رہا۔

ان جماعتوں میں سے بعض در پردہ آپ ﷺ کا غلبہ چاہتے واستیلاء کے منتظر تھے۔اور بعض ایسے بھی تھے جو ظاہری طور پر آپ کے ساتھ مل گئے اور در پردہ دشمنوں سے ساز باز رکھتے تھے۔آپ نے ہر گروہ کے ساتھ امر الٰہی کے مطابق برتاؤ کیا۔

چنانچہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ آپ نے صلح کر لی، لیکن غزوہ بدر کے بعد بنوقینقاع نے آپ سے جنگ کی، کیونکہ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی ان کو اچھی نہ لگی اور حسد وبغض وعناد کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

ان کے بعد بنونضیر نے عہد شکنی کی۔آپ نے ان کا محاصرہ فرمایا۔ان کے کھجور کے باغات کو کاٹ کر آگ لگا دی۔آپ نے ان کو مدینہ سے اس شرط پر نکلنے کی اجازت دی کہ ہتھیاروں کے علاوہ دیگر سامان اس قدر لے جاسکتے ہیں جو اونٹ اٹھائے۔اللہ تعالی نے اس واقعہ کا سورہ حشر میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد بنو قریظہ نے عہد شکنی کی، اور یہ رسول اللہ ﷺ کے بدترین دشمن تھے اور کفر میں غیر معمولی سخت تھے، اس لئے دوسرے یہودیوں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ زیادہ سخت معاملہ کیا گیا۔ یہ واقعات یہود مدینہ کے ساتھ پیش آئے۔ آپ ہر بڑے غزوہ کے بعد یہودیوں کی کسی نہ کسی جماعت کے ساتھ جنگ کے لئے مجبور ہوئے، چنانچہ غزوہ بدر کے بعد بنو قینقاع کے ساتھ احد کے بعد بنو نضیر کے ساتھ اور خندق کے بعد بنو قریظہ سے جنگ کرنی پڑی۔

نبی کریم ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ جب آپ کسی قوم سے مصالحت و معاہدہ کرتے تو جو بھی اس قوم کا حلیف بن جاتا، اسے بھی معاہدہ میں شریک کر لیتے اور اگر اس کا کوئی فرد معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا اور باقی لوگ معاہدہ کے پابند رہتے تو آپ تمام افراد سے جنگ کرتے، جیسا کہ بنو نضیر، بنو قریظہ اور اہل مکہ کے ساتھ ہوا۔ معاہدین کے بارے میں یہی آپ ﷺ کی سنت طیبہ تھی۔

امام احمد اور ان کے علاوہ علماء کے قول کے مطابق ذمیوں کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا، لیکن امام شافعی کے اصحاب اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان افراد کے حق میں عہد توڑنے کی اجازت دی جائے جو اسے توڑیں، لیکن جو لوگ عہد کے پابند اور معترف ہوں ان کے ساتھ پابندی ضروری ہے۔ دونوں

صورتوں میں انہوں نے یہ کہہ کر امتیاز کیا کہ ذمہ کا معاملہ زیادہ پابندی کا مستحق ہے، بایں ہمہ پہلی رائے زیادہ راجح ومفید ہے۔

جب شام میں عیسائیوں نے مسلمانوں کا مال جلا دیا تھا اوران میں سے جن کو علم تھا انہوں نے حاکموں کو اطلاع دینے کے بجائے ظالموں کا ساتھ دیا تھا تو ایسی صورت میں ہم نے یہی فتوی دیا تھا کہ خیانت کرنے والوں کی سزا قتل ہے۔امام کو ان کے بارے میں کسی طرح کا اختیار نہیں، بس قتل کو بطور حد نافذ کیا جائے گا۔ جو لوگ معاہدہ کے تحت ہوں اور قانون ملت کے پابند ہوں ، اسلام ان پر بطور حد واجب ہونے والے قتل کو معاف نہیں کرتا۔ بخلاف جنگجو کافر کے کہ جب وہ اسلام قبول کر لے تو اس کا حکم دوسرا ہے اور وہ ذمی جو کہ صاحب معاہدہ ہو پھر عہد شکنی کرے تو اس کا حکم دوسرا ہوتا ہے۔امام احمد کی تصریحات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے اور ہمارے شیخ (ابن تیمیہ) نے بارہا ایسا ہی فتوی دیا ہے۔

آپ ﷺ کی سنت یہ بھی تھی کہ جب کسی قوم کے ساتھ مصالحت کرتے اوران کے ساتھ آپ کے دوسرے دشمن شریک ہوتے اور معاہدہ میں داخل ہوجاتے اور اسی طرح اور دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہوتے تو آپ کے کافر معاہدین کے ساتھ جنگ کرنے والے آپ کے ساتھ جنگ کرنے والے تصور کئے جاتے ۔اسی وجہ سے

آپ نے اہل مکہ پر حملہ کیا تھا۔اسی وجہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی مشرقی نصاری سے جنگ کرنے کا فتوی دیا تھا، کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں تاتاریوں کی مالی اور ہتھیاروں سے مدد کی تھی اگر چہ وہ خود نہیں لڑے تھے۔اس وجہ سے انہیں عہد شکنی کا مرتکب مانا گیا اور جب ذمی لوگ باہر کے مشرکین کی مسلمانوں کے خلاف مدد کریں تو کس طرح انہیں عہد شکن قرار نہ دیا جائے؟۔(یعنی وہ یقیناً اسلامی ریاست کے باغی ہیں)۔

نیز آپ ﷺ کی خدمت میں دشمنوں کی جانب سے قاصد حاضر ہوتے۔آپ انہیں نہ تکلیف دیتے اور نہ قتل کرتے، اور جب آپ کے پاس مسیلمہ کذاب کے دو قاصد عبداللہ بن نواحہ اور ابن اثال حاضر ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگے جیسا مسیلمہ نے کہا ویسا ہی ہے۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:(اگر قاصدوں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن مار دیتا)(۱) چنانچہ آپ کی سنت طیبہ جاری ہوگئی کہ قاصد کو قتل نہ کیا جائے۔نیز آپ کی عادت طیبہ یہ بھی تھی کہ جب قاصد دین اسلام قبول کر لیتا تو آپ اپنے پاس نہ روکتے تھے بلکہ واپس کر دیتے تھے، جیسا کہ ابورافع رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ قریش نے مجھے رسول اللہ ﷺ

(۱) ابوداود:۲۷۶۱، اس کی سند حسن ہے۔

کی طرف قاصد بنا کر بھیجا اور جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے دل میں اسلام کی محبت آ گئی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں لوٹ کر ان کے پاس نہ جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا: میں عہد شکنی نہیں کروں گا اور قاصدوں کو نہیں روکوں گا۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ وہاں جا کر بھی اسلام کی محبت ورغبت محسوس کرو تو دوبارہ واپس آ جاؤ۔(۱)

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ یہ اس زمانہ میں واقع ہوا جب نبی کریم ﷺ نے قریش سے صلح حدیبیہ کر رکھی تھی، جس میں شرط یہ تھی کہ جو مکہ سے مدینہ آئے گا اسے لوٹانا ہوگا اگرچہ وہ مسلمان ہو چکا ہو، لیکن آج کل یہ صورت نہ ہوگی۔ قاصدوں کو نہ روکنے کی جو بات آپ نے فرمائی، اس میں اشارہ ہے کہ یہ مطلق قاصدوں کے ساتھ خاص ہے لیکن مسلمان ہو کر آنے والوں کو واپس کرنے کی بات شرط پر موقوف ہے، اگر شرط نہ ہو تو انہیں واپس نہیں کیا جائے گا، لیکن قاصدوں کا حکم دوسرا ہے۔

آپ ﷺ کی سنت طیبہ یہ تھی کہ اگر آپ کے دشمن آپ کے کسی صحابی سے معاہدہ کر لیتے تو آپ اس معاہدہ کو جس سے مسلمانوں کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو برقرار رکھتے، جیسے کہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حسیل نے کفار کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ وہ نبی کریم

(۱) ابوداود: ۲۷۵۸، اس کی سند صحیح ہے۔

ﷺ کے ساتھ ان کے خلاف جنگ نہ کریں گے، تو آپ نے اسے جاری رہنے دیا، اور فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ، جو عہد کیا ہے اسے پورا کرو اور ہم کافروں کے مقابلہ میں صرف اللہ تعالی سے مدد چاہتے ہیں۔(۱)

قریش نے آپ سے دس سال کے معاہدہ (جنگ بندی) کرلیا اور یہ بھی شرط رکھ دی کی جو بھی مسلمان ہوکر (مدینہ) جائے اسے واپس کرنا ہوگا اور جو (مدینہ) سے (مکہ) چلا آئے اسے واپس نہ کریں گے(۲) مردوں اور عورتوں کے متعلق یہ الفاظ عام تھے، چنانچہ اللہ تعالی نے عورتوں کے متعلق یہ شق منسوخ فرمادی اور صرف مردوں کے حق میں رہنے دی۔ اور اللہ تعالی نے آپ کو اور مومنین کو حکم دیا کہ اگر ان کے پاس کوئی عورت آجائے تو اس کا امتحان لو۔ اگر مومنہ سمجھو تو اسے کفار کی طرف واپس نہ کرو، صرف اس کا مہر واپس کردیا جائے۔

آپ نے مسلمانوں کو حکم فرمایا کہ اگر کوئی عورت ہجرت کرکے ان کے پاس آجائے تو اسے اس کے مشرک شوہر کے پاس نہ لوٹائیں بلکہ صرف اس کا مہر واپس کردیں۔ اس سے یہ حکم معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کی ملکیت سے عورت کے نکلنے کی قیمت

(۱) مسلم: ۱۷۸۷

(۲) بخاری: ۲۹۴

دی جائے گی اور اس میں مہر مثل کے بجائے متعین مہر کا اعتبار ہوگا۔

اس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ کفار کے نکاح صحیح ہیں، اور مسلمان عورت کو کفار کی طرف واپس کرنا جائز نہیں ہے اگر چہ اس کی شرط بھی کسی معاہدہ میں لگا دی جائے، نیز مسلمان عورت کا کافر مرد سے نکاح جائز نہیں اور یہ کہ مسلمان مرد ہجرت کرنے والی عورت سے عدت پوری ہونے کے بعد نکاح کرسکتا ہے اور اس کے مہر کی ادائیگی کرنی ہوگی۔

نیز اس میں واضح دلیل ہے کہ عورت شوہر کی حقیت سے نکل جاتی ہے اور ہجرت سے نکاح فسخ ہوجاتا ہے، اور کافر عورت کا نکاح مسلمان مرد سے اور مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام ہے۔ اور یہ مسائل قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے بعض پر علماء کا اتفاق ہے اور بعض میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اس کو منسوخ جاننے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے شرط مردوں کے ساتھ خاص ہے، عورتیں اس میں داخل نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ان عورتوں کو واپس لوٹانے سے منع فرمایا ہے۔

آپ ﷺ نے مہر کو واپس کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ جس شخص کی عورت مسلمانوں کے پاس آجائے اسے مقررہ مہر دیا جائے گا۔ پھر یہ فرمایا کہ حکم بندوں کے

لئے دیا گیا ہے اور حکمت پر مبنی ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی دوسرا حکم آپ ﷺ سے منقول نہیں۔ آپ نے جب کفار سے مردوں کو واپس لوٹانے کی شرط پر مصالحت کی تو انہیں جوان کے پاس آئے، اسے لینے سے منع نہیں فرمایا، نہ اسے لوٹنے پر مجبور کیا، نہ اس کا حکم دیا۔ اسی طرح آنے والا اگر کافروں میں سے کسی کو قتل کر دیتا یا مال لے لیتا تو آپ اسے ناپسند نہ فرماتے اور کوئی ضمانت یا تاوان نہ دیتے کیونکہ ایسا کرنے والا آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتا تھا، اور اس کو آپ نے کسی کام کا حکم بھی نہیں دیا تھا، اور جان و مال کی امان سے متعلق جو معاہدہ صلح آپ نے کیا تھا اس کا تقاضا صرف یہ تھا کہ ماتحت لوگوں کی ذمہ داری قبول کی جائے جیسا کہ بنو جذیمہ کے لئے ان کے املاک و اموال کی ذمہ داری آپ نے اٹھائی تھی جو خالد رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ آپ نے خالد رضی اللہ عنہ کے فعل پر ناپسندیدگی اور اس سے براءت کا بھی اظہار کیا تھا۔(۱)

چونکہ خالد نے بطور تاویل ایسا کیا تھا اور نبی کریم ﷺ نے بنو جذیمہ کے غزوہ کا حکم فرمایا تھا، اس لئے تاویل و شبہ کی وجہ سے نصف دیت کا تاوان دیا گیا اور انہیں اہل کتاب کے حکم میں رکھا گیا۔ جو ذمہ کی وجہ سے تحفظ کے مستحق ہیں، اسلام کی بنیاد پر نہیں

(۱) بخاری:۴۳۳۹

۔اور صلح کے معاہدہ کا تقاضا یہ نہ تھا کہ ایسے لوگوں کے خلاف مدد کی جائے جن پر قبضہ نہیں ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاہدین سے اگر ایسے لوگ جنگ کریں جن پر امام کا قبضہ وتسلط نہ ہو، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں تو امام پر ان کو روکنا ضروری نہ ہوگا اور نہ نقصان کا تاوان واجب ہوگا،اور جنگ ،مصالح اور سیاست سے متعلق احکام کا نبی کریم ﷺ کی سیرت سے اخذ کرنا رائے اور قیاس کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

اس بنیاد پر اگر مسلمان بادشاہ اور ذمیوں کے مابین معاہدہ ہوتو دوسرے بادشاہ کے لئے جس کے ساتھ ذمیوں کا معاہدہ نہ ہو جائز ہوگا کہ ان پر حملہ کرے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ملطیہ کے نصرانیوں کے بارے میں فتوی صادر فرمایا تھا اور ابو بصیر کے واقعہ سے استدلال فرمایا تھا۔(۱)

اس طرح نبی کریم ﷺ نے اہل خیبر پر غلبہ اور فتح حاصل کرنے کے بعد ان سے معاہدہ کیا کہ وہ جلاوطن ہو جائیں البتہ اپنے اونٹوں پر لاد کر جتنا سامان لے جاسکتے ہوں لے جائیں۔باقی سونا چاندی اور ہتھیار آپ کی ملکیت ہوں گے۔

معاہدہ صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ کوئی چیز نہ چھپائیں، نہ غائب کریں، اگر ایسا کیا تو پھر نہ وہ مسلمانوں کے ذمہ میں رہیں گے، نہ معاہدہ صلح قائم رہے گا،لیکن انہوں نے

(۱) بخاری:۱۶۹۴

ایک مشک غائب کردی جس میں حیي بن اخطب کا مال تھا جسے وہ بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت اپنے ساتھ خیبر لے آیا تھا۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حیي بن اخطب کے چچا سے فرمایا: حیي جو مشک بنونضیر سے لایا تھا، اس کا کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ وہ اخراجات اور جنگوں میں ختم ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا معاہدے کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اتنا زیادہ کیسے خرچ ہوگیا؟ آخر رسول اللہ ﷺ نے اسے حضرت زبیر کے حوالے کیا تاکہ اسے محبوس رکھیں۔ انہوں نے اس پر سختی کی تو اس نے ایک ویرانے کی نشاندہی کی، چنانچہ وہاں گئے، تلاش کیا تو مشک مل گئی۔ ان کی اس عہد شکنی کے بعد نبی کریم ﷺ نے ابوحقیق کے دونوں بیٹوں کو قتل کرادیا۔ ان میں ایک حیي بن اخطب کی لڑکی صفیہ کا شوہر تھا، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا، اور ان کے اموال کو تقسیم کردیا، اور خیبر سے انہیں نکالنے کا فیصلہ فرمالیا۔ اس موقع پر یہودیوں نے کہا: آپ ہمیں رہنے دیجئے، ہم اس علاقہ سے خوب واقف ہیں، زمین کی کاشت کریں گے، چونکہ نبی کریم ﷺ یا آپ کے صحابہ کے پاس اس قدر آدمی بھی نہ تھے جو یہ ذمہ داری اٹھا سکتے چنانچہ آپ نے یہ علاقہ اس شرط پر ان کے سپرد کردیا کہ اس زمین کی جو پیداوار ہوگی اس کا نصف مسلمانوں کو اور نصف انہیں ملے گا۔ اور جب تک آپ چاہیں گے یہ لوگ یہاں آباد

رہیں گے(۱) بنوقریظہ کی طرح ان کا قتل عام نہ کیا کیونکہ بنوقریظہ کے تمام لوگ عہد شکنی میں شریک تھے لیکن ان لوگوں کا معاملہ مختلف تھا۔ان لوگوں نے مشک کو چھپا کر بدعہدی کی تھی شرط کے خلاف ورزی کی بنا پر قتل کئے گئے لیکن خیبر کے بقیہ یہودی چونکہ اس سے واقف نہ تھے اس لئے انہیں سزا نہیں دی گئی۔یہ ایسے ذمی اور معاہد کی مثال ہے جو بد عہدی کا مرتکب ہو اور اس میں دوسرے اس کا ساتھ نہ دیں۔

زمین کو نصف پیداوار پر دینا مساقات اور مزارعت کے جواز کی دلیل ہے اور اگر کھجور کا درخت ہو بھی اس صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کسی چیز کا جو حکم ہوتا ہے وہی اس کی نظیر کا بھی ہوتا ہے۔اس لئے انگور اور انجیر کے درختوں والے علاقہ کا جو حکم ہوگا وہی کھجور والے علاقہ کا بھی ہوگا، دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

نیز اس واقعہ سے یہ وضاحت بھی ہوجاتی ہے کہ مالک زمین کی جانب سے بیج دینا بھی ضروری نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے ایک حصہ پر مصالحت کی اور انہیں بیج نہیں دیا تھا اور یہ چیز اتنی قطعیت سے ثابت ہے کہ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ اگر زمین پر کام کرنے والے کی طرف سے بیج مہیا کرنے کی شرط لگادی جائے تو زیادہ مناسب

(۱) ابوداود:۳۰۰۶،اس کی سند صحیح ہے۔

ہوگا۔

جن لوگوں نے بیج کے لئے مالک زمین کی طرف سے ہونے کی شرط لگائی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں صرف انہوں نے مزارعت کو مضاربت پر قیاس کیا ہے، لیکن یہ بات خود ان کے خلاف ہے، کیونکہ مضاربت میں اصل پونجی مالک کو واپس مل جاتی ہے، اور پھر مالک اور کام کرنے والے دونوں نفع تقسیم کر لیتے ہیں، اور اگر مزارعت میں اس کی شرط لگا دی جائے تو ان کے نزدیک یہ باطل ہو جائے گی، کیونکہ انہوں نے بیج کو راس المال کی جگہ پر نہیں رکھا ہے، بلکہ اس کی حیثیت دیگر سبزیوں کی ہے چنانچہ بیج پانی اور منافع کا حکم رکھتا ہے، کیونکہ کھیتی تنہا اسی سے تیار نہیں ہوتی، بلکہ سینچائی اور دوسری محنت ضروری ہوتی ہے، بیج سڑتا ہے پھر اللہ تعالی اس کے ساتھ دوسرے اجزاء کو ملا کر کھیتی تیار کرتا ہے۔ان اجزا میں پانی، ہوا، دھوپ، مٹی، محنت سب داخل ہیں، اس لئے بیج کا حکم دوسرے اجزا جیسا ہے، نیز زمین راس المال کی نظیر ہے، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بیج کاشتکار ہی کو دینا چاہیئے، مالک زمین کو نہیں، مزارع کی وہی حیثیت ہے جو مضارب کی ہے۔اور سنت سے جو ثابت ہے وہ بالکل قیاس کے بھی موافق ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مصالحت وقت مقرر کئے بغیر بھی کی جا سکتی ہے، بلکہ امام کی صوابدید پر ہوگا، اور اس پر کہ کوئی چیز معاہدہ کو منسوخ کرنے والی سامنے

نہ آجائے لیکن ایسی صورت میں امام آگاہی کے بغیر دشمنوں سے جنگ نہیں کرسکتا، انہیں آگاہی دینی ضروری ہے تاکہ معاہدہ کے خاتمہ کا سب کو علم ہو جائے۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ متہم شخص کو سزا دی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالی اس پر قادر ہے کہ نبی کریم ﷺ کو بلا واسطہ خزانہ کا پتہ بتا دے، لیکن امت کے لئے متہم لوگوں کے حق میں قانون بنانے کے ارادہ سے مذکورہ صورت پیدا کی گئی، اور رحمت وآسانی کے لئے احکام میں گنجائش کی راہ نکالی گئی۔

اس واقعہ میں قرینہ کے اعتبار کا بھی ثبوت ملتا ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ (مدت مختصر اور مال زیادہ تھا پھر کیسے خرچ ہو جائے گا) اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام نے بھی لڑکے کی ماں کو متعین کرنے میں یہی صورت اختیار کی تھی (۱) نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ واقعہ داستان گوئی کے لئے نہیں سنایا تھا، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ احکام میں اس سے عبرت اندوز ہوں۔

اسلام میں قسامت کا حکم اور قتل کے مدعی کی قسم کو مقدم کرنے کا دارومدار بھی ظاہری قرائن پر ہے۔ لعان میں شوہر کی شہادت کے بعد اگر بیوی شہادت سے مکر جائے تو اس کو

(۱) بخاری: ۶۷۶۹، اور مسلم: ۱۷۲۰

رجم کرنے کے حکم کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔

اس سے سفر کی وصیت کے بارے میں مسلمانوں سے متعلق اہل کتاب کی شہادت بھی ہے، اور یہ کہ میت کے دونوں ولی اگر وصی کی کسی خیانت سے واقف ہو جائیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ قسم کھائیں اور مال کو لے لیں۔ اس روش میں یہ فتوی بھی ہے کہ جس شخص کا مال چوری ہوا ہے وہ اگر کسی مشہور خائن کے ہاتھ میں اپنا کچھ مال دیکھے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کسی دوسرے سے خریدا ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ بقیہ مال کی اس کے پاس موجودگی کے لئے قسم کھا لے اور کہے کہ وہی چور ہے کیونکہ ظاہری طور پر ملوث ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

اسی کی نظیر قسامت میں مقتول اولیاء کا حلف ہے، بلکہ مال کا معاملہ ثابت ہو جاتا ہے، لیکن خون کے لئے ایسا نہیں ہے۔ قرآن وسنت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور جو لوگ نسخ کے مدعی ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں کیونکہ یہ حکم سورہ مائدہ کا ہے، اور وہ آخری زمانہ میں نازل ہوئی تھی، اس کے مطابق صحابہ کرام نے بھی فیصلے کئے ہیں۔

یہی چیز حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں گواہی دینے والے شخص کے اس استدلال میں بھی ملتی ہے جو اس نے اس قمیص سے کیا تھا۔ اللہ تعالی نے اس واقعہ کو چونکہ تثبت کے طور پر ذکر کیا ہے، اس لئے اس کی اتباع کی جائے۔

آخر کار جب آپ ﷺ نے یہود کو خیبر میں قیام کی اجازت مرحمت فرما دی، آپ ہر سال ایک اندازہ کرنے والا وہاں بھیجتے جو پیداوار کا اندازہ کرتا اور معائنہ کے بعد مسلمانوں کا حصہ الگ کر دیتا۔ باقی پر تصرف میں وہ آزاد ہوتے اور ایک ہی اندازہ کرنے والا کافی ہوتا تھا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کھجور کے پھلوں کی طرح دوسرے پھلوں کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس سے شرکاء کا حصہ متعین ہو جائے، خواہ ابھی یہ نہ پتہ چلے کہ نمو کی صلاحیت کس میں ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم علیحدگی ہے، بیع نہیں اور اندازہ و تقسیم کرنے والا ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے، اور یہ کہ جس کے ہاتھ میں پھل ہے، وہ اندازہ کے بعد اس میں تصرف کر سکتا ہے، جب کہ اپنے شریک کے حصہ کا محافظ ہو۔ جب عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان کے لڑکے عبداللہ رضی اللہ عنہ خیبر کا مال لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ یہودیوں نے انہیں تکلیف دی اور مکان سے نیچے گرا دیا جس سے ان کا ہاتھ اکھڑ گیا اور انہوں نے مال دینے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کی طرف جلا وطن کر دیا اور خیبر کے علاقہ کو صلح حدیبیہ اور فتح خیبر دونوں میں شریک صحابہ میں تقسیم کر دیا۔

فصل (٦٥)

آپ ﷺ کا عقد ذمہ اور جزیہ وصول کرنے کا طریقہ

ہجرت کے آٹھویں سال سورہ براءت کے نازل ہونے سے قبل تک آپ ﷺ نے کفار سے جزیہ وصول نہیں کیا تھا۔ جب جزیہ کی آیت نازل ہوئی تو آپ نے مجوسیوں اور اہل کتاب سے جزیہ وصول فرمایا(۱)، لیکن خیبر کے یہودیوں سے کچھ نہیں لیا، چنانچہ بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ اہل خیبر کے لئے یہ حکم مخصوص ہے، لیکن یہ بات عدم تفقہ کی علامت ہے، کیونکہ آپ نے ان سے آیت جزیہ نازل ہونے سے پہلے صلح کر لی تھی۔

پھر اللہ تعالی کا حکم نازل ہوا کہ آپ اہل کتاب سے جنگ کریں یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں۔ اس لئے اہل خیبر اس میں داخل نہیں ہوئے، کیونکہ ان سے پرانا معاہدہ چلا آ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک مقررہ حصہ پر خیبر کی زمین پر کام کرتے رہیں گے۔ اس لئے ان سے اس کے سوا کچھ مطالبہ نہ ہوا اور دوسرے اہل کتاب پر جزیہ لازم کیا گیا جن کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

جب عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کی طرف جلا وطن کر دیا تو خیبر کی زمین کی

(۱) بخاری:۳۱۵۶

کاشت وغیرہ کے متعلق سابقہ معاہدہ بھی بدل گیا اور یہود خیبر کی حیثیت بھی دوسرے اہل کتاب کی سی ہوگئی۔ بعض حکومتوں کے دور میں جب شریعت وسنت پر عمل کم ہوگیا تھا، بعض لوگوں نے ایک مکتوب کا انکشاف کیا جو بظاہر قدیم معلوم ہوتا تھا لیکن جعل سازی سے تیار کیا گیا تھا جس میں تحریر تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اہل خیبر پر سے جزیہ ساقط کردیا تھا، اور اس مکتوب میں علی بن ابی طالب، سعد بن معاذ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کی شہادت موجود تھی۔

اسی وجہ سے اس مکتوب کو جاہلوں کی ایک جماعت نے صحیح سمجھ لیا اور اس پر عمل کرنے لگے۔ آخر میں اس مکتوب کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے پاس بھیجا گیا اور ان سے اس کے مطابق عمل کرنے میں مدد چاہی گئی تو انہوں نے اس پر تھوک دیا اور اس کے باطل اور جھوٹے ہونے پر دس دلیلیں پیش کی:

پہلی دلیل: حضرت سعد خیبر کی فتح سے پہلے وفات پا چکے تھے۔

دوسری دلیل: جزیہ کا حکم اس وقت نازل نہیں ہوا تھا۔

تیسری دلیل: اس مکتوب میں بیکار اور سخت زمین کے ساقط کرنے کا ذکر ہے، حالانکہ یہ چیزیں آپ کے زمانہ میں مقرر نہ تھیں بلکہ بعد کے ظالم بادشاہوں نے انہیں مقرر کیا تھا اور بعد تک مقرر رہیں۔

چوتھی دلیل: اس مکتوب کا کسی عالم نے ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کسی سیرت وحدیث کی کتاب میں اس کا تذکرہ ہے، اور نہ سلف کے زمانہ میں یہودیوں نے اسے پیش کیا، کیونکہ انہیں علم تھا کہ وہ لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں، لیکن جب سنت کا علم کم ہوگیا تو بعض لوگ تحریف شدہ مکتوب کو سامنے لے آئے اور بعض خیانت پسندوں نے ان کی مدد کی مگر اللہ تعالی نے اس خیانت کا پردہ فاش کردیا اور رسول اللہ ﷺ کے خلفاء نے اس کے باطل ہونے کو واضح کردیا۔

آپ ﷺ نے بت پرستوں سے جزیہ وصول نہیں کیا۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ مذکورہ لوگوں کے علاوہ باقی کفار سے جزیہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ اہل کتاب اور دیگر کفار سے بھی جزیہ وصول کیا جائے گا۔ پہلا قول امام شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بھی اس کے موید ہیں۔

دوسرا قول امام ابوحنیفہ کا ہے اور دوسری روایت کے مطابق امام احمد کا بھی ہے۔

دوسرے قول کے حامی کہتے ہیں، آپ نے عرب کے بت پرستوں سے جزیہ وصول نہیں کیا، کیونکہ یہ حکم نازل ہونے سے قبل عرب کے تمام بت پرست اسلام لا چکے تھے اور وہاں کوئی بھی بت نہ رہا تھا اور بت پرست مشرک موجود نہ تھے۔ یہی وجہ ہے فتح مکہ کے بعد آپ نے تبوک میں عیسائیوں کے ساتھ جہاد کیا۔ اگر سرزمین عرب میں مشرکین

ہوتے تو اتنی دور جانے کے بجائے مشرکین سے جہاد کرنا زیادہ اولی تھا۔ جو شخص تاریخ غزوات اسلام سے روشناس ہے وہ بآسانی سمجھ لے گا کہ معاملہ یوں ہی تھا، پس ان سے جزیہ اس لئے نہیں لیا گیا کہ جن سے لینا تھا ان کا وجود ہی مفقود ہو چکا تھا۔

البتہ آپ ﷺ نے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے، یہ بات صحیح نہیں کہ ان کے پاس کوئی کتاب تھی جسے اٹھا لیا گیا ہے۔ آتش پرستوں اور بت پرستوں میں کچھ فرق نہیں، بلکہ بت پرست آتش پرستوں کی نسبت قدرے بہتر ہیں، کیونکہ ان میں دین ابراہیمی کا تمسک یک گونہ ظاہر ہوتا ہے اور آتش پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علانیہ دشمن تھے، اور سنت نبویہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب مشرکین میں سے کسی دشمن سے دوچار ہو تو اسے تین باتوں میں سے کسی ایک بات ماننے کی دعوت دو، اگر وہ ان میں سے کسی کا انتخاب کرے تو اسے قبول کرلو۔الخ''(۱)

علاوہ ازیں مغیرہ نے کسری کے گورنر سے بھی فرمایا تھا کہ ''نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم تم سے جنگ کریں یہاں تک کہ تم اللہ کی عبادت کرو یا جزیہ ادا کرو''(۲)

---

(۱)مسلم:۱۷۳۱

(۲)بخاری:۳۱۵۹

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی قریش سے فرمایا تھا کہ کیا تم عرب ایک کلمہ کا اقرار کرلو گے؟ کہ جس کی وجہ سے عجم والے تمہیں جزیہ دیا کریں گے۔ وہ کہنے لگے وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''لا الہ الا اللہ'' (۱)

آپ نے نجران کے نصاری سے دو ہزار جوڑوں پر مصالحت فرمائی تھی اور یہ کہ وہ لوگ عاریۃً تیس زرہیں تیس گھوڑے اور تیس اونٹ اور ہر قسم کے تیس ہتھیار دیں جس کو مسلمان جہاد میں استعمال کریں اور انہیں واپس کریں۔ اس اثنا میں وہ اس تمام سامان کے ضامن بھی ہوں گے اس کے بدلے ان کی عبادت گاہیں نہیں گرائی جائیں گی، نہ ان کے پادریوں کو باہر نکالا جائے گا، نہ انہیں اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا، بشرطیکہ وہ کوئی شرارت نہ کریں یا سود نہ کھائیں (۲) اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرارت یا سود خوری سے ذمی کا عہد ٹوٹ جاتا ہے، اگر یہ عہد مشروط ہو۔

جب معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے یمن کی طرف بھیجا تو حکم دیا کہ ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کی قیمت کے برابر معافری لے لو (۳) (معافری یمن میں کپڑوں کی ایک قسم

---

(۱) ترمذی: ۳۲۳۰، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) ابوداود: ۳۰۴۱ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔

(۳) ابوداود: ۱۵۷۶، اس کی سند صحیح ہے۔

ہے)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ میں جنس یا مقدار کی قید نہیں ہے۔ کپڑے، سونا، زیورات ہر چیز لی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کی ضروریات کے مطابق اس کی مقدار میں کمی بیشی بھی جائز ہے، اور ذمی کے حالات کا بھی لحاظ کیا جاسکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین نے عرب وعجم کے جزیہ میں تفریق نہیں فرمائی ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ہجر کے ان مجوسیوں سے بھی جزیہ وصول فرمایا ہے جو عرب تھے، کیونکہ عرب اس وقت ایک ایسی قوم تھی جس کے پاس کوئی الٰہی کتاب نہ تھی اور لوگ اپنے پڑوسی قوموں کے دین پر چل رہے تھے، چنانچہ بحرین کے عرب مجوسی تھے کیونکہ ان کے پڑوس میں فارس کا علاقہ تھا۔اور تنوخ وبہرہ اور بنوتغلب عیسائی تھے کیونکہ یہ رومیوں کے پڑوس تھے۔اور یمن کے قبائل یہود یمن کی مجاورت کے باعث یہودی تھے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ان پر جزیہ کے احکام نافذ فرمائے اور ان کے آباء واجداد کا اعتبار نہیں کیا نہ اس بات کا خیال فرمایا کہ یہ لوگ اہل کتاب کے دین میں کب داخل ہوئے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ بعض انصاریوں کی اولاد نے عیسی علیہ السلام کی شریعت کے ذریعہ یہودی مذہب کی منسوخی کے بعد اسے قبول کرلیا تھا۔ان کے باپ نے انہیں زبردستی اسلام میں داخل کرنا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾(۱)

دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں۔

نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی ''ہر بالغ سے ایک دینار لینا'' اس بات کی دلیل ہے کہ بچوں اورعورتوں سے جزیہ نہ لیا جائے گا۔

اورجس روایت میں '' من کل حالم او حالمة'' یعنی ہر بالغ مردوعورت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ موصول نہیں بلکہ منقطع روایت ہےاوراس اضافہ کا دیگرراویوں نے ذکرنہیں کیا ہے۔ممکن ہے بعض راویوں کی تفسیر سے اس کا اضافہ ہوگیا ہو۔

(۱)سورۃ البقرۃ:۲۵۶

فصل (٦٦)

آپ ﷺ کا بعثت سے وفات تک کفار ومنافقین کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

آغاز نبوت میں اللہ تعالی نے سب سے پہلے آپ ﷺ پر جو وحی بھیجی ،اس میں یہ ہدایت تھی:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾[العلق:١]

یعنی اپنے اس رب کے نام سے پڑھئے جو سب کا خالق ہے، جو آپ کی نبوت کی شہادت تھی۔ پھر آپ پر یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ﴾[المدثر:١-٢]

اے کملی والے اٹھئے اورڈرایئے۔

جو آپ کی رسالت کا اعلان تھا۔ اس کے بعد پھر آپ کو حکم ملتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو ڈرایئے اور اپنی قوم اور سارے عربوں اور تمام جہاں والوں کو ڈرایئے۔ چنانچہ آپ ﷺ بعثت کے بعد دس سے کچھ زیادہ برس بغیر جنگ کے تبلیغ ودعوت دین کا کام کرتے رہے اور آپ کو صبر ودرگزر کرنے کا حکم دیا جاتا رہا۔اس کے بعد آپ ﷺ کو ہجرت کی اجازت ملی اور قتال وجہاد کی بھی اجازت اس طرح ملی جو آپ سے قتال کرے اس سے آپ قتال کریں۔ پھر عمومی طور پر قتال وجہاد کا حکم ہوا تا کہ پورا دین اللہ کے

لئے ہو جائے۔اب جہاد کی اجازت کے بعد کفار کی تین قسمیں ہو گئیں:

ایک وہ جن سے آپ نے صلح ومعاہدہ کر لیا تھا۔

دوسرے وہ جن سے جنگ ہوتی رہی۔

تیسرے وہ جن سے جزیہ ادا کرنے کا معاملہ طے ہو گیا۔

اس کے بعد اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو ہدایت دی گئی کہ مصالحین اور معاہدین سے عہد پورا کیا جائے اور جو عہد و پیمان توڑ دے،اس سے قتال کیا جائے۔

سورہ براءت میں تینوں قسموں کے متعلق احکامات واضح کر دیئے گئے۔اس میں اہل کتاب سے متعلق فرمایا گیا کہ ان سے جنگ کی جائے یا پھر وہ جزیہ ادا کریں یا اسلام قبول کریں،اور منافقین سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا،چنانچہ آپ ﷺ نے کفار کے ساتھ تلوار سے اور منافقین کے ساتھ دلائل سے جہاد فرمایا کفار کے معاہدوں سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے ان کی تقسیم کر دی۔

ایک قسم کے ساتھ قتال کا حکم دیا۔یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے عہد شکنی کی اور اپنے وعدے پر قائم نہ رہے۔

دوسری قسم وہ تھی جنہوں نے عہد شکنی نہ کی اور ان کے معاہدے وقتی تھے۔آپ نے ان سے جہاد نہ فرمایا بلکہ ان کے متعلق معاہدوں کی میعاد پوری کرنے کا حکم دیا۔

تیسری قسم وہ تھی جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا، یا ان کے معاہدے مطلق تھے، اور انہوں نے آپ کے ساتھ جنگ بھی نہ کی تھی۔ ان کے متعلق یہ حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے۔ جب یہ مدت گزر جائے تو پھر ان سے جنگ کی جائے۔ مندرجہ ذیل آیت میں اس مدت کا ذکر ہے:

﴿فَسِيحُوا فِي الأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ﴾ [التوبة:٢]

زمین میں چار ماہ چلو پھرو۔

ذیل کی آیت میں حرمت والے مہینوں سے یہی مراد ہے:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ﴾[التوبة:٥]

جب حرمت والے مہینے گزر جائیں۔

ان مہینوں کی ابتداء دسویں ذی الحجہ سے ہے اور ربیع الآخر کی دس تاریخ کو چار ماہ پورے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی کا قول " منها اربعة حرم" میں جو چار مہینوں کا ذکر ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے، کیونکہ ان میں ایک رجب کا مہینہ تنہا ہے اور تین ایک ساتھ یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، اور محرم۔ ان مہینوں میں مشرکین کو چلنے پھرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، کیونکہ ایک ساتھ نہ ہونے سے ایسا ممکن نہ تھا، اور نبی کریم ﷺ کو ان مہینوں کے گزرنے کے بعد جنگ کا حکم تھا، چنانچہ عہد شکنی کرنے والوں سے آپ نے جنگ کی

اور جن سے معاہدہ نہ تھا انہیں اور جن سے بلا تعین مطلق معاہدہ تھا انہیں چار مہینے کی مہلت دی، عہد پورا کرنے والوں کے بارے میں آپ ﷺ کو وفا کا حکم تھا پھر یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اسی طرح ذمیوں پر جزیہ مقرر کیا۔ معاملہ کے اعتبار سے اس طرح تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک جنگ کرنے والے، دوسرے وہ جن سے معاہدہ تھا، اور تیسرے وہ جو ذمی تھے۔ اس طرح تمام اہل زمین تین قسموں میں بٹ گئے۔ ایک مسلمان جن کا آپ پر ایمان تھا۔ دوسرے مصالحین جنہیں آپ سے کوئی خوف نہ تھا۔ تیسرے محاربین جنہیں آپ کی طرف سے ڈر لگا رہتا تھا۔

منافقین کے متعلق آپ کا طریق کار یہ تھا کہ اللہ تعالی نے آپ کو ظاہر اعمال کو قبول کرنے اور باطن کے حالات اللہ کے سپرد کرنے کا حکم دیا، اور اس بات کا حکم دیا کہ ان سے علم اور دلیل کے ساتھ مناظرہ کیا جائے اور ان سے اعراض اور سختی برتنے کا حکم ہوا اور اچھے انداز سے انہیں سمجھانے کا حکم ہوا، اور ان کا جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے منع فرما دیا اور یہ ارشاد ہوا کہ: اگر ان کے لئے بخشش طلب کریں پھر بھی اللہ تعالی انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔

فصل (٦٧)

آپ ﷺ کا صحابہ کرام کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ہمراہ رکھئے جو اپنے پروردگار کو صبح وشام یاد کرتے ہیں اور اس کی رضا چاہتے ہیں۔ مزید حکم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی نگاہ نہ ہٹے۔ انہیں معاف کریں۔ ان کے لئے بخشش طلب کریں اور مشورہ لیتے رہیں اور ان کے حق میں دعا کرتے رہیں۔ دوسری طرف یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ ان میں سے جو نافرمانی کرے اور جہاد سے پیچھے رہ جائے اس کو چھوڑ دیں، یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے اور آپ کی اطاعت کرے جیسا کہ آپ نے تین پیچھے رہنے والوں سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

نیز آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ شرفاء اور دوسروں پر یکساں حد جاری فرمائیں، آپ کو یہ بھی ہدایت تھی کہ بروں اور جاہلوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ برائی کا احسان سے، جہالت کا حلم سے، ظلم کا عفو درگزر سے، قطع رحمی کا صلہ رحمی سے بدلہ دیں۔ ایسے برتاؤ اور معاملہ سے دشمن بھی مخلص دوست بن جائیں گے۔

جنات وشیاطین سے بچنے کے لئے آپ کو استعاذہ کا حکم دیا گیا، اوران تمام اخلاق حسنہ کا ذکر سورہ اعراف، مؤمنون اور حم سجدہ کے تین مقامات پر آیا ہے۔ اس لئے حاکم کا

رعایا کے ساتھ تین قسم کا معاملہ ہوتا ہے۔ان کے اوپر اس کا لازمی حق ہوتا ہے اور حاکم انہیں حکم دیتا ہے۔ایسی صورت میں کوتاہی یا زیادتی کا بھی امکان ہے۔اس لئے اللہ تعالی نے یہ حکم دیا کہ اپنے حق کو لینے میں آپ ان کی سہولت کا خیال رکھیں اور اس کا نام عفو ہے۔اسی طرح آپ کو حکم تھا کہ انہیں معروف کا حکم دیں اور ایسی باتوں کا جنہیں عقول سلیمہ اور فطرت مستقیمہ جانتی ہو۔اسی طرح اپنے حکم میں آپ سختی بھی نہ کریں، آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ ان کی جہالت کے مقابلہ میں اعراض و بے توجہی سے کام لیں۔

یہ ہے روئے زمین پر بسنے والے جنوں، انسانوں، مومنوں اور کافروں کے ساتھ آپ کی سیرت طیبہ اور معاملہ حسنہ کا خاکہ۔

فصل (٦٨)

آپ ﷺ کے غزوات کا بیان

نبی کریم ﷺ نے اسلام کا پہلا لشکر ہجرت کے ساتویں ماہ رمضان کے مہینے میں روانہ فرمایا، جس کا پرچم حمزہ بن عبدالمطلب کو دیا تھا۔ آپ نے مہاجرین میں سے تیس صحابہ کو شام سے آنے والے قریش کے قافلے کے مقابلہ میں ارسال کیا، جس میں ابو جہل تین سو آدمیوں کے ہمراہ آ رہا تھا، جب دونوں فریقین آمنے سامنے ہوئے تو محدی بن عمرو الجہنی نے جو دونوں فریق کا حلیف تھا کوشش کر کے بیچ بچاؤ کیا اور جنگ نہ ہوئی۔

پھر ہجرت کے آٹھویں ماہ شوال کے آخر میں عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک چھوٹا سا لشکر وادی رابغ کی طرف روانہ کیا، جس میں صرف مہاجرین ساٹھ کی تعداد میں شریک تھے، اور ابوسفیان سے وادی رابغ میں مقابلہ ہوا جس کے ہمراہ دوسو آدمی تھے۔ اس جنگ میں تیراندازی ہوئی، تلوار نہ چلی، نہ باقاعدہ جنگ ہوئی۔ اسے صرف مڈبھیڑ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے۔ اللہ کے راستہ میں انہوں نے سب سے پہلے تیر مارا۔ ابن اسحاق نے اس کو حمزہ کے لشکر سے پہلے ذکر کیا ہے۔

پھر ہجرت کے نویں ماہ آپ نے بیس سواروں کو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

کی قیادت میں خرار کی طرف بھیجا۔اس کا مقصد قریش کا ایک قافلہ تھا، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قافلہ جا چکا ہے۔ پھر آپ ﷺ بنفس نفیس غزوہ ابواء میں شریک ہوئے۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں آپ ﷺ شریک ہوئے۔آپ صرف مہاجرین کے ساتھ نکلے۔قریش کے ایک قافلہ کی تلاش تھی لیکن مزاحمت کی نوبت نہ آئی۔پھر آپ اسی سال ماہ ربیع الاول میں دوسو صحابہ کو لے کر ابواط کی طرف غزوہ میں نکلے،قریش کا ایک قافلہ مقصود تھا لیکن مزاحمت کے بغیر ہی واپس آ گئے۔

پھر آپ ﷺ ہجرت کے تیرہویں ماہ کرز بن جابر کے تعاقب میں نکلے۔جس نے مدینہ میں مویشیوں پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جب آپ ﷺ بدر کی جانب وادی سفوان پہنچے تو وہ بچ کر نکل چکا تھا۔

پھر آپ ﷺ ہجرت کے سولہویں ماہ ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ قریش کے ایک قافلہ سے معارضت کے لئے نکلے جو شام کی طرف جا رہا تھا۔ جب آپ حضرات ذوالعشیرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ قافلہ گزر گیا ہے۔یہی قافلہ جب شام سے واپس آنے لگا تو پھر آپ اس کے طلب میں نکلے اور بدر کا واقعہ پیش آیا۔

پھر آپ ﷺ نے ہجرت کے سترہویں ماہ رجب میں عبداللہ بن جحش اسدی کو وادی نخلہ کی طرف بارہ آدمیوں کے ہمراہ ارسال کیا۔دو دو آدمی ایک ایک اونٹ پر سوار

ہوتے تھے۔ چنانچہ قریش کے ایک قافلہ سے جنگ کے لئے وادی نخلہ میں پہنچ گئے۔ راستہ میں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کی سواری کا اونٹ گم ہوگیا، اور وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور عبداللہ بن جحش دور نکل گئے۔ جب اسلامی لشکر وادی نخلہ میں داخل ہوا تو قریش کا قافلہ ان کے پاس سے گزرا، مسلمانوں نے سوچا کہ آج رجب کی آخری تاریخ ہے اور اگر ہم انہیں چھوڑ دیں گے تو حرم میں داخل ہو جائیں گے۔

آخر میں مسلمانوں نے حملہ کا فیصلہ کیا۔ کسی نے عمرو بن حضرمی کو تیر مارا اور وہ قتل ہوگیا اور عثمان وحکم کو گرفتار کرلیا گیا اور نوفل بھاگ گیا۔ یہ لوگ قافلہ کا سامان اور قیدی لے کر حاضر خدمت ہوئے اور خمس نکال کر الگ کرلیا۔ اسلام میں یہ پہلا خمس اور پہلا قتل اور پہلے دونوں قیدی تھے۔

نبی کریم ﷺ نے اس فعل سے ناراضگی اور بیزاری کا اعلان کیا۔ قریش اس واقعہ سے بھڑک اٹھے اور انہیں موقع ہاتھ لگ گیا، چنانچہ وہ کہنے لگے، محمد ﷺ نے ماہ حرام میں قتل کو جائز قرار دیا اور مسلمانوں پر بھی اس واقعہ کا سخت اثر ہوا۔ آخر کار اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۲۱]

لوگ آپ سے حرمت والے مہینہ میں جنگ سے متعلق سوال کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے بتایا کہ یہ وہ بات ہے جس کو تم نے منکر سمجھا، یہ اگر چہ برائی ہے لیکن کافروں نے اللہ کا کفر کیا، اس کی راہ سے اور اس کے گھر سے روکا، اور اس کے اہل مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا۔ نیز جس شرک پر تم قائم ہو اور جو تمہاری طرف سے فتنے بپا کئے گئے، یہ ساری باتیں ماہ حرام میں قتال سے بھی زیادہ بری اور سنگین ہیں۔

اکثر مفسرین نے اس آیت میں فتنہ کی تفسیر شرک سے کی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا شرک ہے جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور جو اسے نہ مانے اسے سزا دی جاتی ہے، اس لئے جہنم میں ان سے کہا جائے گا:

﴿ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ﴾[الذاریات:١٤]

اپنے فتنہ کا مزہ چکھو۔

ابن عباس کا قول ہے کہ اس آیت میں فتنہ سے تکذیب مراد ہے اور اس کی حقیقت یہ کہ اپنے فتنہ کا انجام چکھو، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا کہ:

﴿ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ﴾[الزمر:٢٤]

اپنی کمائی کا مزہ چکھو۔

اس سے اللہ تعالی کا یہ قول ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾[البروج: ١٠]

بیشک وہ لوگ جنہوں نے فتنہ میں ڈالا مومن مردوں اور مومن عورتوں کو۔

اس آیت میں فتنہ کی تفسیر مومنوں کو آگ میں جلانے سے کی گئی ہے لیکن یہ لفظ اس سے زیادہ عام ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مومنوں کو ان کے دین کے سلسلہ میں فتنہ میں ڈالنے کے لئے عذاب میں مبتلا کیا اور قرآن کی جن آیتوں میں فتنہ کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:

﴿وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ﴾[الأنعام:٥٣]

ہم نے بعضوں کو بعض کے ذریعہ سے آزمایا ہے۔

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ﴾[الأعراف:١٥٥]

یہ سب تیری آزمائش ہے۔

اس سے نعمتوں اور مصیبتوں کے ذریعہ بندوں کی آزمائش مراد ہے۔ یہ فتنہ کا ایک رنگ ہے، اور مشرکین کا فتنہ اس سے مختلف ہے اور اسی طرح مومن کا مال واولاد کے بارے میں فتنہ ایک اور چیز ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو فتنہ ہوا جیسے جنگ جمل اور جنگ صفین ان میں اس کا رنگ بھی ہے، ایسے فتنے کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا حکم یہ ہے کہ دونوں فریق سے علیحدہ رہا جائے۔

کبھی فتنہ سے مراد گناہ بھی ہوتا ہے،جیسا کہ اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے کہ:

﴿أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا﴾[التوبة:٤٩]

خبردار یہ لوگ فتنہ میں گر پڑے۔

یعنی یہ لوگ نفاق کے فتنہ میں پڑ گئے اور رومی عورتوں کے فتنہ کے مقابلہ میں اسے اختیار کرلیا۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کیا ہے،اور اپنے محبوب بندوں کو اپنی مغفرت سے مایوس نہیں کیا کہ اگر ان سے غلطی تاویل یا تقصیر سے ہوجائے تو اسے توحید،فرمانبرداری اور ہجرت کے صلہ میں معاف کردیا جائے گا۔

فصل (٦٩)

غزوہ بدر کا عظیم اور تاریخی معرکہ

ہجرت کے دوسرے سال ماہ رمضان میں نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی کہ شام سے قریش کا ایک قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں آرہا ہے، تو آپ نے لوگوں سے نکلنے کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے زیادہ اہتمام نہیں کیا، بلکہ جلدی میں تین سو تیرہ سے کچھ زائد صحابہ کرام کے ساتھ نکلے، جن کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے اور لوگ باری باری ان پر سوار ہوتے تھے۔

ادھر ابوسفیان کو نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کی اطلاع مل چکی تھی اور اس نے قافلہ کے تحفظ کے لئے مکہ اطلاع بھجوادی۔ جب اہل مکہ کو اطلاع ملی تو وہ نکل کھڑے ہوئے ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ بَطَراً وَرِئَاءِ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ ﴾[الأنفال:٤٧]

اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہوئے۔

اللہ تعالی نے دونوں فریق کو بغیر سابقہ تیاری و وعدہ کے جمع کردیا چنانچہ ارشاد ہے کہ:

﴿ وَلَوْ تَوَاعَدتَّمْ لاَخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ﴾[الأنفال:٤٢]

اگر تم باہم وعدہ کرتے تو وقت میں اختلاف کر بیٹھتے۔

جب نبی کریم ﷺ کو قریش کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا تو مہاجرین نے اس موقع پر لائق تحسین نقطہ نظر یہ پیش کیا، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ بھی استفسار پر انہوں نے غیر معمولی ایثار وقربانی پیش کرنے کا یقین دلایا۔ اس پر انصار سمجھ گئے کہ روئے سخن ان کی طرف ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر انصار کے موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

اے اللہ کے رسول! آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ حکم فرمائیں گے تو ہم اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ﷺ برک غماد تک ہمیں جانے کا حکم فرمائیں گے تو ہم ضرور وہاں تک جائیں گے۔

اسی طرح مقداد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کی طرح جواب نہ دیں گے، بلکہ آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر دشمنوں سے جنگ کریں گے۔

صحابہ کرام کا یہ جواب سن کر نبی کریم ﷺ بے حد خوش ہوئے، اور فرمایا کہ چلو خوشخبری حاصل کرو۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے اور میں کافروں کی جائے ہلاکت دیکھ چکا ہوں۔

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ برابر پیش قدمی کرتے چلے آرہے تھے یہاں تک کہ بدر کے قریب پہنچ گئے اور مشرکین کے دستے بھی سامنے آگئے ،تو اللہ کے رسول ﷺ نے بارگاہ ربانی میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کردی اور اللہ تعالی سے مدد ونصرت طلب فرمائی اور تمام مسلمانوں نے بھی تضرع وزاری کے ساتھ مدد چاہی۔ پھر اللہ تعالی نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ: (میں آپ کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد بھیج رہا ہوں جو یکے بعد دیگرے پہنچیں گے)۔(سورۃ الانفال:۹)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ایک ہزار فرشتوں کے اترنے کا ذکر ہے جبکہ سورہ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے اترنے کا ذکر ہے؟ تو اس کے دو جواب دیے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ دوسری آیت کا تعلق جنگ احد سے ہے،اور اس میں ایک لگائی گئی شرط ہے جس کے فوت ہونے سے امداد کا وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا بھی تعلق غزوہ بدر سے ہے اور آیت کا سیاق اس کی دلیل ہے۔سورہ آل عمران کی آیت :۱۳۲ سے ۱۳۵ تک میں یہی مذکور ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کی دعا پر پہلے ایک ہزار فرشتوں سے مدد ہوئی ،پھر تین ہزار کے ذریعہ اور پھر پانچ ہزار کے ذریعہ اس طرح مختلف مراحل پر امداد کا اثر خوشگوار ہوا اور

مومنوں کو ڈھارس ملتی رہی۔

پہلے فریق کا کہنا ہے کہ واقعہ غزوہ احد کے سیاق کا ہے اور بدر کا ذکر درمیان میں آیا ہے۔اللہ تعالی نے بدر کے موقع پر اپنی نعمت یاد دلائی ہے، پھر احد کے قصہ کو بیان کیا ہے، اور نبی کریم ﷺ سے ﴿أَلَن يَكْفِيَكُم﴾ فرمایا ہے، پھر یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر مسلمان صبر اور تقوی اختیار کریں گے تو اللہ تعالی پانچ ہزار فرشتوں سے ان کی مدد فرمائے گا۔

اس طرح یہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے اور بدر میں جس امداد کا ذکر ہے وہ اللہ تعالی کا قول ہے۔اس میں پانچ ہزار کا ذکر ہے اور بدر کی امداد ایک ہزار سے ہوئی تھی۔ پہلی امداد مشروط تھی اور دوسری مطلق۔

سورہ آل عمران میں احد کا واقعہ مفصل مذکور ہوا ہے اور بدر کا ذکر درمیان میں آ گیا ہے اور سورہ انفال میں بدر کے واقعہ کا مفصل ذکر ہوا ہے۔اس طرح آل عمران اور انفال دونوں سورتوں کا سیاق مختلف ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ﴿وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا﴾ [آل عمران:۱۲۵] سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ احد کا دن ہے اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مذکورہ امداد اسی دن ہوئی تھی۔اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس تعداد کے ساتھ بدر کے دن امداد ہوئی تھی اور فوری طور پر آنے کا تعلق

احد کے دن سے ہے۔

جب قریش جنگ کا پختہ ارادہ کر کے نکلے تھے تو انہیں اپنے اور بنی کنانہ کے درمیان دشمنی کا خیال ہوا، چنانچہ ابلیس سراقہ بن مالک کی شکل میں ان کے پاس آیا۔ سراقہ بنی کنانہ کا ایک بڑا سردار تھا، کہنے لگا آج تم پر کوئی غالب نہیں ہوسکتا۔ میں تمہارے ہمراہ رہوں گا تاکہ بنی کنانہ تمہیں کچھ ایذا نہ دے سکیں۔ وہ اس وعدہ پر نکل پڑے اور جب لڑائی شروع ہوئی اور شیطان نے اللہ تعالی کا لشکر دیکھا جو آسمان سے نازل ہوا تھا تو ایڑیوں کے بل وہاں سے فرار ہوگیا۔

قریش کہنے لگے ارے سراقہ! کہاں چلے؟ کیا تم نے یہ نہ کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور مفارقت اختیار نہ کروں گا تو ابلیس نے جواب دیا: میں وہ (مخلوق) دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالی کا عذاب سخت ہے۔(۱) ابلیس نے جب یہ کہا کہ میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے تو صحیح کہا۔ لیکن جب یہ کہا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں تو جھوٹ بولا۔ ایک قول کے مطابق اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بھی ان کے ہمراہ ہلاک نہ کر دیا جائے اور ظاہری معنی یہی معلوم ہوتے ہیں۔

جب منافقین نے یہ دیکھا کہ اللہ کی جماعت تھوڑی اور اس کے دشمنوں کی تعداد

(۱) سورۃ الانفال:۴۸

زیادہ ہے تو انہیں یہ گمان ہوا کہ فتح کا دارومدار کثرت پر ہے۔اس لئے وہ کہنے لگے کہ ''مسلمانوں کو ان کے مذہب نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے''۔لیکن اللہ تعالی نے یہ بتایا کہ فتح کا دارومدار توکل پر ہے، کثرت تعداد پر نہیں اور یہ کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ حقدار خواہ وہ کمزور ہو، وہ اس کی مدد کرتا ہے۔

جب نبی کریم ﷺ شوال کے مہینہ میں غزوہ بدر اور اس کے قیدیوں کے معاملات سے فارغ ہوئے تو پھر آپ بنفس نفیس سات دن کے بعد غزوہ بنی سلیم کے لئے روانہ ہوئے۔''الکدر'' نامی چشمہ کے پاس تین دن قیام فرما کر واپس آ گئے اور کسی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

غزوہ سویق:

جب مشرکین کا گروہ ذلیل ورسوا ہوا اور غمزدہ حالت میں واپس گیا تو ابوسفیان نے نذر مانی کی محمد (ﷺ) سے جنگ کئے بغیر سر پر پانی نہ ڈالوں گا۔ چنانچہ دوسو سواروں کے ہمراہ نکل کر مدینہ کے ایک علاقہ میں سلام بن مشکم کے یہاں مقیم ہوا۔اس نے اسے شراب پلائی اور اس خبر کو لوگوں سے پوشیدہ رکھا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے کھجور کے چند درخت کاٹ ڈالے۔ایک انصاری اور ایک ان کے حلیف کو قتل کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی تلاش میں تشریف لے گئے ،لیکن وہ بھاگ چکا

تھا۔زادراہ کی کثرت کے باعث کفار نے کافی مقدار میں ستو پھینک دیۓ تاکہ کچھ بوجھ کم ہوجائے، چنانچہ مسلمانوں نے وہ ستو اٹھالیئے۔اس طرح اس غزوہ کا نام ہی غزوہ سویق پڑ گیا۔ یہ واقعہ غزوہ بدر کے دو ماہ بعد پیش آیا۔

پھر آپ ﷺ نجد کے علاقہ میں غطفان کے غزوہ کے لئے نکلے اور ماہ صفر میں ہجرت کے تیسرے سال پورا مہینہ وہیں قیام فرمایا اور بغیر جنگ کیئے واپس لوٹ آئے۔

ماہ ربیع الاول میں مدینہ ہی میں مقیم رہے پھر قریش کے ارادہ سے حجاز کے ایک علاقے نجران کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں پر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ربیع الثانی اور جمادی الاول کے دو ماہ وہاں قیام کر کے واپس لوٹ آئے۔

پھر غزوہ بنی قینقاع پیش آیا اور کعب بن اشرف قتل کیا گیا۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کو عہد شکنی اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ آزمائی کی وجہ سے ان کے قتل کی اجازت عطا فرمائی۔

غزوہ احد:

جب سرداران قریش ایک ایک کر کے بدر میں موت کے گھاٹ اتار دیۓ گئے اور سرداری ابوسفیان بن حرب کے حصہ میں آئی تو اس نے عربوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف اکسانا اور جمع کرنا شروع کیا، اور بڑے ساز وسامان سے مدینہ کا رخ کیا اور احد

پہاڑی کے دامن میں ڈیرہ ڈالا اور احد کا مشہور معرکہ پیش آیا۔

اس روز نبی کریم ﷺ نے جہاد میں شریک ہونے والے جوانوں کا جائزہ لیا جن میں کچھ ایسے بھی نوجوان حاضر تھے جنہیں آپ ﷺ نے کم عمر خیال فرما کر لوٹا دیا۔ ان میں عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، زید بن ثابت، عرابہ بن اوس تھے اور جنہیں قدرے توانا تصور فرمایا انہیں اجازت مرحمت فرمادی۔ ان میں سمرہ بن جندب، رافع بن خدیج ہیں جن کی عمریں پندرہ سال تھیں۔

ایک قول یہ ہے کہ جس کی عمر پندرہ سال کی تھی اسے آپ ﷺ نے اجازت دے دی اور جس کی عمر اس سے کم نکلی اسے واپس کردیا کیونکہ وہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے عمر کے بجائے طاقت کا اعتبار فرمایا تھا۔ بالغ ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار نہیں کیا تھا، چنانچہ اس کی دلیل میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ: جب آپ ﷺ نے مجھ میں طاقت دیکھی تو اجازت دے دی (۱) پھر علامہ ابن قیم نے حضرت اصیرم کے واقعہ کا ذکر کیا ہے جو احد کے دن مسلمان ہوئے تھے اور اسی دن شہید ہوگئے۔

(۱) بخاری: ۲۶۶۴، مسلم: ۱۸۶۸

پھر پہاڑ پر ابوسفیان نے چڑھ کر آواز دی، کیا تم میں محمد (ﷺ) ہے؟ آپ نے فرمایا کچھ جواب نہ دو، پھر کہنے لگا، کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہے، پھر آپ نے جواب سے منع فرمادیا، پھر پوچھا کیا تم میں عمر بن خطاب ہے، پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو وہ مشرکین سے پکار کر کہنے لگا۔ ان سب کا کام تمام ہو گیا۔ اگر یہ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ اب عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا اور چلا اٹھے اے دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل وخوار کرنے کے لئے باقی رکھا ہے۔

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا" اعْـلُ هُبَـل" ہبل کی جے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے؟ کہنے لگے کیا کہیں؟ فرمایا کہو (اللہ اعلیٰ واجل) اللہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔ ابوسفیان نے کہا" لَـنَـا العُزَّى وَلَا عُزَّى لَكُمْ" ہمارا حامی عزیٰ بت ہے تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تلقین کی کہ کہو: " الـلـه مولانا ولا مولی لکم"۔ اللہ ہمارا مددگار اور تمہارا کوئی مددگار نہیں (۱)۔ ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے اور جنگ برابر کی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا برابر کیسے؟ ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے جہنم میں۔

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا کہ بعض مقتولین کی ہیئت تمہیں بگڑی ہوئی ملے گی، میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا لیکن ایسا ہونے پر مجھے کچھ برا بھی نہیں لگا۔

---

(۱) بخاری:۳۰۳۹

فصل (۷۰)

غزوہ احد سے مستنبط احکام و مسائل

اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ جب جہاد کا آغاز ہو جائے اور اسلحہ پہن لیا جائے تو دشمن سے جنگ کئے بغیر واپس نہ ہونا چاہیئے۔

دوسرے یہ کہ دشمن جب ملک میں داخل ہو جائے تو نکلنا جائز نہیں۔

تیسرے یہ کہ جو بچے نابالغ ہوں اور جنگ کی طاقت نہ رکھتے ہوں، انہیں واپس کر دیا جائے۔

چوتھے یہ کہ عورتوں کو لے کر جہاد کیا جا سکتا ہے جیسا کہ انس ابن نضر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کیا۔ اس طرح عورتیں جہاد میں شریک ہو سکتی ہیں اور ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر امام زخمی ہو جائے تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے اور اس کے پیچھے سب بیٹھ کر نماز پڑھیں۔

چھٹے یہ کہ شہادت کی دعا کرنا اور اس کی تمنا کا اظہار کرنا ممنوع نہیں، جیسا کہ ابن جحش نے کیا تھا۔

ساتویں یہ کہ اگر کوئی مسلمان خودکشی کرے تو وہ جہنمی ہوگا جیسا کہ قزمان (۱) کے متعلق نبی

(۱) بخاری: ۴۲۰۲، مسلم: ۱۱۲

کریم ﷺ نے فرمایا:

آٹھویں یہ کہ شہید کو غسل نہ دیا جائے اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھائی جائے اور جو کپڑے پہنے ہو اس کے علاوہ دوسرے کپڑوں میں اسے کفن بھی نہ پہنایا جائے۔ ہاں اگر اس کے کپڑے دشمن اتار لے تو دوسرا کفن دیا جاسکتا ہے۔شہید کو اپنے ہی کپڑوں میں دفن کرنا مستحب ہے یا واجب، اس میں اختلاف ہے، مگر راجح قول یہ ہے کہ واجب ہے۔

نویں یہ کہ اگر حالت جنابت میں شہید ہو جائے تو غسل دیا جائے جیسا کہ ملائکہ نے حضرت حنظلہ کو غسل دیا تھا۔(۱)

دسویں یہ کہ شہداء کو میدان جنگ ہی میں دفن کیا جائے، کیونکہ آپ نے صحابہ کو واپس میدان جنگ میں لا کر دفن کرنے کا حکم دیا تھا۔

گیارہویں یہ کہ ایک قبر میں دو یا تین شہداء کو دفن کیا جاسکتا ہے۔

بارہویں یہ کہ اگر کوئی مسلمان غلطی سے کسی مسلمان کو کافر سمجھ کر قتل کر دے تو امام پر بیت المال سے دیت دینا واجب ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حذیفہ کے

(۱) الإصابة: ۲/ ۲۹۸

والد کی دیت دینی چاہی تو حضرت حذیفہ نے دیت لینے سے احتراز کیا اور اسے مسلمانوں پر صدقہ کر دیا۔

تیرہویں یہ کہ معذور شخص بھی جہاد میں شریک ہوسکتا ہے جیسا کہ آپ نے ایک لنگڑے صحابی کو اجازت دے دی تھی۔

غزوہ احد میں جو حکمتیں پوشیدہ ہیں، ان پر اللہ تعالی نے سورہ آل عمران کی آیتوں میں جو ﴿وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ﴾[آل عمران:١٢١] سے شروع ہوکر آیت ۱۶۰ پر ختم ہوتی ہیں، روشنی ڈالی۔

سب سے بڑی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کو معصیت، بزدلی اور اختلاف کے انجام بد سے آگاہ کیا گیا اور بتایا کہ جو رسوائی انہیں ہوئی، وہ اسی وجہ سے تھی تاکہ اس کے اسباب سے اجتناب کریں۔

اللہ تعالی کی مشیت یہ ہے کہ رسول اور ان کے متبعین کبھی فتحیاب ہوں اور کبھی شکست سے دوچار۔ لیکن بالآخر فتح ان کی ہوگی، کیونکہ اگر ہمیشہ فتح ان کی ہو تو پھر آزمائش اور سبق آموزی کا مقصد پورا نہ ہوگا، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ:

﴿مَّا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾[آل عمران:١٧٩]

(جس حالت پر تم ہو اس پر اللہ مومنوں کو نہیں چھوڑ سکتا یہاں تک کہ برے کو اچھے سے ممتاز کر دے) یعنی مومنوں اور منافقوں کے درمیان جو اختلاف ہے اسے باقی نہیں رکھا جائے گا، بلکہ امتیاز کیا جائے گا، جس طرح احد کے دن آزما کر ممتاز کیا گیا۔ ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ﴾[آل عمران:١٧٩]

یعنی تمہیں اللہ تعالی غیب سے آگاہ نہیں کرے گا۔

اس سے وہ غیب مراد ہے جو مومنین و منافقین کے درمیان امتیاز پیدا کر دے۔ یہ دونوں فریق اللہ کے علم میں الگ الگ ہیں، لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ ظاہر میں بھی ان کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ پھر اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ﴾[آل عمران:١٧٩]

اور اللہ رسولوں میں جس کو چاہتا ہے، برگزیدہ بناتا ہے۔

اس سے اطلاع علی الغیب کی نفی کا استدراک ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کو اللہ تعالی غیب کی باتوں سے بھی آگاہ کرتا ہے جیسا کہ سورہ جن میں وارد ہے۔ اس لئے تمہاری سعادت اس میں ہے کہ اس غیب پر ایمان رکھو جس سے رسول واقف ہیں۔ اگر تم ایمان رکھو گے اور ڈرتے رہو گے تو تمہیں بڑا اجر ملے گا۔

ایک حکمت اولیاء اللہ کی عبودیت کا اظہار کہ کس طرح خوشی ورنج اور محبت ونفرت ہر حال میں یہ عبادت پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی اس کے حقیقی بندے ہیں، نہ کہ وہ صرف خوشی کی حالت میں اس کی عبادت کرتے ہیں۔

ایک حکمت یہ ہے کہ اگر مومنوں کو ہمیشہ کامیابی عطا کی جاتی تو ان کا حال وہی ہوتا جو رزق کی کشادگی میں ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالی تدبیر کرتا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق سب کچھ مہیا کرتا ہے یا سلب کرتا ہے۔

ایک حکمت یہ ہے کہ بندے جب اللہ تعالی کے سامنے عاجزی وانکساری کرتے ہیں تو وہ فتح وکامیابی کے مستحق ہوجاتے ہیں کیونکہ فتح ونصرت کی پوشاک، عاجزی وانکساری کے مظاہرہ کے بعد اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ [آل عمران: ۱۷۹]

اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی جب کہ تم ذلیل تھے۔

ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے لئے کچھ ایسے درجات بنائے ہیں جہاں تک رسائی ان کے اعمال کے ذریعہ نہیں ہوسکتی، بلکہ بعض آزمائشوں پر پورا اترنے کے بعد ان درجات کو حاصل کرسکتے ہیں۔ اس لئے ایسے اسباب پیدا کئے جو آزمائش کے بعد بندوں کو ان مقامات کا مستحق بنادیں۔ اس کے ساتھ اس نے بندوں کو

نیک عمل کی توفیق بھی دی۔

ایک حکمت یہ ہے کہ دائمی عافیت، مسلسل فتح، اور طویل مالداری بندہ کے اندر دنیا کی طرف رغبت ومیلان میں اضافہ کرتے ہیں۔ طبیعت کے اندر جمود پیدا ہوجاتا ہے، اوراللہ تعالی کے راستے میں نکلنے سے رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں جب اللہ تعالی بندے کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے تو اس کو کچھ ایسی آزمائشوں میں مبتلا کردیتا ہے جو اس کے لئے علاج ثابت ہوں اور اس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا کریں اور آخرت کی طرف انابت کا سبب بنیں۔

نیز اللہ تعالی کے نزدیک شہادت اولیاء اللہ کے اعلی مراتب کی علامت ہے۔ شہداء اس کے خواص ومقربین میں شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالی چاہتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے شہداء کا انتخاب فرمائے۔ نیز اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالی جب اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا قصد فرماتا ہے تو ان کے لئے ایسے اسباب مہیا کرتا ہے جو ان کی ہلاکت وبربادی کے موجب ہوں، اور ان اسباب میں سب سے بڑا جرم ان کا کفر وبغاوت، نافرمانی اور اولیاء اللہ کی ایذارسانی میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس سے اولیاء اللہ کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور دشمنوں کو مٹانے کے اسباب مہیا ہوتے ہیں، اسی کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾[آل عمران:۱۳۹]

تم سست نہ بنو، تم غم نہ کرو، تم ہی بلند رہو گے، بشرطیکہ مومن رہو۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے صحابہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کو تسلی دی اور اس سبب وحکمت کی طرف توجہ دلائی جس کی وجہ سے کفار کو ان پر غلبہ حاصل ہوا تھا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ﴾[آل عمران:۱۴۰]

اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو ایسا ہی ان کو بھی پہنچا ہے۔

یعنی تمہیں سست پڑنے یا غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ نقصان کافروں کا بھی ہے اور انہوں نے یہ سب شیطان کی راہ میں برداشت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالی نے یہ بھی بتایا کہ اس زندگی میں دن پھرتے رہتے ہیں ۔ یہ ایک وقتی منفعت ہے ۔ اسے اللہ تعالی دوستوں اور دشمنوں دونوں کو باری باری دیتا ہے، لیکن آخرت کا معاملہ ایسا نہیں۔ وہاں کا فائدہ صرف دوستوں کو حاصل ہوگا۔ نیز اس میں حکمت یہ ہے کہ مومن اور منافق کے درمیان امتیاز پیدا ہو جائے۔ ویسے اللہ تعالی ہر شخص کو جانتا ہے لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ سب لوگ اس کا مشاہدہ کر لیں اور اپنی آنکھوں سے معرفت حاصل کر لیں، کیونکہ محض

علمِ غیب پر ثواب وعذاب مرتب نہیں ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالی نے ایک اور حکمت کا ذکر فرمایا تا کہ مسلمانوں میں بعض کو درجہ شہادت عطا کرے اور اللہ تعالی کا ارشاد گرامی:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾[آل عمران:١٤٠]

اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اس میں صراحت ہے کہ وہ ان منافقین کو ناپسند کرتا ہے جو احد کے دن اس کے نبی کو چھوڑ کر لوٹ آئے اور جنگ میں شریک نہ ہوئے۔ اللہ تعالی چونکہ ان سے محبت نہیں فرماتا اس لئے وہ درجہ شہادت سے بھی محروم رہے۔

اللہ تعالی نے یہ بھی حکمت بیان کی ہے کہ مومنوں کو گناہ سے پاک وصاف کیا جائے اور منافقوں سے انہیں علیحدہ کیا جائے، اور کافروں کو ختم کیا جائے۔

پھر اللہ تعالی نے ان کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ جنت میں بغیر جہاد فی سبیل اللہ کے جایا جا سکتا ہے۔ ارشاد ہے کہ:

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ﴾[آل عمران:١٤٢]

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو جانا نہیں۔

یعنی ابھی تم سے ایسا فعل صادر نہیں ہوا ہے، کیونکہ جزا معلوم واقعہ پر مرتب ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالی نے مسلمانوں کو ڈانٹ پلائی کہ تم جس جہاد کی تمنا کرتے تھے اور جانے کا شوق رکھتے تھے، اس میں شکست کھا گئے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ﴾[آل عمران:١٤٣]

تم موت کا سامنا کرنے سے پہلے موت کی تمنا کرتے تھے پس تم نے اسے دیکھ لیا۔

نیز اس غزوہ میں یہ حکمت ہے کہ یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کی وفات کی اطلاع کا مقدمہ تھا اور شکر گزار وہ ہیں جنھوں نے نعمتوں کی قدر کی اور نبی کریم ﷺ کی وفات تک ثابت قدم رہے اور راہ فرار اختیار نہیں کی۔

پھر مسلمانوں کو توبیخ کی کہ اگر رسول اللہ ﷺ فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو انہیں فرار نہیں ہونا چاہئیے، بلکہ ان پر واجب ہے کہ اس کے دین اور توحید پر قائم رہیں اور اسی پر مریں۔ ہر جاندار کو بہر حال موت آنی ہے۔ محمد ﷺ کو ہمیشہ رہنے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا۔ اسی طرح بہت سے انبیاء اور ان کے متبعین قتل کئے جا چکے ہیں، لیکن ان کے متبعین میں کوئی سستی یا کمزوری نہیں پیدا ہوئی بلکہ انہوں نے جام شہادت کو بڑے ذوق وشوق سے نوش کر لیا۔

پھر اللہ تعالی نے ان اسباب کا ذکر فرمایا جن سے انبیاء کرام اور ان کی قوموں کو فتح وکامیابی حاصل ہوئی ۔ وہ تھا ان کا اعتراف قصور اور توبہ واستغفار اور ثابت قدمی اور نصرت ومدد کے لئے دعائیں اور آہ وزاری، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾[آل عمران:١٤٧]

ان کا صرف یہ کہنا تھا کہ اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے ۔ ہماری زیادتیوں کو معاف فرمادے، ہمیں ثابت قدم رکھ، اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ گناہوں کی وجہ سے دشمنوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور انہی سے شیطان انسانوں کو بہکاتا ہے اور شکست سے دوچار کرتا ہے۔

گناہوں میں سے بعض گناہ حقوق میں قدرے کوتاہیوں سے ہوتے ہیں اور بعض گناہ حدود سے تجاوز کرنے سے صادر ہوتے ہیں ، اور فتح ومدد کا دارومدار اطاعت و فرمانبرداری پر ہے۔اس وجہ سے لوگوں نے ایک طرف گناہوں سے توبہ واستغفار کیا ، اور دوسری طرف ثابت قدمی اور مدد ونصرت کی دعا کی ، کیونکہ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔اس طرح انہوں نے دونوں جانبوں کی رعایت کی۔ایک جانب توحید وانابت کا جو مدد ونصرت کا مقتضی ہے ، اور دوسری جانب مدد کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ،

گناہ واسراف سے توبہ واستغفار۔

پھر اللہ تعالی نے مسلمانوں کو ان کے دشمن ومنافقین اور کفار کی تابعداری سے منع فرمایا کیونکہ وہ اگر ایسا کرتے ہیں تو دنیا وآخرت دونوں جگہ خسارہ میں رہیں گے۔اس میں اشارہ ہے کہ منافقین نے احد کی کامیابی کے بعد کفار کی پوری تابعداری اختیار کر لی تھی۔پھر اللہ تعالی نے بتایا کہ وہ مومنوں کا مولیٰ اور بہترین مددگار ہے۔جس نے اس ذات پاک سے محبت کی وہی کامیاب ہوگا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے واضح فرمایا کہ وہ کفار اور دشمنان اسلام کے دلوں میں رعب وہیبت مسلط کر دے گا جس کی وجہ سے انہیں حملہ کی جرأت وہمت نہ ہوگی اور ایسا ان کے شرک وکفر کی وجہ سے ہوگا،اور جس مسلمان کا ایمان شرک وکفر کی آمیزش سے پاک ہوگا وہ امن وسلامتی وہدایت سے ہمکنار ہوگا۔

مزید فرماتا ہے کہ فتح ونصرت کا وعدہ سچا ہے۔اگر وہ اطاعت اور فرمانبرداری پر گامزن رہے تو مدد ونصرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور فتح وکامیابی ان کے قدم چومے گی۔اگر انہوں نے اطاعت چھوڑ دی تو مدد ونصرت بھی منقطع ہو جائے گی اور آزمائش کے طور پر ان کے دشمن مسلط ہو جائیں گے تاکہ انہیں معصیت وگناہ کا انجام معلوم ہو جائے۔اس کے بعد یہ بھی بتادیا کہ یہ ساری لغزشیں اللہ نے معاف کر دیں وہ مومنین

پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ دشمنوں کو مسلط کرنے کے بعد معافی کے کیا معنی؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر اللہ تعالی کی معافی نہ ہوتی تو دشمن مسلمانوں کو نیست ونابود کردیتے لیکن یہ عفو الٰہی کا ہی کرشمہ تھا کہ مسلمانوں کو جڑ سے ختم کرنے پر دشمنوں کے عزم واتفاق کے بعد بھی اللہ تعالی نے انہیں روک دیا۔

پھر اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اس وقت کا منظر یاد دلایا جب وہ پہاڑ کی طرف چڑھتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اپنے نبی ﷺ اور ان کے صحابہ کی طرف مڑ کر دیکھتے نہیں تھے۔ حالانکہ نبی ﷺ ان کو پیچھے سے پکار پکار کر یہ فرما رہے تھے، اے اللہ کے بندو! میں رسول اللہ یہاں ہوں۔

اس فرار کے نتیجہ میں اللہ تعالی نے انہیں یکے بعد دیگرے آزمائشوں سے دوچار کیا ، اوران پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک رنج تو فرار کا ، دوسرا شیطان کے اس نعرے کا کہ نبی کریم ﷺ قتل کردیئے گئے۔

بعض علما نے " غـمـا بـغـم " یکے بعد دیگرے غم کی تفسیر یہ کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرار ہوکر آپ کو رنج وغم میں مبتلا کیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالی نے انہیں رنج وغم میں مبتلا کیا، لیکن پہلی تفسیر چند دلائل کی وجہ سے زیادہ مناسب ہے۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "لکی لا تحزنوا" یعنی تاکہ تم غم نہ کرو، اس میں غم کے بعد غم کی حکمت پر تنبیہ ہے یعنی اس غم کو بھلا دینا جو فتح کے بجائے شکست حاصل ہونے سے پیدا ہوا تھا اور یہ چیز اس غم سے حاصل ہو سکتی ہے جس کے بعد دوسرا غم ہو۔

دوم یہ کہ یہ تشریح حقیقت کے مطابق ہے، کیونکہ مسلمانوں کو ایک تو مال غنیمت سے محرومی کا رنج وغم تھا دوسرے شکست سے دوچار ہونے اور قتل وزخم کھانے کا، مزید برآں نبی کریم ﷺ کی خبر وفات اور دشمنوں کے اچانک پہاڑ کی طرف سے حملہ آور ہونے کا۔ اس لئے یہاں پر خاص طور پر دو غم مراد نہیں ہیں بلکہ پے در پے آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قول "غَمّاً بِغَمٍّ" اجر وثواب کا تکملہ ہے نہ کہ ثواب کی جزا ہے تو معنی یہ ہوتے کہ تمہیں ایک غم سے متصل دوسرا غم دیا کیونکہ تم نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر فرار ہوئے۔ آپ ﷺ کے اس حکم کی کہ "اس مورچے پر جمے رہیں" کی خلاف ورزی کی آپسی اختلافات کا شکار ہوئے اور بزدلی ومایوسی کا مظاہرہ کیا۔ اور ان میں ہر فعل ایک قسم کے غم کا موجب وسبب ثابت ہوا۔

مزید اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ فضل وکرم رہا کہ طبیعتوں میں بعض وہ صفات سیئہ جو کہ مدد ونصرت کے لئے مانع بنتی ہیں، ان کو جبری طور پر کچھ اسباب پیدا کر کے خارج

فرما دیا، جو بظاہر نا خوشگوار تھے اور اس سے مسلمانوں کو بخوبی علم ہوا کہ توبہ واستغفار کرنا ان صفات سے بچنا انتہائی ضروری ہے جیسا کہ کبھی کبھی بعض بیماریوں کی وجہ سے جسم کو صحت وقوت حاصل ہو جاتی ہے۔

پھر اللہ تعالی نے مسلمانوں پر مزید رحم وکرم فرمایا۔ اور اونگھ طاری کر کے اس غم کو دور فرما دیا اور یہ اونگھ جنگ میں کامیابی کی علامت ہے۔ یہ غزوہ بدر میں بھی طاری ہوئی تھی، اور اللہ تعالی نے یہ بتایا کہ بعض لوگوں پر یہ نیند نہیں طاری ہوئی کیونکہ انہیں اسلام، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے علاوہ اپنی جانوں کا غم کھائے ہوئے تھا اور اللہ تعالی کے بارے میں جاہلانہ بدگمانیاں رکھتے تھے۔

اس بدگمانی کی تفسیر علماء نے یہ کی ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالی اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا اور آپ کی جدوجہد کمزور ہو جائے گی، اور یہ بھی سوچتے تھے کہ جو کچھ ہوا وہ قضاوقدر الہی سے نہیں ہوا اور اس میں کوئی حکمت بھی نہیں۔

چنانچہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ قضاوقدر، حکمت الہی اور دین الہی کے غلبہ کے منکر تھے۔ یہی وہ بدگمانی ہے جس کا مشرکین اور منافقین عقیدہ رکھتے تھے جس کا ذکر سورہ فتح میں ہے۔ ایسے خیالات کو بدگمانی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کیونکہ ایسا عقیدہ اللہ تعالی کی ذات وصفات، اسماء اور اس کی حکمت وحمد اور اس کی ربوبیت والوہیت اور اس کے

وعدوں کے سچے ہونے کے متعلق رکھنا شایان شان نہیں ہے۔

اس لئے جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالی اپنے رسولوں کے دین کو غالب نہیں کرے گا اور باطل کو حق پر غلبہ دے گا جس سے حق کمزور پڑ جائے گا جس کے نتیجہ میں وہ اٹھ نہ سکے گا تو اس کی یہ سوچ بدظنی ہوگی۔ اگر کوئی اس طرح کے کام میں تقدیر الٰہی کا انکار کرے تو وہ اللہ تعالی کی قدرت وملکیت کا منکر ہے اور جو اس میں اس کی حکمت کا انکار کرے جس پر وہ حمد کا مستحق ہے اور یہ سمجھے کہ اس کا کام حکمت الٰہی سے خالی صرف مشیئت ہے تو یہ کفار کا گمان ہے اور کفار کے لئے جہنم کی خرابی وتباہی ہے۔

بہت سے لوگ اللہ تعالی کی شان میں بدگمانیاں رکھتے ہیں خصوصاً ان چیزوں میں جو قضا وقدر سے متعلق ہوتی ہیں، اور اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اللہ تعالی کی ذات وصفات اور اس کی حمد وحکمت پر پورا ایمان یقین رکھتا ہو، اور جو شخص اللہ تعالی کی رحمتوں سے مایوس ہوا وہ بھی بدگمانی کا شکار ہوا اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالی نیکو کار کو عذاب دے سکتا ہے اور اس کے اور دشمن کے درمیان یکساں معاملہ کر سکتا ہے وہ بھی اللہ تعالی کے ساتھ برا گمان رکھتا ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ اس نے مخلوق کو امر و نہی کا پابند نہیں بنایا ہے اور ان کو کسی عمل پر ثواب وعذاب نہیں دے گا اور جس میں وہ اختلاف کریں اس میں اپنا حکم وفیصلہ بیان

نہیں کرے گا، وہ بھی بدگمانی کا شکار رہوا۔

اسی طرح یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالی بغیر سبب کے عمل صالح کو ضائع کرے گا۔ بغیر گناہ کئے سزا دے گا اور دشمنوں کی معجزات کے ذریعہ مدد فرمائے گا۔ جن کے ذریعہ انبیاء کرام کی تائید ہوتی تھی اور اس کا ہر کام اچھا ہے خواہ ساری عمر عبادت کرنے والوں کو دوزخ میں ڈالدے اور ہمیشہ معصیت کرنے والے پر انعام واکرام کرے۔ دونوں حسن میں برابر ہیں۔ کسی ایک کام کا محال ہونا بغیر سچی خبر کے معلوم نہیں ہوسکتا۔ عقل ایک کے قبح اور دوسرے کے حسن کا فیصلہ نہیں کرسکتی۔ اسی طرح جو شخص یہ سوچے کہ اللہ تعالی نے اپنی ذات وصفات اور افعال کے بارے میں ایسی چیزوں کے ذریعہ خبر دی ہے جو باطل ہیں اور حق کو چھوڑ دیا ہے اور اس کی خبر دینے کے بجائے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور تشبیہ اور باطل کے ذریعہ تصریح کی ہے اور یہ چاہا کہ مخلوق اس کے کلام کی تحریف میں ذہنی کاوش سے کام لے اور اسماء وصفات کی معرفت کے بارے میں کتاب الٰہی کی جگہ انسان عقول پر اعتقاد کرے بلکہ یہ چاہا کہ انسان اس کے کلام کو اپنی معروف زبان پر محمول نہ کریں حالانکہ اسے حق کو واضح کرنے اور ان الفاظ کو دور کرنے پر قدرت ہے جن سے لوگ باطل عقیدے میں پڑ جاتے ہیں، تو یہ بھی بدگمانی ہے۔

اسی طرح جو یہ سمجھے کہ اللہ اور رسول کے سوا اس نے اور اس کے پیش رووں نے حق

کو واضح کیا ہے اور ہدایت و رہنمائی انہی کے کلام میں ہے اور کلام الٰہی کے ظاہری معنی سے گمراہی کے علاوہ کچھ اور حاصل نہیں، تو ایسا سوچنے والے تمام لوگ اللہ کے ساتھ بدترین گماہ رکھتے ہیں اور ایسا گمان دور جاہلیت کا گمان ہے۔

جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کی کائنات میں ایسی بھی چیزیں ہیں جسے وہ نہیں چاہتا اور جس کی ایجاد و تکوین پر وہ قادر نہیں ہے تو یہ بھی اللہ تعالی کے ساتھ بدگمانی ہے۔

اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالی ازل سے ابد تک معطل ہے اور افعال پر قدرت نہیں رکھتا پھر بعد میں اس پر قادر ہو جاتا ہے، اور یہ کہ وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ مخلوق کا علم رکھتا ہے تو یہ بھی بدگمانی کا مرتکب ہے اور جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالی نہ ارادہ فرماتا ہے اور نہ کلام سے متصف ہے اور نہ اس نے کلام کیا اور نہ کرے گا اور نہ حکم دیا اور منع کیا تو اس نے بھی بدگمانی کی۔

جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالی آسمانوں کے اوپر عرش پر مخلوق سے جدا نہیں ہے اور تمام مقامات کی نسبت اس کے حق میں برابر ہے اور جو سبحان ربی الاعلی کی طرح سبحان ربی الاسفل کہے تو یہ بدترین گمان ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ کفر اور فسق و معصیت کو اسی طرح پسند کرتا ہے جس طرح اطاعت و عبادت کو تو اس نے بھی بدگمانی کی۔ اور جس نے یہ سمجھا کہ وہ نہ پسند کرتا ہے،

نہ راضی ہوتا ہے، نہ ناراض ہوتا ہے نہ دوست رکھتا ہے نہ دشمن سمجھتا ہے، نہ کسی سے قریب ہوتا ہے نہ کسی کو قریب کرتا ہے،تو یہ سب بھی اللہ تعالی کے ساتھ بدگمانی ہےاور یہ سمجھنا کہ اللہ تعالی دو متضاد چیزوں کے درمیان برابری کرے گا، یا دو برابر چیزوں کے درمیان تفریق کرے گا یا ایک کبیرہ گناہ سے تمام عمر کی نیکیوں کو ضائع کر کے گناہ کے مرتکب کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا تو یہ بھی بدگمانی ہے۔قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالی نے اپنی ذات یا اس کے رسول نے جن صفات سے اسے متصف کیا ہے،ان کے خلاف عقیدہ رکھنا یا ان کو معطل گردانا بدگمانی ہے۔

اس طرح اگر کوئی عقیدہ رکھے کہ اس کا لڑکا ہے یا شریک ہے یا بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارشی ہے یا اس کے اور مخلوق کے درمیان کچھ وسائل ہیں جو ضرورتوں کو اس تک پہنچاتے ہیں یا اس کے پاس انعامات، اطاعت کی طرح معصیت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں، یا جب اس کی رضا کے لئے کوئی چیز چھوڑ دی جاتی ہے تو وہ اس سے بہتر عوض نہیں دیتا یا محض چاہنے پر وہ بلا سبب بندے کو سزا دیتا ہے یا سچی رغبت وخوف کے باوجود بندے کو نامراد بنا دیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ پر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے یا آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے خود رائی سے کام لے کر اہل بیت پر ظلم وزیادتی کی اور ان کے کسی گناہ کے بغیر اللہ اور اہل بیت کے دشمنوں کو غلبہ حاصل ہو گیا لیکن ان کی کوئی مدد نہ

کر سکا۔ پھر ان ہی دشمنوں کو جنہوں نے آپ کے دین میں تبدیلی کر دی تھی قبر میں آپ کا ہم خواب بنا دیا جہاں امت آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ ان پر بھی سلام بھیجتی ہے۔

تو یہ باطل عقائد اور بدگمانیاں وہ شخص رکھتا ہے جو یا تو کافر ہے یا بدعتی، اور لوگوں میں ایک بڑی تعداد الا ماشاء اللہ اس طرح کی بدعقیدگی کی شکار ہے، اور بڑی تلاش وجستجو کے بعد ہی اس کا علم ہوتا ہے ورنہ احساس تک نہیں ہو پاتا۔ اس لئے ہر شخص اپنے آپ کا جائزہ لے اور محاسبہ کرے کہ کیا وہ اس بیماری سے محفوظ ہے بقول شاعر جس کا ترجمہ یہ ہے:

اگر محفوظ ہو تو بڑی بلا سے محفوظ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ محفوظ نہ ہونگے۔

اس لئے ہر عاقل شخص کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئیے اور اللہ تعالی سے دعا واستغفار کرنا چاہئیے کہ مذکورہ بالا بدگمانیوں سے محفوظ رکھے اور صحیح اسلامی عقیدہ کو اپنانے اور اس کے مطابق عمل صالح کی توفیق دے۔

پھر اللہ تعالی نے اس کلام کو بتایا جو ایسا گمان رکھنے والوں کے باطل گمان سے صادر ہوا یعنی ان کا یہ کہنا کہ:

﴿هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ﴾[آل عمران:١٥٤]

اس معاملہ میں ہمارا بھی کچھ ہے۔

مزید یہ کہنا کہ:

﴿يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ﴾[آل عمران:١٥٤]
اگرمعاملہ میں ہمارا کچھ ہوتا تو ہمیں یہاں قتل نہ کیا جاتا۔
اس قول سے وہ تقدیر ثابت نہیں کرنا چاہتے تھے۔اگرایسا ہوتا توان کی مذمت نہ کی جاتی اور یہ جواب دینا مناسب نہ ہوتا کہ:
﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾[آل عمران:١٥٤]
آپ فرما دیجئے کہ معاملہ پورا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
ان کا خیال تھا کہ اگر معاملہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ قتل نہیں کئے جاتے تو مذکورہ آیت سے ان کی تکذیب کی گئی اور واضح کیا گیا کہ وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔
اگر تقدیر میں قتل کیا جانا لکھا ہے تو گھر میں بیٹھا شخص بھی میدان جنگ میں ضرور پہنچے گا اور قتل کیا جائے گا۔
اس میں فرقہ قدریہ کی واضح طور پر تردید ہوتی ہے۔
پھر اس تقدیر میں اللہ تعالی نے ایک دوسری حکمت کا ذکر فرمایا ہے یعنی ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ایمان یا نفاق کا امتحان جس سے مومن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔منافقین کی باطنی کیفیات ظاہر ہو جاتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور دوسری حکمت کا ذکر کیا ہے یعنی مومنوں کے دل کی صفائی اور پاکیزگی کیونکہ دلوں پر نفسانی خواہشات اور فطری ومزاجی آزادی ، شیطانی مکروفریب اور رسم رواج کے غلبہ کی وجہ سے ایسے اثرات پیدا ہوجاتے ہیں جو ایمان ویقین کے منافی ہوتے ہیں۔اگر دلوں کو ہمیشہ عافیت حاصل رہے تو ان سب کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔اس لئے انسانوں کے لئے بر بنائے رحم وکرم اس طرح کی شکست اور ناکامی بسااوقات ناگزیر ہوجاتی ہے تاکہ ان کی قدرے اصلاح ہوسکے اور یہ بھی ایک طرح کی مدد اور نصرت ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان سچے مسلمانوں کا ذکر کیا جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے اور ان کا یہ فعل گناہوں کی وجہ سے تھا اور شیطان ایسے اعمال کی وجہ سے انہیں پھسلاتا ہے جو کہ دشمن کی قوت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں کیونکہ اعمال کے اثرات اچھے اور برے دونوں ہوتے ہیں۔اگر انسان ایسے دشمن کے مقابلہ میں راہ فرار اختیار کرلے جس کا مقابلہ کرسکتا تھا تو یہ برے اعمال کے اثرات ونتائج سے ہوا ہے۔پھر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کو معاف کردیا گیا، کیونکہ وہ میدان جنگ سے کسی شک کی بنیاد پر نہیں بھاگے تھے، بلکہ ایک عارضی سبب سے ایسا ہوگیا تھا،مزید بتایا کہ جو کچھ ہوا وہ ان کی شامت اعمال تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا﴾[آل عمران:١٦٥]

کیا جب تمہیں کچھ تکلیف پہنچی جس سے دگنی تم ان کو پہنچا چکے تھے۔

اس مضمون کو مکی سورتوں میں مزید وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾[الشورى:٣٠]

جو کچھ تم کو مصیبت پہنچی ہے سب تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے اور بہت سے قصور معاف کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ﴾

[النساء:٧٩]

جو بھلائی تم کو پہنچی ہے وہ اللہ کی مہربانی سے ہے اور جو تکلیف پہنچتی ہی وہ تمہارے نفس سے ہے۔

اس سے اس بات کا علم ہوا کہ نعمتوں کا حصول اس کے محض فضل وکرم کا نتیجہ ہے اور

مصیبتوں کا نزول اس کے عدل وانصاف کا تقاضا ہے، پھر آیت کو اس جملہ پر ختم فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[آل عمران:١٦٥]

اللہ تعالی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ عدل کے ساتھ اللہ تعالی کی قدرت بہت عام ہے۔ اس سے تقدیر اور اسباب دونوں کا اثبات ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سبب بندوں کی طرف اور قدرت عامہ اللہ تعالی کی طرف منسوب ہے۔ پہلی چیز سے فرقہ جبریہ کی تردید ہو گئی اور دوسری بات سے فرقہ قدریہ کی تردید ہو گئی۔

اسی طرح کا مضمون اس آیت میں مذکور ہے:

﴿لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ☆وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾[التكوير:٢٨-٢٩]

اس کے لئے جو راہ راست پر سیدھا چلنا چاہے اور تم چاہ کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے مگر جس وقت اللہ ہی چاہے جو سارے جہاں کا پروردگا ہے۔

اس آیت میں قدرت کا ذکر کرنے میں یہ لطیف نکتہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالی ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے ان امور کی وضاحت سوائے اللہ تعالی کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی بات کو ایک دوسری آیت میں اس طرح واضح فرمایا ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ﴾[آل عمران:١٦٦]
اور جو تکلیف تم کو دو لشکروں کے مقابلہ کے دن پہنچی وہ بھی اللہ کے حکم سے تھی۔اور اس حکم سے تکوینی وتقدیری اذن مراد ہے۔

پھر اللہ تعالی نے تقدیر کی حکمت میں یہ بتایا کہ علانیہ طور پر مومنین اور منافین میں فرق ظاہر ہوسکے اور لوگوں کو ان کی معرفت ہوجائے چنانچہ منافقین نے جن کے دل میں شک وشبہ تھا اپنی زبان سے ان کا اظہار کیا اور مسلمانوں نے اسے سنا اور اللہ تعالی کی اس پر نکیر بھی سنی تو انہیں اس کا انجام بھی معلوم ہوگیا۔

ان مذکورہ تفصیلات کے بعد ہم بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس غزوہ میں کتنی حکمتیں،نعمتیں،نصیحتیں اور ہدایتیں پوشیدہ ہیں۔پھر اللہ تعالی نے مسلمانوں کو شہداء کے سلسلہ میں بڑی خوش اسلوبی سے تسلی وتسکین دی:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتاً بَلْ أَحْيَاءٌ﴾[آل عمران: ١٦٩]
اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والوں کو مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالی نے شہداء کے لئے دائمی زندگی،قرب خداوندی،مسلسل رزق کی فراہمی،غیر معمولی نعمتوں کے حصول کے بعد ان کی فرحت ورضاء الہی اور جو مسلمان بھائی ابھی ان سے نہیں جا ملے ان سے مل کر ان کی خوشی کا اتمام ہونا مزید براں

ان پر نعمتوں اور انعام واکرام کی تجدید سے ان مذکورہ چیزوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔
پھر اللہ تعالی نے اس آزمائش کے مقابلہ میں غیر معمولی نعمت کا ذکر کیا ہے جس کے حصول کے بعد بڑی سے بڑی مصیبت وآزمائش لاشئی نظر آتی ہے۔ وہ بعثت نبوی کی نعمت ہے۔ اگر اس کے عظیم فوائد پر غور کیا جائے تو یہ سب مصیبتیں انتہائی معمولی نظر آتی ہیں۔ مزید اللہ تعالی نے واضح فرمایا کہ ان آزمائشوں کے سبب خود مسلمان تھے اس لئے ان کو ان اسباب سے پرہیز کرنا چاہئیے اور یہ سب قضاء وقدر سے نازل ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیشہ ان کو اللہ وحدہ لاشریک لہ پر بھروسہ کرنا چاہئیے اور ان حکمتوں کو اس لئے ذکر فرما دیا تاکہ اس کی تقدیر پر ایمان اور حکمتوں پر یقین رکھیں اور اس سے بدگمان نہ ہوں، اور اس کے اسماء حسنہ اور صفات علیا کے ذریعہ اس کی معرفت اور بصیرت حاصل کریں۔
پھر تسلی وتسکین دینے کے طور پر یہ فرمایا کہ اگر مسلمان نصرت اور غنیمت سے محروم ہوگئے ہیں تو اس کے عوض بڑی نعمتیں ملی ہیں۔ پھر آخر میں شہداء کے متعلق تسلی دی ہے کہ ان پر غم نہ کریں بلکہ خود بھی شوق شہادت کا جذبہ پیدا کریں۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

فصل (۱۷)

حمراءالاسد کاواقعہ

جب جنگ احد ختم ہوگئی اور مشرکین مکہ واپس لوٹ گئے تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مشرکین دوبارہ حملہ کا ارادہ کررہے ہیں۔ یہ خبران پر بے حد گراں گزری چنانچہ نبی کریم ﷺ نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ان کا تعاقب کرو اور دیکھو وہ کیا کررہے ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں اگر وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ مکہ جارہے ہیں اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہیں اور اونٹوں کو روانہ کرچکے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ مدینہ کا ارادہ رکھتے ہیں تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر وہ مدینہ کا ارادہ رکھتے ہوں گے تو میں آگے بڑھ کر ان سے مقابلہ کروں گا۔علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان کے تعاقب میں نکلا کہ دیکھوں کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ جانے پر اندازہ ہوا کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار ہوکر مکہ واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جب مشرکین مکہ واپسی کا ارادہ کرکے نکلنے لگے تو ابوسفیان نے کہا کہ اب ہمارا اور تمہارا وعدہ اگلے سال بدر کے مقام پر ملاقات کا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کہہ دو کہ ہاں ضرور ملیں گے۔ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا

کہنے لگے، اور کہنے لگے ہم نے ان کا زور توڑ دیا ہے لیکن ہم نے ان کو ایسے چھوڑ دیا ہے ۔وہ دوبارہ اپنی قوت اکٹھا کر لیں گے۔اس لئے ہمیں لوٹ کر ان کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔

رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو لوگوں میں یہ اعلان فرمایا کہ وہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں اور وہی لوگ نکلیں جو غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے، چنانچہ لوگوں نے اس ندا پر باوجود شکستہ ہونے کے لبیک کہا۔صرف جابر رضی اللہ عنہ اپنے والد کی حالت کی وجہ سے اجازت چاہی تو انہیں شریک نہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی۔اس طرح صحابہ کرام چل کر حمراء الاسد پہنچے۔

اس موقع پر ابوسفیان نے مدینہ جانے والے ایک مشرک سے کہا کہ اگر تم محمد (ﷺ) کو ہمارا ایک پیغام پہنچا دو تو میں تم کو مکہ واپسی پر ایک سواری کے وزن کے بقدر کشمش دوں گا تو اس نے کہا ضرور۔ابوسفیان نے کہا کہ کہہ دینا کہ ہم نے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کا پلان بنایا ہے تاکہ ان کو نیست ونابود کر دیں۔جب مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ☆ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ﴾[آل عمران:١٧٣-١٧٤]

اللہ ہم کو کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔پھر وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ

واپس آئے، ان کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی مرضی پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

غزوہ احد ماہ شوال سنہ ۳ ہجری میں پیش آیا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور سال کے بقیہ مہینے وہیں ٹھہرے۔ جب محرم کا چاند طلوع ہوا تو آپ کو اطلاع ہوئی کہ خویلد کے دونوں لڑکے طلیحہ وسلمہ اپنی قوم کے ہمراہ بنی اسد کو نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ پر ابھار رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو ڈیڑھ سو افراد دے کر ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ جب یہ سرفروشوں کی جماعت ان کے علاقہ میں پہنچی تو انہیں ایک اونٹ اور کچھ بکریاں مال غنیمت کے طور پر ملیں اور یہ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے مدینہ واپس آ گئے۔

محرم کی پانچویں تاریخ کو آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ خالد بن سفیان الہذلی جنگ کے ارادے سے لوگوں کو جمع کر رہا ہے، چنانچہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف بھیجا، انہوں نے اسے قتل کیا۔

صفر کے مہینے میں قبیلہ عضل اور قارہ سے ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور درخواست کی کہ ان کے ہمراہ ان صحابہ کو بھیجا جائے جو عالم دین ہوں اور انہیں قرآن سکھائیں، چنانچہ آپ نے خبیب رضی اللہ عنہ سمیت چھ صحابہ کی ایک جماعت مرثد بن ابی عامر الغنوی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں

روانہ فرمادی، چنانچہ ان کو دھوکہ دے کر شہید کردیا گیا۔

واقعہ بئر معونہ:

اسی یعنی ہجرت کے چوتھے سال صفر ہی کے مہینے میں بئر معونہ کا واقعہ پیش آیا۔

غزوہ بنو نضیر:

پھر ربیع الاول میں غزوہ بنو نضیر پیش آیا۔ امام زہری کا خیال ہے کہ یہ غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا تھا، لیکن یہ ان کا تسامح یا غلطی ہے، کیونکہ یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ غزوہ احد کے بعد پیش آیا تھا، بدر کے بعد غزوہ قینقاع پیش آیا تھا۔ اسی طرح غزوہ قریظہ غزوہ خندق کے بعد اور خیبر حدیبیہ کے بعد اس طرح یہود کے ساتھ کل چار غزوات پیش آئے۔

غزوہ ذات الرقاع:

پھر جمادی الاولی میں نبی کریم ﷺ نے غزوہ ذات الرقاع میں خود بنفس نفیس حصہ لیا۔ یہ نجد کا غزوہ ہے، اور بنی غطفان کے ارادے سے نکلے۔ اس غزوہ میں آپ نے صلاۃ خوف ادا فرمائی۔ اس غزوے کے متعلق ابن اسحاق اور اہل سیر ومغازی کا یہی قول ہے اور اس کو اور لوگوں نے روایت بھی کیا ہے، لیکن یہ بہت مشکل سا مسئلہ ہے۔

بظاہر پہلی مرتبہ صلاۃ خوف آپ نے غزوہ عسفان میں پڑھی(۱) غزوہ خندق کے بعد پیش آیا اور آپ سے یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ اس کو غزوہ ذات الرقاع میں پڑھی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خندق وعسفان کے بعد واقع ہوا تھا۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ابو ہریرہ اور ابوموسی رضی اللہ عنہما صحیحین کی روایت کے مطابق غزوہ ذات الرقاع میں شریک تھے۔(۲)

غزوہ بدر ثانیہ:

جب آئندہ سال شعبان کا مہینہ آیا اور ایک روایت کے مطابق ذوالقعدہ کا، تو رسول اللہ ﷺ ابوسفیان سے وعدہ کے مطابق ایک لشکر لے کر نکلے۔ آخر بدر کے مقام پر پہنچے اور وہاں مشرکین کا انتظار کیا۔ ابوسفیان بھی مکہ سے دو ہزار کا لشکر لے کر نکلا اور ان کے ساتھ پانچ سو سوار تھے اور جب یہ مر الظھران پہنچے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے تو وہ لوگ کہنے لگے، یہ خشک سالی کا سال ہے، اس لئے مناسب ہے کہ ہم واپس لوٹ جائیں۔

(۱) ترمذی: ۳۰۳۸، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) بخاری: ۴۱۲۸، مسلم: ۱۸۱۶

غزوہ دومۃ الجندل:

ربیع الاول سنہ ۵ ہجری میں رسول اللہ ﷺ دومۃ الجندل کی طرف نکلے۔وہاں آباد قبیلوں کے مویشیوں پر حملہ ہوا، اور ان میں سے کچھ مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے۔اس حملہ کو سن کر اہل قبیلہ دومۃ الجندل بھاگ کھڑے ہوئے۔

غزوہ مریسیع:

یہ غزوہ ماہ شعبان سنہ ۵ ہجری میں واقع ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ بنی مصطلق کا سردار حارث بن ابی ضرار اپنے قبیلہ اور قرب و جوار کے عربوں کا ایک جم غفیر لے کر رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے نکلا۔

مدینہ خبر پہنچی تو آپ نے پہلے بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو بنی مصطلق کی خبر لانے بھیجا۔ پھر آپ خود مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ نکلے، جب مریسیع نام مقام پر پہنچے تو حارث کی فوج خود بخود منتشر ہوگئی، مگر آپ ﷺ اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور قیدی اور ساز و سامان بطور غنیمت حاصل کیے۔

اسی میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو ہوا جس کی تلاش میں تاخیر ہونے کی وجہ سے آیت تیمّم نازل ہوئی، طبرانی کی روایت کے مطابق اس موقعہ پر ابوبکر نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا: ہر سفر میں تم مصیبت و آزمائش بن جاتی ہو! تو پھر اللہ نے آیت

تیمّم نازل فرمائی۔

مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہار کے گم ہونے اور آیت تیمّم کے نزول کا واقعہ اس سفر کے بعد کا ہے مگر اس سفر میں بھی ہار کی گمشدگی کا واقعہ ہوا جس کے نتیجہ میں واقعۂ افک پیش آیا اور بعض لوگوں پر یہ دونوں واقعات مشتبہ ہو گئے۔

فصل (۷۲)

واقعہ افک

غزوہ مریسیع سے ''افک'' کا مشہور واقعہ بھی تعلق رکھتا ہے۔جس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھیں۔ واپسی پر جبکہ لشکر ایک جگہ پڑاؤ ڈالے تھا، وہ استنجاء کے لئے میدان میں گئیں۔ واپس آئیں تو معلوم ہوا کہ گلے کا ہار جو بہن سے عاریۃً لائی تھیں گم ہے۔فوراً تلاش میں واپس ہوئیں۔اسی اثناء میں لشکر نے کوچ کر دیا۔ جو لوگ ان کا کجاوہ اونٹ پر باندھا کرتے تھے انہوں نے جلدی میں کجاوہ اٹھا کے یہ سمجھتے ہوئے باندھ دیا کہ وہ اندر ہیں۔ یہ اس وقت کم سنی کی وجہ سے بہت ہلکی پھلکی تھیں، اس لئے انہیں کچھ محسوس نہ ہوا۔

صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے پیچھے چلتے تھے کہ گری پڑی چیز لے آئیں، ان کی نظر جب عائشہ پر پڑی تو (انا اللہ) کہہ کر سکتہ میں آ گئے۔ وہ انہیں پہچانتے تھے کیونکہ پردہ شروع ہونے سے پہلے بارہا دیکھ چکے تھے۔انہوں نے کچھ کہا سنا نہیں، ادب سے اونٹ قریب لا کے بیٹھا دیا اور وہ سوار ہو گئیں۔ یہ خود مہار تھامے پیدل روانہ ہوئے یہاں تک کہ لشکر سے آ ملے۔لوگوں نے یہ بات دیکھی تو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تاویلیں کرنے لگے۔ابن ابی منافق کو معلوم ہوا تو فوراً تہمت لگا دی اور شہرت دینے لگا۔

مدینہ میں افترا پردازوں نے ہر طرف شور مچانا شروع کیا۔آپ ﷺ اول بالکل خاموش رہے پھر صحابہ سے مشورہ فرمایا۔علی رضی اللہ عنہ نے اشارتاً طلاق کی صلاح دی کیونکہ معاملہ مشکوک ہو چکا تھا اور شک کے مقابلہ میں یقین کو ترجیح دینا مناسب ہے۔ علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کو اس رنج وغم سے نجات مل جائے جو لوگوں کی چہ میگوئیوں اور الزام سے لاحق ہوا تھا۔لیکن اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی اور ساتھ ہی رکھنے کا مشورہ دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ ان سے اور ان کے والد ماجد ابو بکر رضی اللہ عنہ سے غیر معمولی محبت وتعلق رکھتے ہیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت وعصمت اور تدین کا پورا یقین رکھتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالی اپنے محبوب نبی کی شریک حیات اور اپنے صدیق کی لڑکی کو افترا پردازوں کے الزامات کا مصداق بنائے۔

یہ دونوں کے نقطہ نظر کا اختلاف پر تھا اور ان سب صحابہ کرام کو یقین کامل تھا کہ عائشہ ام المومنین عصمت وعفت کی پیکر ہیں اور ہر طرح کے شک وشبہات سے بالاتر ہیں اور رسول اکرم ونبی اطہر کی شریک حیات غیر پارسا ہو ہی نہیں سکتیں۔اس لئے ابو ایوب رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کی زبان سے بیک وقت یہ نکلا: ﴿سبحانك هذا بهتان عظيم﴾ سبحان اللہ، یہ تو کھلی ہوئی تہمت ہے۔

اس واقعہ کے بعد کامل ایک ماہ تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا مگر جب وحی آئی تو عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کے ساتھ آئی۔ آپ ﷺ نے جب براءت کی آیتیں پڑھیں تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسرت سے اچھل پڑے اور صاحبزادی سے کہنے لگے اٹھو، رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ اس وقت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خودداری اور جرأت قابل ذکر ہے۔ انہوں نے جواب دیا، اللہ کی قسم میں ان کا ہرگز شکریہ ادا نہ کروں گی۔ میں صرف اپنے اللہ کا شکریہ ادا کروں گی جس نے میری براءت نازل فرمائی۔ یہ جواب ان کی پاکدامنی، بلند ہمتی اور ثابت قدمی کی بہترین مثال ہے۔

جب وحی کے ذریعہ براءت ثابت ہوگئی تو آپ ﷺ نے تہمت لگانے والے لوگوں کو اسی درے لگوائے کیونکہ تہمت لگانے کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔

اس جگہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اس مسئلہ میں قدرے توقف و تحقیق سے کیوں کام لیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ان حکمتوں کے اظہار کے لئے تھا جو اللہ تعالی نے اس واقعہ کے اندر پوشیدہ کر رکھی تھیں، اور رسول اللہ ﷺ اور قیامت تک آنے والے آپ کی امتیوں کے لئے بطور امتحان و آزمائش مقصود تھیں تاکہ کچھ لوگوں کو پست اور کچھ لوگوں کو بلند کیا جائے۔

آزمائش ہی کا تقاضا تھا کہ ایک ماہ تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا اور پوری حکمت الٰہی

کا ظہور عمل میں آیا۔اس طرح مومنوں کے ایمان میں اضافہ اور عدل وحسن ظن پر ثابت قدمی میں زیادتی ہوئی، اور منافقین اپنے نفاق وافترا پردازی پر جمے رہے۔اس طرح ان کے پوشیدہ ارادے بالکل نمایاں ہوگئے اور عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے والد ماجد کی شان عبودیت ظاہر ہوئی اور اللہ تعالی کی نعمتیں ان پر تمام ہوئیں، کیونکہ انہوں نے اللہ کے حضور عاجزی وحاجتمندی کا اظہار کیا اور مخلوق سے کٹ کر خالق سے امید باندھی۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع کا پورا حق اس وقت ادا کردیا جب ان کے والدین نے فرمایا کہ اٹھو رسول اللہ ﷺ کی طرف جاؤ کہ اللہ تعالی نے تمہاری براءت کی وحی نازل فرمادی ہے،تو کہنے لگیں اللہ کی قسم! میں ان کی طرف خود نہ جاؤں گی اور میں صرف اللہ ہی کی حمد وثنا کروں گی کیونکہ اسی نے میری براءت نازل فرمائی ہے۔

اگر اللہ تعالی فوری طور پر رسول اللہ ﷺ کو اصل حقیقت سے مطلع فرمادیتا تو یہ تمام امور اور حکمتیں فوت ہوجاتیں اور کسی کو کچھ معلوم نہ ہوتا۔مزید اللہ تعالی کی یہ بھی مشیئت تھی کہ جو اس کے ہاں رسول اللہ ﷺ اور آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ ہے، اسے ظاہر کرے اور خود بنفس نفیس ان کا دفاع کرے، اور ان دشمنوں کی تردید کرے جو آپ کی طرف بے بنیاد باتیں منسوب کررہے ہیں۔

مزید یہ کہ اس افتراء وتہمت کا مقصد نبی کریم ﷺ کو تکلیف دینا تھا جب کہ آپ

کی زوجہ مطہرہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام تھا۔اس وقت ان کی پاکدامنی کے لئے خود آپ کی شہادت موزوں نہ تھی۔آپ کو عائشہ کی براءت کا پورا یقین تھا اور دوسرے مومنوں سے زیادہ آپ کے پاس دلائل وقرائن تھے،لیکن کمال صبر وتحمل کی وجہ سے آپ خاموش رہے اور صبر وثبات کا حق ادا فرما دیا اور اس کی عدیم المثال روایت قائم فرما دی اور جب عائشہ کی براءت کے سلسلہ میں وحی نازل ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے سوائے عبداللہ بن ابی کے جس نے بھی تہمت میں حصہ لیا تھا کوڑے لگانے کا حکم فرمایا۔تو علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ حدود جاری ہونے سے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے لیکن چونکہ ابن ابی منافق تھا، اس لئے حدود کا مستحق نہیں بلکہ اس کے لئے دردناک عذاب کا وعدہ ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ حدود اسلامیہ کا نفاذ تو اقرار سے ثابت ہوتا ہے یا گواہوں کی شہادت سے اور اس کے سلسلہ میں نہ تو کسی نے گواہی دی اور نہ اس نے خود اعتراف واقرار کیا، کیونکہ اس کے گروہ کے لوگ اس کے خلاف گواہی نہیں دے سکتے تھے اور وہ خود مسلمانوں کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرتا تھا اس لئے حد سے محفوظ رہا۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ حد قذف میں یہ اصول ہے کہ جس پر تہمت لگائی جائے وہ

تہمت لگانے والے پر حد جاری کرنے کا مطالبہ کرے اور عائشہ نے اس کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

چوتھا جواب: یہ ہے کہ بر بنائے مصلحت اس پر حد نہیں جاری کی گئی جس طرح نفاق کے ظاہر ہو جانے بعد بھی قتل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اپنی قوم کا سردار تھا اور اس کی طرف سے فتنہ انگیزی کا اندیشہ تھا اور لوگوں میں اسلام سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ ان بعض وجوہ کی بنا پر حد جاری نہیں کی گئی۔ اس غزوہ سے واپسی پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ:

﴿لَئِن رَّجَعۡنَا إِلَى ٱلۡمَدِينَةِ لَيُخۡرِجَنَّ ٱلۡأَعَزُّ مِنۡهَا ٱلۡأَذَلَّ﴾[المنافقون:۸]

اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والے ذلت والوں کو وہاں سے باہر نکال دیں گے۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچائی۔ عبداللہ بن ابی عذر کرتا ہوا آیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔ اللہ تعالی نے سورہ منافقون میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی تصدیق نازل فرمائی۔ نبی کریم ﷺ نے زید سے فرمایا کہ خوش ہو جاؤ، اللہ تعالی نے تمہاری تصدیق کر دی اور مزید فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے کان کا حق ادا کر دیا۔

عمر رضی اللہ عنہ جو حاضر مجلس تھے، عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! عباد بن بشر کو حکم دیجئے کہ اس بد بخت کی گردن ماردیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔

(۱) بخاری: ۴۹۰۰، مسلم: ۲۷۷۲

فصل (۷۳)

غزوہ خندق

یہ غزوہ شوال سنہ ۵ ہجری میں واقع ہوا۔ سبب یہ ہوا کہ یہودیوں نے جب احد میں مشرکین کی کامیابی اور مسلمانوں کی شکست دیکھی اور سنا کہ ابوسفیان آئندہ سال پھر حملہ کرنے والا ہے، تو ان کی بھی ہمتیں بلند ہوگئیں چنانچہ یہود کے سردار قریش کے پاس گئے۔ انہیں حملہ کے لئے اکسایا اور اپنی امداد واعانت کا یقین دلایا۔ ان کے وعدے سے قریش کو اور زیادہ جرأت ہوئی، اور وہ ان کے صلاح ومشورہ سے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے اور قبیلہ غطفان اور دوسرے قبائل عرب کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے لگے۔ تھوڑی ہی مدت میں ایک لشکر جرار فراہم ہوگیا، جس میں دس ہزار جانباز مختلف قبائل عرب میں سے تھے اور یہودی بھی شریک تھے۔ سپہ سالاری ابوسفیان کو دی گئی اور اس فوج گراں نے سیلاب بلا بن کر مدینہ کی سمت پیش قدمی شروع کی۔

اطلاع ملنے پر نبی کریم ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی اور تین ہزار مجاہدوں کی جمعیت لے کر آپ ﷺ شہر سے نکلے اور خندق پر پڑاؤ ڈال دیا۔ عین اس وقت یہودی قبائل نے معاہدہ توڑ دیا اور قریش سے مل گئے اور منافقین کا نفاق کھل گیا جس کا اثر مسلمانوں پر بہت برا ہوا اور بہت سے

لوگ بددل ہو گئے۔

اس دوران مشرکین کا لشکر بھی آ پہنچا اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ پورے ایک مہینہ تک محاصرہ اپنی پوری شدت سے جاری رہا آخر اللہ تعالی نے آندھی کا ایک ہولناک طوفان بھیج دیا جس نے کفار کو سخت بدحواس کر ڈالا اور وہ بڑی ابتری کے ساتھ فرار ہو گئے۔ اسی طرح بلا کسی بڑے کشت وخون کے دشمنان اسلام رسوا وخوار ہو کر شکست یاب ہوئے اور مسلمانوں کا دبدبہ ہر طرف قائم ہو گیا۔

کفار کی ناکام واپسی کے بعد آپ ﷺ بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے اور ہتھیار کھولنے لگے۔ عین اس وقت اللہ تعالی کا حکم پہنچا کہ بنو قریضہ کو ان کی عہد شکنی کی سزا دیجئے، چنانچہ فوراً منادی کرا دی گئی کہ ہر شخص نماز عصر سے پہلے پہلے بنی قریضہ کی سرزمین پر پہنچ جائے اور خود بھی فوراً روانہ ہو گئے۔ یہودیوں نے بھی مقابلہ کیا لیکن بالآخر مقہور ومغلوب ہوئے۔ جن کی قسمت میں قتل ہونا تھا قتل ہوئے، باقی ذلت میں پڑے حتی کہ کوئی نام لینے والا نہ رہا۔ ان دونوں لڑائیوں میں دس مسلمان شہید ہوئے۔

اسی مقام پر علامہ ابن قیم نے قبیلہ عُرنہ کے لوگوں کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا (۱) ہے کہ اس سے درج ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں:

۱- اونٹ کا پیشاب پینا جائز ہے۔

---

(۱) بخاری: ۲۳۳، مسلم: ۱۶۷۱

۲۔جس جانور کا گوشت کھانا جائز ہے اس کا پیشاب پاک ہے۔

۳۔جنگجو کفار اگر اموال پر قبضہ کرلیں تو انہیں ہاتھ پیر کاٹنے اور قتل کی سزا دی جائے گی۔

۴۔مجرم جیسا جرم کرے ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ کیا جائے گا۔

چنانچہ ان لوگوں نے چرواہے کی آنکھوں میں سلائی ڈالی تھی تو ان کی آنکھوں میں بھی سلائی ڈالی گئی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ واقعات مستقل حکم کا درجہ رکھتے ہیں اگر چہ اس وقت تک اسلامی حدود کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے لیکن نازل ہونے کے بعد اس کا اثبات ہوا نہ کہ ابطال۔

فصل (۷۴)

صلح حدیبیہ کا واقعہ

یہ واقعہ ذی القعدہ سنہ ٦ ہجری میں پیش آیا۔ تفصیل یہ ہے کہ آپ ﷺ چودہ سو مسلمانوں کے ہمراہ عمرہ کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے۔ ایک جاسوس پہلے سے بھیج دیا تھا کہ قریش کی نقل وحرکت سے آگاہ کرتا رہے۔ مقام عسفان میں پہنچے تو مخبر نے خبر دی کہ قریش نے اپنی تیاریاں مکمل کرلی ہیں وہ آپ سے جنگ کریں گے اور کعبہ سے قریب نہ ہونے دیں گے۔

آپ ﷺ نے مشورہ کیا۔ صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اپنی طرف سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے لیکن اگر کوئی راستہ روکے تو پھر جنگ کی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی یہ رائے پسند کی اور آگے بڑھے۔

آپ ﷺ نے مقام حدیبیہ پہنچ کر عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دے کر مکہ بھیجا کہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں آئے، صرف عمرہ مقصود ہے، اس لئے ہمیں نہ روکو۔ قریش نے یہ پیغام بے پروائی سے سنا اور عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے ہم نے سن لیا، بس رہنے دو۔ اس کے بعد صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو بڑھتے بڑھتے جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی۔ فریقین نے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا اور

تیر برسائے۔ اسی دوران آپ ﷺ کو خبر ملی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔اس سے مسلمانوں میں سخت غم وغصہ پیدا ہو گیا اور سب نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ لڑیں گے اور کسی حال میں بھی نہ بھاگیں گے۔لیکن عثمان رضی اللہ عنہ جلد ہی مکہ سے صحیح وسالم واپس آ گئے جس سے جوش ٹھنڈا ہوا اور صلح کی گفتگو از سر نو شروع ہوئی۔ پھر حسب ذیل شرطوں پر عہد نامہ لکھا گیا:

۱۔دس سال تک جنگ وجدال موقوف رہے اور کوئی کسی کو نہ ستائے۔

۲۔مسلمان اس وقت واپس جائیں۔آئندہ سال آسکتے ہیں مگر نیزے اور تیر نہ لائیں۔صرف تلواروں کی اجازت ہے اور وہ بھی نیاموں کے اندر ہوں۔

۳۔مکہ میں تین دن قیام رہے گا۔اس کے بعد فوراً واپسی ہوگی۔

۴۔ان دس سالوں میں جو مسلمان قریش کے پاس آئے گا، وہ اسے واپس نہ کریں گے،لیکن قریش کا جو آدمی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا وہ اسے واپس کر دیں گے۔

اس آخری شرط نے مسلمانوں کو نہایت برہم کر دیا اور وہ نبی کریم ﷺ سے کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ شرط بھی ہم منظور کر لیں گے؟ آپ نے جواب دیا، ہمارا جو آدمی ان کے پاس چلا جائے گا خدا کی اس پر رحمت ہوگی اور ان کا جو آدمی ہمارے پاس آجائے گا اور ہم ان کے حوالے کر دیں گے، اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال

دے گا۔

معاہدہ مکمل ہوگیا تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اٹھو، قربانی کرو اور سر منڈاؤ۔

صلح حدیبیہ کے بعض اہم واقعات

اس موقع پر قبیلہ خزاعہ آپ ﷺ کی حمایت میں داخل ہوا اور قبیلہ بکر قریش کی حمایت میں۔

۱-صلح حدیبیہ ہی کے موقع پر اللہ تعالی نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ حکم نازل فرمایا کہ حالت احرام میں سر منڈانے والے فدیہ میں روزہ رکھیں یا صدقہ یا قربانی کریں۔(۱)

۲-اس صلح میں نبی کریم ﷺ نے حلق کرنے والوں کے لئے تین بار اور قصر کرانے والوں کے لئے ایک بار دعائے مغفرت فرمائی۔

۳-اسی موقع پر دس آدمیوں کی جانب سے ایک اونٹ نحر (ذبح) فرمایا اور سات آدمیوں کی جانب سے ایک گائے ذبح کی۔

(۱) بخاری:۱۸۱۴، مسلم:۱۲۰۱

۴-اس واقعہ میں آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو ہدی میں دیا جو کہ ابو جہل کی ملکیت میں رہ چکا تھا تا کہ مشرکین جل اٹھیں۔

۵-اسی موقعہ سورہ فتح نازل ہوئی۔

جب آپ ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو کچھ عورتیں مسلمان ہو کر آئیں لیکن اللہ تعالی نے انہیں واپس کرنے سے منع فرما دیا۔ کہا گیا کہ عورتوں کے معاملہ میں یہ شق منسوخ ہو گئی۔

ایک قول یہ ہے کہ قرآن نے سنت کو محدود کر دیا اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں صرف مردوں کے متعلق یہ شرط طے ہوئی تھی، چنانچہ مشرکین نے چاہا کہ اس کا دونوں صنفوں (مرد و عورت) پر اطلاق کیا جائے لیکن اللہ تعالی نے اس سے انکار فرمایا۔

صلح حدیبیہ سے مستنبط بعض احکام و مسائل:

۱-یہ معلوم ہوا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کیا جا سکتا ہے، اور میقات سے عمرہ کا احرام باندھنا افضل ہے، جیسا کہ حج کا احرام۔ جس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ "بیت المقدس سے عمرہ کا احرام باندھنے والے کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں" وہ ثابت نہیں۔

۲-یہ بھی معلوم ہوا کہ تنہا عمرہ میں قربانی کا جانور بھیجنا سنت ہے اور اس میں

علامت لگانا سنت ہے نہ کہ مثلہ کیا جائے کیونکہ یہ ممنوع ہے۔

۳۔معلوم ہوا کہ دشمنان اسلام کو جلانا مستحب ہے۔

۴۔ نیز معلوم ہوا کہ امیر کو چاہیئے کہ دشمنوں کی نقل وحرکت کا اندازہ کرنے کے لئے جاسوس ارسال کرے۔

۵۔ نیز اہل شرک سے بوقت ضرورت جہاد میں تعاون و مدد حاصل کرنا جائز ہے، چنانچہ عیینہ خزاعی سے جو کہ کافر تھا آپ نے مدد لی تھی۔

۶۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ امام رعیت سے مشورہ کرسکتا ہے تاکہ صحیح رائے سامنے آئے، لوگوں کو اطمینان قلب ہو اور حکم الٰہی پر عمل ہو۔

۷۔معلوم ہوا کہ مشرکین کی اولاد کو جنگ سے پہلے قید کرنا جائز ہے۔

۸۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ غلط بات کی خواہ غیر مکلّف کی طرف منسوب ہو تردید کرنی چاہیئے، چنانچہ جب لوگوں نے کہا کہ قصواء اونٹنی اَڑ گئی ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ اَڑی نہیں، اور نہ اسے زیبا ہے۔(۱)

۹۔ دین کی خبر پر حلف اٹھانا جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔ جس سے اس کی تاکید ہو، نبی کریم ﷺ سے اسّی سے زاید بار حلف اٹھانا ثابت ہے، اور تین مقامات پر تو اللہ

(۱) بخاری: ۲۷۳۱

تعالی نے تصدیق کے لئے حلف اٹھانے کا حکم دیا۔جیسا کہ سورہ یونس،سورہ سبأ اورسورہ تغابن میں مذکور ہے۔

۱۰-مشرکین،اہل بدعت،فسق وفجور میں مبتلا لوگ بھی اگر اللہ کی محرمات کی عظمت واحترام کا مطالبہ کریں تو اس سلسلہ میں ان سے تعاون کرنا چاہیئے اور دوسروں کو ان سے روکنا چاہیئے اور حرمات اللہ کی تعظیم میں ان کی مدد کرنا چاہیئے ، البتہ ان کے ذاتی فسق وفجور میں بالکل تعاون نہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالی کی پسندیدہ چیز پر مدد طلب کرنے والے شخص کی بہر حال مدد کی جائے ، بشرطیکہ اس سے کوئی ناپسندیدہ چیز کا ظہور لازم نہ آئے۔

یہ مقام بہت نازک اور مشکل ہے،اس لئے بہت سے صحابہ کے دلوں میں تنگی پیدا ہوئی تھی۔عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے اس موقع پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں نبی کریم ﷺ کا جواب دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ تمام صحابہ میں افضل تھے،اللہ،رسول اور دین کے بارے میں ان کی واقفیت سب سے زیادہ اور رسول اللہ ﷺ کی موافقت میں سب سے زیادہ سخت تھے۔اسی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہکے علاوہ کسی اور صحابی سے دریافت نہیں کیا۔

۱۱-یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ حدیبیہ کی جانب دائیں طرف مائل ہوکر نکلے تھے۔اسی وجہ سے امام شافعی کا قول ہے کہ اس کا بعض حصہ حرم میں ہے اور بعض حصہ حل میں۔اسی واقعہ کے ضمن میں امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ حرم میں نماز پڑھتے تھے اور قیام حدود حرم سے باہر تھا۔(۱) اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اجر میں اضافہ کا وعدہ پورے حرم سے متعلق ہے۔صرف مسجد سے نہیں اور آپ کا ارشاد گرامی (۲): ”صلاة فی المسجد الحرام“ اللہ کے اس فرمان کی طرح ہے: فلا يقربو المسجد الحرام اور سبحن الذی أسری بعبده ليلا من المسجد الحرام میں ہے“۔

۱۲-معلوم ہوا کہ جو مکہ کے قریب اترے اسے چاہیئے کہ حل میں اترے اور حرم میں نماز ادا کرے۔ابن عمر رضی اللہ عنہما ایسا ہی کرتے تھے۔

۱۳-یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر امام صلح کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

۱۴-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر مسلم قاصدوں کی آمد کے موقع پر فخر اور شان

---

(۱) مسند احمد: ۴/۳۲۶، اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(۲) بخاری: ۱۱۹۰، مسلم: ۱۳۹۴

وشوکت اور امام کی توقیر و تعظیم کے لئے کسی کا بطور محافظ تلوار لے کر کھڑا ہونا مناسب اور جائز ہے۔ یہ تکبر مذموم میں شمار نہیں ہوگا، جیسا کہ مغیرہ رضی اللہ عنہ اس موقع پر آپ کے سر کے پاس تلوار لے کر کھڑے تھے اور وہ آپ کے ہمیشہ کے معمول میں نہ تھا۔

۱۵- دوسرے یہ کہ قاصد کے سامنے اونٹوں کو بھیجنے سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ کفار کے قاصدوں کے سامنے اسلامی شعائر کا اظہار مستحب ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ اسلام مجھے قبول ہے اور مال سے کوئی مطلب نہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ معاہدہ والے مشرک کا مال محفوظ ہے۔ اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ واپس کر دیا جائے گا کیونکہ مغیرہ امان کے بعد ان کی مصاحبت میں آئے تھے۔ پھر بے وفائی کر کے قبضہ کر لیا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے مال سے کوئی تعرض نہ کیا، نہ مدافعت کی، نہ ضمانت دی، کیونکہ یہ واقعہ مغیرہ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے پیش آیا۔

۱۶- اس سے یہ معلوم ہوا کہ مصلحۃً شرمگاہ کا نام کھلے الفاظ میں لیا جا سکتا ہے جیسا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عروہ بن مسعود کو مخاطب کر کے کہا تھا "اُمْصُصْ بَظْرَ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی" لات وعزیٰ کی شرمگاہ چوسو، اور جیسا کہ جاہلیت کے دور کے نعروں کو دہرانے والے شخص کے حق میں باپ کی شرمگاہ کی صراحت کا حکم ہے۔

اس میں کسی طرح کا کنایہ نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ہر مقام کے مناسب ایک بات

ہوتی ہے۔

۱۷-قاصدین کی بے ادبی پر صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ جیسا کہ عروہ کے آپ ﷺ کی داڑھی پکڑنے پر آپ کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

۱۸۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مستعمل پانی، تھوک و بلغم وغیرہ جیسے مواد پاک ہیں۔

۱۹- معلوم ہوا کہ نیک فال لینا مستحب ہے، کیونکہ سہیل کی آمد پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اب کام آسان ہو گیا''

۲۰-اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصلحت کی بنیاد پر مشرکین کا ساتھ دے کر صلح کرنا جائز ہے۔

۲۱-اگر کوئی شخص وقت کے تعین کے بغیر قسم کھائے یا نذر مانے یا کوئی وعدہ کرے تو اس کی تعمیل فوری ضروری نہیں بلکہ اسے مہلت رہے گی۔

۲۲-حلق کروانا عبادت ہے اور وہ قصر سے افضل ہے۔عمرہ میں بھی حج کی طرح حلق یا تقصیر ہے۔حج یا عمرہ میں زبردستی روکے گئے شخص کے لئے بھی حلق یا تقصیر کرنا ہے۔

۲۳-محصر (جو روک لیا جائے) اسی جگہ قربانی کرے جہاں اسے روکا گیا، چاہے حل ہو یا حرم، یہ ضروری نہیں کہ جانور کسی شخص کو دے تا کہ وہ حرم لے جا کر اس کی قربانی کرے اور یہ کہ ھدی کے اپنے قربان ہونے سے پہلے وہ شخص حلال نہ ہوگا، کیونکہ

قرآن میں ارشا گرامی ہے:

﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ﴾[الفتح:۲۵]

اور قربانیوں کو قربان گاہ تک پہنچنے سے روکا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

۲۴- جس جگہ ان لوگوں نے قربانی کی تھی وہ حل کا مقام تھا کیونکہ حرم پورا کا پورا قربانی کی جگہ ہے اگر جانور وہاں پہنچ جاتا تو آیت میں روکنے کا ذکر نہ ہوتا۔

۲۵- یہ بھی معلوم ہوا کہ محصر پر قضا نہیں ہے۔اس صلح کے بعد عمرہ کو عمرۃ القضاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے دوبارہ کرنے پر معاہدہ کیا تھا۔

۲۶- یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم عام کی تعمیل فوری ضروری ہے ورنہ تو رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے فوراً عمل نہ کرنے پر ناراض نہ ہوتے۔صحابہ کا یہ توقف وتردد سعی مغفور تھی، نہ کہ سعی مشکور۔اللہ تعالی نے ان کی کوتاہیوں کو معاف کردیا تھا اور جنت کا حقدار کردیا تھا۔

۲۷- کفار سے اس شرط پر معاہدہ جائز ہے کہ اگر مسلمان مردوں میں سے کوئی آئے تو اسے واپس کردیا جائے۔اگر عورتیں آئیں تو انہیں نہ لوٹایا جائے کیونکہ ان کا لوٹانا جائز نہیں۔اس معاہدہ کا یہی جز قرآن کی نص سے منسوخ ہے دوسرے اجزا کی منسوخی کا دعوی صحیح نہیں۔

۲۸- یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر شوہر کے نکاح سے بھاگ آئے تو ایسی صورت میں متفقہ ومتعینہ قیمت ادا کی جائے اور مہر مثل کا اعتبار نہ ہوگا۔

۲۹- کفار کے پاس معاہدہ امام کے پاس آنے والے کسی شخص کو لوٹانے میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جو اسلام کی حالت میں امام کے علاوہ کسی اور علاقہ میں چلا جائے۔ ایسا شخص اگر امام کے علاقہ میں آئے گا تو بغیر طلب اس کا لوٹانا ضروری نہیں۔

۳۰- اگر کسی نے بھاگ کر آنے والے مسلمان کو حوالہ کر دیا اور پھر وہ راستہ میں ان لوگوں کو قتل کر دے، تو اس پر دیت یا قصاص واجب نہ ہوگا اور نہ امام اس کا ذمہ دار ہوگا۔

۳۱- اگر کسی مسلمان بادشاہ اور کافروں کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہو تو کسی دوسرے علاقہ کا حاکم ان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ایسا ہی فتوی دیا ہے۔ انہوں نے مشرکین کے ساتھ ابو بصیر کے معاملہ کی مثال بطور دلیل پیش کی ہے۔

واقعہ صلح حدیبیہ میں بعض مخفی حکمتیں:

اس واقعہ میں جو بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں، انہیں سوائے اللہ تعالی کے کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہاں بعض حکمتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱- یہ معاہدہ عظیم الشان فتح کا پیش خیمہ تھا، اور اللہ تعالی کی یہ سنت طیبہ ہے کہ جو بھی عظیم المرتبت وجلیل القدر کام کرتا ہے تو اس کے لئے پہلے مقدمات اور تمہید قائم فرماتا

ہے جو اس کا سبب بنتی ہیں اور اس کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

۲- یہ معاہدہ سب سے بڑی فتح تھی کیونکہ لوگوں نے ایک دوسرے کو امان دے دی، اور مسلمان اور کفار آپس میں آزادانہ ملنے لگے۔ انہیں اسلام وقرآن کی دعوت دینے لگے اور اسلام کے متعلق علانیہ مناظرے شروع ہو گئے۔ مخفی طور پر جو مسلمان تھا، وہ ظاہر ہو گیا اور اس مدت میں جس نے چاہا وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس طرح وہ شرائط جنہیں کفار نے اپنے فائدے کے لئے معاہدہ میں شامل کیا تھا مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئیں۔ کفار عزت کی سوچ رہے تھے لیکن انہیں ذلت نصیب ہوئی اور مسلمانوں نے اللہ کے سامنے عاجزی کی تو انہیں عزت حاصل ہوئی۔ اس طرح باطل کے سہارے حاصل ہونے والی عزت حق کی وجہ سے ذلت بن گئی۔

۳- اس معاہدہ کو اللہ تعالی نے ایمان ویقین میں اضافہ کا سبب قرار دیا۔ قضاوقدر الٰہی پر رضامندی، وعدوں کی تصدیق، اس کے وعدوں کا انتظار، پھر سکینہ کی صورت میں اللہ تعالی کے انعامات کا مشاہدہ جس کے ذریعہ دلوں کو اطمینان نصیب ہوا اور انہیں قوت حاصل ہوئی، جس کی انہیں سخت ضرورت تھی کیونکہ حالات ایسے سنگین تھے کہ پہاڑ بھی ڈگمگا جاتا۔

۴- اس صلح نامہ کو اللہ تعالی نے اپنے رسول کے تمام گزشتہ وآئندہ گناہوں کی

بخشش کا سبب بنایا اور ان پر اپنی نعمت کے اتمام اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت، غلبہ ونصرت کا سبب قرار دیا۔

یہاں پر اللہ تعالی نے مومنوں کے دلوں کو اضطراب و پریشانی کے موقع پر سکون واطمینان سے متصف فرمایا، پھر اللہ تعالی نے اپنے رسول کی بیعت کا ذکر فرمایا اور اسے اس طرح مؤکد کیا گویا کہ اللہ تعالی کی ہی بیعت ہے۔ جب نبی کریم ﷺ کا دست مبارک ان کے ہاتھوں پر تھا تو گویا کہ ان پر اللہ تعالی کا دست مبارک تھا۔

پھر خبر دی کہ اس عہد کو توڑنے والے کی اس حرکت کا زوال خود اس پر آ کر رہے گا، اور ان اعراب کا ذکر فرمایا جنھوں نے عہد شکنی کی اور اللہ کے ساتھ بدظنی کا ثبوت دیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی وجہ سے مومنوں سے راضی ہوا اور اس وقت ان کے قلوب جس صدق ووفا سے پُر تھے، خدا ہی خوب جانتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے ان کے قلوب پر سکینہ وطمانیت، اور رضا نازل فرمائی اور ان کو فتح ونصرت سے ہمکنار کیا اور کثیر مال غنیمت سے نوازا۔

سب سے پہلی فتح اور غنیمت خیبر میں حاصل ہوئی تھی پھر فتوحات وغنائم کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا۔

مسلمانوں سے مخالفین کے ہاتھوں کو روکنے کا جو ذکر ہے اس کی تفسیر میں بعض

لوگوں کا قول ہے کہ اہل مکہ کے شر سے محفوظ کرنا مراد ہے۔بعض کا قول ہے کہ یہودیوں کی طرف اشارہ ہے جو صحابہ کے مدینہ سے نکلنے کے بعد وہاں پر موجود مسلمانوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔بعض حضرات کا قول ہے کہ خیبر کے لوگ اور قبیلہ اسد وغطفان کے حلیف لوگ مراد ہیں۔لیکن صحیح وراجح قول یہ ہے کہ آیت ان تمام دشمنان اسلام کے حق میں عام ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَلِتَكُونَ ءَايَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾[الفتح: ٢٠]

اور تا کہ مومنوں کے لئے نشانی بن جائے۔

نشانی بننے والی چیز کو بعض نے ہاتھوں کے روکنے کو اور بعض نے فتح خیبر کو قرار دیا ہے۔اس نعمت کے بعد اللہ تعالی نے مسلمانوں کو نعمت ہدایت سے بھی نوازا اور ان سے ایسی فتوحات وغنائم کا وعدہ فرمایا جن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس کی تفسیر فتح مکہ، روم، فارس اور خیبر کے بعد مشرق ومغرب کی دیگر فتوحات سے کی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر کفار اولیاء اللہ سے جنگ کریں تو انہیں نصرت نہ ملے گی اور پیٹھ پھیر کر فرار ہو جائیں گے،اور اس کے بندوں میں یہ اللہ تعالی کی سنت قدیمہ چلی آ رہی ہے اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔

اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ ایسی صورت حال غزوہ احد میں کیوں پیش نہیں آئی،تو اس کا

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی کا یہ وعدہ صبر وتقوی کی شرط سے مشروط ہے، اور احد کے دن چونکہ مسلمانوں نے صبر کا دامن چھوڑ دیا تھا اور سستی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا اور تقوی کے بجائے مخالفت ونافرمانی میں ملوث ہو گئے، اس لئے اللہ تعالی کا وعدہ پورا نہ ہوا۔

پھر مذکورہ مردوں اور عورتوں کی وجہ سے ہاتھوں کو روکنے کا ذکر کیا اور ان سے عذاب کو اس طرح دور کیا جس طرح رسول اللہ ﷺ کی موجودگی کے وقت آپ کے سبب عذاب کو ہٹایا تھا۔

پھر کفار کے دلوں کی حمیت کا ذکر فرمایا جس کا مرجع ان کی جہالت اور ظلم وزیادتی ہے اور اس حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں اپنے اولیاء کے دلوں میں جو اطمینان وسکینت نازل فرمائی ہے، اس کا ذکر فرمایا۔ اور کلمہ تقوی کو اس لئے ضروری قرار دیا ہے کہ اس سے عام طور پر وہ تمام باتیں مراد ہیں جن سے اللہ تعالی کا ڈر پیدا ہو اور سب سے اعلی وافضل کلمہ اخلاص ہے۔

پھر فرمایا کہ اللہ تعالی کی ذات پاک ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث فرمایا تاکہ اسے باقی تمام ادیان پر غالب کردے۔ پس جب دین اسلام کے اتمام کا اور تمام ادیان پر غلبہ عطا کرنے کا کفیل خود اللہ تعالی ہو گیا تو اس میں مسلمانوں کے قلوب کو قوت وفرحت حاصل ہوئی اور اس عہد پر انہیں یقین حاصل ہوا کہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ حدیبیہ کے روز جو چشم پوشی واقع ہوئی وہ دشمن کی مدد ونصرت اور اپنے رسول ودین سے اعراض تھا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالی نے اپنے رسول کو دین حق

کے ساتھ مبعوث فرمایا اور وعدہ کیا کہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کردے گا اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول کا اور ان کی پاکباز جماعت کا ذکر کیا اور ان کی بہترین تعریف فرمائی۔ جب کہ فرقہ روافض اس کے برعکس بات کہتے ہیں۔

فصل (۷۵)

غزوہ خیبر

موسیٰ بن عقبہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حدیبیہ سے لوٹ کر مدینہ تشریف لائے تو تقریباً بیس دن ٹھہرے، اس کے بعد آپ ﷺ خیبر کی طرف نکلے اور اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ ہی میں اس کا وعدہ فرمادیا تھا۔

مدینہ پر سباع بن عرفطہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ اس وقت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پہلی مرتبہ مدینہ پہنچے اور صبح کی نماز میں سباع ابن عرفطہ رضی اللہ عنہ سے پہلی رکعت میں ﴿کهيعص﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ﴾ سنی۔ نماز ہی میں کہنے لگے کہ: فلاں شخص کا ناس ہو، اس کے پاس دو پیمانے ہیں، جب کوئی چیز ناپ کر دیتا ہے تو چھوٹے پیمانے سے اور جب لیتا ہے تو بڑے پیمانے سے لیتا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر انھوں نے حضرت سباع سے ملاقات کی۔ غزوہ سے واپسی پر نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے کے بعد ان لوگوں کو مال غنیمت میں شریک فرمایا۔ (۱)

نبی کریم ﷺ نے خیبر پہنچ کر صبح کی نماز ادا فرمائی۔ اس کے بعد مسلمان سوار ہوئے تو اہل خیبر اپنے کھیتوں اور کام کاج کی جگہوں کی طرف نکلے اور انہیں مسلمانوں کی

(۱) مسند احمد: ۲/ ۳۴۵، اس کی سند قوی ہے۔

آمد کا علم تک نہ تھا بلکہ وہ اپنے کھیتوں کی طرف نکلے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ اکبر! خیبر برباد ہوگیا، اللہ اکبر! خیبر برباد ہوگیا، جب ہم کسی قوم کے علاقہ میں اترے تو ڈرائے جانے والوں کی صبح بری ہوئی۔(۱)

اس کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا جس کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے(۲) پھر مصنف نے علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے کا حال اور عامر بن الاکوع رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے۔

چنانچہ اس محاصرہ کے بعد بالآخر خیبر کے یہودی پست ہوگئے اور انہیں اس بات پر صلح کرنی پڑی کی جلا وطن ہوجائیں اور ہتھیاروں کے علاوہ جتنا مال ومتاع اپنی بار برداریوں پر لے جاسکتے ہیں لے جائیں لیکن جب جلا وطنی کا وقت آیا تو عرض کرنے لگے آپ ہمیں رہنے دیں ہم اس زمین سے خوب واقف ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی اصلاح ودرستگی اور حفاظت کرتے رہیں گے۔ خود آپ ﷺ اور صحابہ کرام کے پاس اس وقت کھیتی باڑی کے لئے آدمی نہ تھے، آپ نے یہودیوں کی درخواست منظور کرلی اور جلاوطنی عارضی طور پر ملتوی کرکے آدھی بٹائی پر انہیں زمینیں دے دیں۔

---

(۱) بخاری:۳۷۱، مسلم:۱۳۶۵

(۲) بخاری:۳۰۰۹

معاہدہ میں کوئی میعاد مقرر نہ تھی بلکہ نبی کریم ﷺ کی مرضی پر موقوف تھا جب تک چاہیں انہیں رکھیں ۔اور معاہدہ میں یہ بھی شرط رکھی کہ سونا اور چاندی رسول اللہ ﷺ کا ہوگا اور وہ اس کو چھپائیں گے نہیں اور نہ کوئی چیز آپ ﷺ سے اوجھل کریں گے۔اگر انہوں نے ایسی حرکت کی تو پھر نہ ذمہ ہے اور نہ عہد ہوگا۔لیکن انہوں نے ایک مشک جس میں مال اور حیي بن اخطب کے زیورات تھے، چھپالی وہ اسے بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت خیبر کی طرف اٹھالے گئے ۔اس کے بعد مصنف نے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔صلح کے بعد آپ نے ابن ابی الحقیق کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کرایا۔

اسی غزوہ میں صفیہ بنت حیي بنت اخطب قید ہو کر آئیں اور وہ ابن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں اور اسلام لے آئیں تھیں ۔آپ نے انہیں اپنے لئے منتخب کرلیا اور آزاد کر کے زوجیت میں لے آئے۔نقد مہر ادا نہیں کیا بلکہ آزادی کو مہر قرار دیا۔

نبی کریم ﷺ نے خیبر کی پیداوار چھتیس حصوں میں تقسیم فرمادی ۔ ہر حصہ ایک سو حصوں پر مشتمل تھا گویا کہ کل چھتیس سو حصے بن گئے ۔ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے لئے نصف یعنی اٹھارہ سو سہم تھے۔باقی نصف یعنی اٹھارہ سو حصے اس کے محافظین اور وہاں پر مسلمانوں کے امور کے لئے چھوڑ دئے گئے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک حصہ حملے سے اور ایک حصہ صلح

سے فتح ہوا۔ چنانچہ جو حصہ لڑائی سے فتح ہوا اسے اہل خمس اور غانمین میں تقسیم کر دیا گیا اور جو حصہ صلح سے فتح ہوا اسے منتظمین اور مسلمانوں کے امور اور مصالح عامہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

امام بیہقی کی یہ وضاحت امام شافعی کے مذہب کے اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ جنگ کے ذریعہ فتح کی جانے والی تمام زمینوں کو تقسیم کرنا واجب ہے، لیکن جو سیر و مغازی کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ خیبر قوت سے فتح ہوا اور رسول اللہ ﷺ بزور قوت اس علاقہ پر قابض ہوئے۔ اگر مصالحت سے فتح ہوا ہوتا تو آپ جلاوطن نہ کرتے۔ البتہ امام کو اختیار ہے کہ چاہے تو زمین تقسیم کرے یا روک رکھے۔ اگر چاہے تو کچھ تقسیم کرے اور کچھ روک رکھے۔

نبی کریم ﷺ سے تینوں طرح کے افعال ثابت ہیں، چنانچہ آپ نے بنو قریظہ و بنو نضیر کی زمین کو تقسیم کر دیا تھا، مکہ کو تقسیم نہیں کیا، اور خیبر کے ایک حصہ کو تقسیم کر دیا اور ایک حصہ کو باقی رکھا۔

اہل حدیبیہ میں سے سوائے جابر بن عبداللہ کے کوئی خیبر سے غیر حاضر نہ تھا۔ آپ نے ان کے لئے حصہ لگایا۔ اسی غزوہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آپ کے چچا زاد بھائی جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی بھی آئے۔ ان کے ہمراہ ابو موسی اشعری

اوران کے رفقاء اشعری قبیلہ کے لوگ تھے۔

اسی جنگ میں ایک یہودی عورت (۱) نے زہر ملا کر بھنی ہوئی بکری تحفہ میں پیش کی جسے آپ نے اور بعض صحابہ نے تناول کیا۔ایک روایت (۲) میں ہے کہ آپ نے اسے کوئی سزا نہیں دی اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے اس عورت کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ کھانے والوں میں بشر بن البراء کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس عورت کو قتل کروادیا۔(۳)

جب قریش کو نبی کریم ﷺ کے خیبر پر حملہ کی خبر ملی تو انہوں نے آپس میں شرط لگائی۔بعض کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ غالب ہوں گے،اور بعض کہتے تھے کہ دونوں حلیف اور خیبر کے یہودی غالب ہوں گے۔مصنف نے یہاں حجاج بن علاط السلمی جو مسلمان ہو گئے تھے،اور فتح خیبر میں شریک تھے ان کا واقعہ ذکر کیا ہے۔(۴)

غزوہ خیبر سے مستنبط احکام ومسائل:

اس غزوہ سے مندرجہ ذیل فقہی احکام ومسائل ثابت ہوئے۔

(۱) راجح یہ ہے کہ اس عورت کا نام زینب بنت الحارث تھا۔

(۲) بخاری:۳۱۶۹

(۳) ابوداود:۴۵۱۱

(۴) مصنف عبدالرزاق:۹۷۷۱

۱- حرمت والے مہینوں میں کفار سے قتل وقتال جائز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ محرم میں خیبر کی جانب روانہ ہوئے تھے۔

۲- مال غنیمت تقسیم کرنے میں سوار کو تین حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ دینا چاہیئے۔

۳- ایک فوجی کے لئے جائز ہے کہ اگر اسے کھانے کی کوئی چیز ملے تو اسے استعمال کرے اور اس میں سے خمس ادا نہ کرے، جس طرح حضرت عبداللہ بن مغفل کو چربی کی ایک بوری ملی تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں اسے اپنے لئے مخصوص کرلیا۔(۱)

۴- اگر جنگ کے خاتمہ پر کچھ لوگ میدان میں آئیں تو انہیں حصہ نہیں ملے گا جب تک تمام لشکر اجازت نہ دے دے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ سے اہل سفینہ کے متعلق مشورہ فرمایا تھا۔

۵- پالتو گدھوں کا گوشت حرام ہے کیونکہ وہ گندہ ہوتا ہے۔ یہ قول ان صحابہ کے قول پر مقدم سمجھا جائے گا، جنہوں نے یہ علت بتائی ہے کہ یہ سواری و بار برداری کا جانور

---

(۱) بخاری:۳۱۵۳، مسلم:۱۷۷۲

ہے اور اس قول پر مقدم ہے کہ اس کا خمس نہیں نکالا جائے گا اور اس پر بھی مقدم ہے کہ یہ گندگی کھاتا ہے۔

۶- امام کے لئے صلح کا معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ کہ جب چاہے اسے فسخ کر دے۔ صلح اور امان کے معاملہ کو شرائط پر معلق کرنا اور متہم لوگوں کو سزا کے بعد ثابت رکھنا، یہ امام کا اختیار ہے۔

۷- قرائن کا لحاظ کرنا جائز ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''کہ مال زیادہ تھا اور مدت تھوڑی''(۱) اور یہ کہ جس شخص کا جھوٹ ثابت ہو جائے، اس کے قول کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی۔

۸- اگر اہل ذمہ اپنے آپ پر عائد شدہ شرائط میں سے کسی کی مخالفت کر دیں تو ان کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے، نیز یہ کہ جس نے تقسیم سے قبل غنائم میں سے کچھ لے لیا وہ اس کا مالک نہ ہوگا اگر چہ وہ چیز اس کے حق سے بھی کم ہو، جیسا کہ آپ نے ایک تسمہ لینے کے متعلق فرمایا ''آگ کا ایک تسمہ''

۹- نیک فال لینا جائز ہے بلکہ مستحب ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر والوں کے ساتھ کدال کلہاڑی اور ٹوکری دیکھ کر یہ فال لیا کہ خیبر ویران ہو جائے گا۔

(۱) بخاری: ۲۳۲۸

۱۰- معاہدہ کو توڑنے والے اگر بااختیار افراد ہوں تو عورتوں اور بچوں کے حق میں بھی معاہدہ ٹوٹ جائے گا، اور اگر کسی جماعت کا ایک فرد بقیہ افراد کی موافقت کے بغیر عہد توڑ دے تو عورتوں اور بچوں کے حق میں عہد نہیں ٹوٹے گا، جیسا کہ قیدیوں میں سے اگر کسی کا خون آپ مباح قرار دیں تو یہ حکم اس کی عورتوں اور بچوں کو شامل نہ ہوگا۔

۱۱- اپنی لونڈی کو آزاد کرنا اور آزاد کرنے کے بعد اس سے نکاح کرنا اور آزادی کو حق مہر مقرر کرنا جائز ہے، اور لونڈی کی اجازت اور گواہوں اور ولی کے بغیر اسے زوجہ بنالینا جائز ہے، جس طرح نبی اکرم ﷺ نے حضرت صفیہ کے معاملہ میں کیا تھا۔

۱۲- آدمی کا اپنے یا دوسرے کے بارے میں جھوٹ بولنا جائز ہے بشرطیکہ دوسرے کو اس سے کچھ نقصان نہ ہو اور اس آدمی کا حق اسے مل جائے۔ جس طرح حجاج نے کیا تھا، اسی طرح کافر کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

۱۳- جو آدمی کسی کو زہر دے کر قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا جیسا کہ ایک یہودیہ کو حضرت بشر بن براء کے قتل کے عوض قتل کیا گیا۔

پھر نبی کریم ﷺ خیبر سے نکل کر وادی قری تشریف لے گئے۔ وہاں یہودیوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ وہاں جب یہ لوگ پہنچے تو انہوں نے تیر مارنے شروع کر دیئے، اس حملہ میں رسول اللہ ﷺ کا غلام مُدعم قتل ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ جنت

اسے مبارک ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو چادر اس نے خیبر کے روز تقسیم سے قبل لی تھی وہ اس پر آگ بن کر شعلہ زن ہوگی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ ان کی صف بندی فرمائی اور یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد ایک آدمی نکلا اس کے مقابلے میں زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نکلے اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا پھر ایک اور نکلا اسے بھی قتل کر دیا، پھر ایک اور شخص سامنے آیا جس کے مقابلے میں علی نکلے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس طرح کفار کے گیارہ آدمی یکے بعد دیگرے قتل ہوئے۔ جونہی ایک قتل ہو جاتا، دوسروں کو دعوت اسلام دی جاتی، جب نماز کا وقت آجاتا تو آپ صحابہ کے ساتھ نماز ادا فرماتے پھر واپس آکر انہیں اسلام کی دعوت دیتے اس کے بعد مقابلہ فرماتے۔ آخر شام ہوگئی۔ اور جب صبح ہوئی اور ابھی سورج ایک نیزہ بھی اونچا نہ ہوا تھا کہ آپ نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا، اور اس مقام کو بزور شمشیر فتح فرمالیا اور باشندوں کے ساتھ اہل خیبر کا سا سلوک ومعاملہ کیا۔

یہی حشر اہل فدک کا بھی ہوا۔ تیماء کے یہودیوں کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو

خائف ہو گئے اور صلح کی درخواست بھیجی، جو منظور ہوئی اور اہل خیبر کی شرطوں پر ان سے بھی معاملہ کرلیا اور وہ اپنے مال و جائیداد کے ساتھ وہیں مقیم رہے۔

یہ لوگ حضرت عمر کے دور خلافت میں بھی وہاں سے نہیں نکالے گئے کیونکہ تیماء اور وادی قری کے علاقے بلاد شام میں مانے جاتے تھے اور اس سے نچلا علاقہ مدینہ تک حجاز میں داخل ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔ واپسی پر ایک شب ایک جگہ اترے اور حضرت بلال سے فرمایا کہ ”ہمارے لئے فجر کی نماز کا خیال رکھنا“(۱) پھر مصنف نے بقیہ حدیث ذکر کی۔ ایک روایت میں ہے کہ حدیبیہ سے واپسی کی بات ہے اور لوگوں کا قول ہے کہ تبوک سے واپسی پر آپ نے یہ فرمایا تھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جو نماز کے وقت سو جائے یا بھول جائے تو اس کے لئے نماز اسی وقت میں ہے جب وہ بیدار ہو یا اسے یاد آ جائے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ سنن راتبہ کی فرائض کی طرح قضا کرنی ہوگی اور قضا نماز کی ادائیگی کے وقت اذان و اقامت بھی ہوگی اور قضا نماز کو باجماعت ادا کرسکتا ہے اور اس کو فوراً ادا کرنا چاہیئے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ”اسے چاہیئے کہ جب یاد آئے اسے ادا کرے“ اور آپ ﷺ نے

(۱) مسلم: ٦٨٠

مکان نزول سے کچھ دور جا کر ادا کی کیونکہ وہ شیطان کی جگہ تھی اور اس سے بہتر جگہ پر تشریف لے گئے۔اس کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی اس کا کوئی لحاظ نہیں کیونکہ یہ بھی نماز کے لئے ہی تھی۔اس میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ شیطان کی جگہوں پر نماز سے اجتناب کیا جائے گا جیسے حمام وغیرہ۔

جب نبی کریم ﷺ مدینہ واپس آئے،مہاجرین کو خیبر کے مال سے حصہ ملا تو انہوں نے انصار کو ان کے عطیات واپس کر دیئے جو انہوں نے ان صحابہ کو دے رکھے تھے۔

خیبر سے واپسی پر نبی کریم ﷺ شوال تک مدینہ میں رہے اور اس دوران میں آپ نے چھوٹے چھوٹے دستے روانہ فرمائے۔ان میں سے ایک دستہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا تھا جنہوں نے اپنے ساتھیوں کو آگ میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ''اگر وہ لوگ اس میں داخل ہو جاتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے۔اطاعت امیر صرف معروف میں ہے''(۱)۔اگر یہ کہا جائے کہ اگر وہ آگ میں داخل ہو جاتے تو وہ اپنے خیال میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے

(۱) بخاری:۲۶۴۰

داخل ہوتے ۔ گویا از روئے تاویل وہ خطاوار سمجھے جاتے ۔ اس لئے جہنم میں وہ دائمی طور پر کیسے رہ سکتے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آگ میں اپنے آپ کو ڈالنا معصیت ہے، اس لئے خودکشی کرنے کی پاداش میں وہ ہمیشہ اس میں رہتے ، کیونکہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت جائز نہیں اور اطاعت امیر سے آگ میں داخل ہونا اللہ اور اس کے رسول کی معصیت ہوگی ۔ اس طرح یہ اطاعت ہی سزا کا مستوجب ہوجاتی ، کیونکہ یہ حرکت خود ہی معصیت کی حیثیت رکھتی ہے، اور اگر داخل ہوجاتے تو گویا اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان ہوتے ۔ اس آدمی کے متعلق جو خودکشی کرے ایسا حکم ہے تو جو آدمی دوسرے مسلمان کو امیر کے حکم سے ناجائز ایذا دے تو اس کی کیا حالت ہوگی ۔

اور ایسے بازی گروں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو آگ میں کود جاتے ہیں اور جہلاء سمجھتے ہیں کہ یہ ابراہیم کی میراث ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ابراہیم پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی تھی ۔ اسی طرح ان پر (بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا) بن جائے گی اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ حال رحمانی میں آگ کے اندر کودے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ حال شیطانی میں داخل ہوئے ، کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ بازی گر ایک خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں اور لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اولیاء الرحمٰن میں سے ہیں جبکہ وہ اولیاء الشیطان میں سے ہیں ۔

فصل (٧٦)

فتح مکہ کا عظیم واقعہ

فتح مکہ تاریخ اسلام کا وہ عظیم واقعہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالی نے اپنے دین، اور اپنے رسول، لشکر اسلام اور حرم امین کو عزت بخشی جس سے آسمان والے مسرت سے جھوم اٹھے اور جس کی شہرت وسر بلندی، ثریا وکہکشاں سے زیادہ بلند وتابناک ثابت ہوئی اور لوگ گروہ درگروہ دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ نبی کریم ﷺ ۱۰ رمضان المبارک سنہ ۸ ہجری کو مکہ کی طرف دس ہزار مجاہدین کا لشکر لے کر روانہ ہوئے کیونکہ قریش مکہ نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معاہدہ خود ہی توڑ دیا تھا۔

جب اسلامی فوج مر الظہران نامی مقام پر پہنچی تو آپ نے رات کے وقت آگ جلانے کا حکم دیا جس سے قرب وجوار کے تمام علاقے روشن ہوگئے۔ قریش کو اب تک خبر نہ تھی۔ انہیں ڈر تو تھا مگر یہ وہم وگمان بھی نہ گزرا تھا کہ مسلمان اس تیزی سے سر پر آپہنچیں گے۔ پھر رسول اللہ ﷺ مجاہدین کے ساتھ بالائی مکہ سے شہر میں داخل ہوئے اور خالد رضی اللہ عنہ کو اس فرمان کے ساتھ مکہ کے نشیبی مقام کی طرف بھیجا کہ اگر کوئی مزاحمت ہو تو اسے بے تکلف دفع کریں، جس میں دو مسلمان شہید ہوئے اور بارہ

مشرک قتل کئے گئے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے داخلے کے بعد خانہ کعبہ کا رخ فرمایا۔ مہاجرین وانصار آپ کے اردگرد چل رہے تھے، یہاں تک کہ وہ مسجد حرام میں داخل ہو گئے اور طواف بیت اللہ فرمایا۔ آپ کے ہاتھ میں کمان تھی جس سے تین سو ساٹھ بتوں میں سے ایک ایک کو مار کر زمین پر گراتے اور فرماتے:

﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾[الاسراء:٨١]

حق آ گیا اور باطل نکل بھاگا۔ باطل ہی ہمیشہ شکست اٹھانے والا ہے۔

پھر کعبہ کے اندر جا کر نماز پڑھی۔ لوٹ کر باہر آئے۔ قریش صف بستہ کھڑے تھے۔ آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اے قریش! تمہارے خیال میں تم سے کیا سلوک کروں گا؟ سب پکار اٹھے، اچھا سلوک۔ فرمایا: ''میں اس وقت تم سے وہی کہوں گا جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: آج تم پر کچھ بھی الزام وملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو''۔

فتح مکہ سے مستنبط مسائل:

١- اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ اہل عہد اگر ان لوگوں سے جنگ کریں گے جن سے امام المسلمین کا معاہدہ ہے تو اس کی وجہ سے خود وہ امام المسلمین سے جنگ کرنے

والے تصور کیئے جائیں گے۔

چنانچہ امام کو حق ہے کہ ان پر چڑھائی کرے اور ان کو اس کی اطلاع کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں جب ان سے خیانت کا خطرہ ہو تو پھر پیشگی اطلاع دینی ضروری ہوگی اور خیانت پائی جائے تو انہیں عہد شکن سمجھا جائے گا اور یہ کہ اگر خیانت پر تمام افراد راضی ہوں تو سب کے حق میں معاہدہ ٹوٹ جائے گا جس طرح سب کے حق میں منعقد ہوا تھا۔

۲- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل عرب کے ساتھ دس سالہ جنگ بندی کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مدت کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مصلحت وضرورت کے پیش نظر جائز ہے۔

۳- اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب امام سے ناجائز یا غیر واجب باتوں کے متعلق سوال کیا جائے اور وہ خاموشی رہے تو اس کی خاموش رضامندی نہیں بن سکتی۔ جیسے ابو سفیان نے نبی کریم ﷺ سے تجدید عہد کی درخواست کی۔ آپ خاموش رہے تو آپ کی اس خاموشی سے تجدید عہد کا مطلب نہیں لیا جاسکتا۔

۴- اس سے یہ معلوم ہوا کہ کفار کے قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا حالانکہ ابوسفیان پر عہد شکنی کے باعث حد ثابت ہو چکی تھی، لیکن چونکہ وہ اپنی قوم کی جانب سے قاصد بن کر آئے تھے، اس لئے انہیں قتل نہیں کیا گیا۔

۵-مسلمان جاسوس کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

٦-عورت کو بوقت ضرورت و مصلحت عامہ کی خاطر برہنہ کرنے کی دھمکی دی جا سکتی ہے، جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ نے جاسوس عورت کے ساتھ کیا تھا۔

۷-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو اپنی خواہش کے بغیر اللہ کے لئے غصہ اور دینی حمیت کی وجہ سے بطور تاویل کافر یا منافق کہہ دے تو وہ گنہگار نہ ہوگا۔

۸-اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کبھی کبھی بڑی نیکیوں سے مٹ جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾[هود:١١٤]

نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

﴿لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى﴾[البقرة:٢٦٤]

اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔

ایک اور جگہ مزید فرمایا:

﴿أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾[الحجرات:٢]

ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو۔

پھر مصنف نے حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ اور ذوالخویصرہ کے واقعات کو ذکر کر کے فرمایا: کہ اہل عقل وخرد اس مسئلہ کی حیثیت اور اس کی ضرورت کو جانتے ہیں، اور اس کے ذریعہ اللہ تعالی کی معرفت وحکمت کے ایک عظیم باب سے واقف ہوتے ہیں۔

۹- نیز اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ میں بغیر احرام کے قتال مباح کے لئے داخل ہونا جائز ہے، لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو حج یا عمرہ کے ارادہ سے داخل ہوا سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ دوسری صورتوں میں وہی واجب ہے جسے اللہ تعالی نے اور اس کے رسول نے واجب کیا ہے، اور مکہ زور وزبردستی سے فتح کیا گیا۔

۱۰- حضور اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا تھا: ''مکہ کو اللہ تعالی نے باحرمت بنایا ہے۔ صرف لوگوں ہی نے محترم نہیں بنا رکھا ہے'' (۱) اس لئے اس کی حرمت شرعی قدیم ہے۔ اس عالم کی پیدائش سے قبل اس کی حرمت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے اس کا اظہار ہوا تھا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ: اس میں خون بہانا جائز نہیں'' یعنی خونریزی کی یہ حرمت حرم کے ساتھ خاص ہے اور دوسری جگہ جائز ہے جب کہ اس کا شرعی تقاضا موجود ہو جس

(۱) بخاری: ۴/۱۰۴، مسلم: ۴/۱۳۵۴

طرح کہ حرم کے درختوں کو کاٹنا حرام ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اس کے درخت کاٹے نہیں جائیں گے''۔ ایک روایت میں ہے کہ '' کانٹے نہ توڑے جائیں گے''۔(۱)

اس سے صاف طور پر کانٹوں اور عوسج کو کاٹنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے لیکن علماء نے خشک پودے کاٹنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ مردہ کے مشابہ ہے۔ ایک روایت میں ''لا یخبط شوکہا'' کے الفاظ آئے ہیں جن سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتے کا توڑنا حرام ہے۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''حرم کی گھاس بھی نہ کاٹی جائے گی'' اس میں کوئی اختلاف نہیں اور اس سے مراد وہی پودے ہیں جو خودرو ہوں ''خلا'' تر گھاس کو کہتے ہیں اور ''اذخر'' اس نص سے مستثنی ہے اور اس کا استثناء اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حکم اذخر کے علاوہ باقی سب پر مشتمل ہے لیکن اس میں کماۃ اور زمین میں چھپی ہوئی چیز داخل نہیں ہے، کیونکہ یہ پھل کے حکم میں ہے۔

نیز آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''حرم کے شکار کو وہاں سے بھگایا نہ جائے'' یہ اس بات کی صراحت ہے کہ شکار کا قتل اور اس کی گرفتاری کا کسی طریقہ سے بھی سبب بننا حرام

(۱) بخاری:۱۳۴۹

ہے، حتی کہ اسے اپنی جگہ سے بھگانا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ اس جگہ وہ ایک محترم حیوان ہے، اور سبقت کر کے ایک جگہ حاصل کر چکا ہے، اس لئے وہ اس جگہ کا زیادہ مستحق ہے۔ حاصل یہ کہ حرم کا جانور اگر کسی جگہ سبقت کر کے پہنچ جائے تو اسے وہاں سے پریشان کر کے بھگایا نہ جائے۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''حرم میں گری ہوئی چیز پہچان کرنے والے کے سوا کوئی نہ اٹھائے''۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''اس کی پڑی ہوئی چیز کو اٹھانا تعارف کروانے والے کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں'' اس بات کی دلیل ہے کہ حرم کا لقطہ (گری ہوئی چیز) کسی حال میں کسی کی ملکیت نہیں اور اسے صرف اس کے مالک کو یا جاننے والے ہی کو اٹھانا چاہیئے نہ کہ مالک بننے کے لئے۔ یہ امام احمد سے منقول ایک روایت ہے۔ دوسری روایت میں ان کا اور امام شافعی کا بھی یہ قول ہے کہ ملکیت کے خیال سے اس کا اٹھانا جائز نہیں البتہ اگر مالک کے لئے اس کو محفوظ کرنے کا ارادہ ہو تو جائز ہے۔ اگر اسے کوئی اٹھالے تو مالک کے ملنے تک برابر مشتہر کرتے رہنا چاہیئے۔ یہی صحیح قول ہے اور حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔ حدیث میں منشد کا جو لفظ ہے اس کے معنی ہیں مشتہر کرنے والا، اور ناشد کے معنی ہیں گمشدہ چیز کو تلاش کرنے والا۔

فتح مکہ مکرمہ کے واقعہ کے ضمن میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ بیت اللہ میں

اس وقت تک نہیں داخل ہوئے جب تک وہاں سے تصویروں کو نہ ہٹا لیا گیا۔اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ ایسے مکان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جہاں تصویریں ہوں اور یہ حمام میں نماز پڑھنے سے زیادہ مکروہ ہے، کیونکہ حمام میں نماز پڑھنے کی کراہیت نجاست کے خیال سے ہے یا اس وجہ سے ہے کہ شیطان وہاں سکونت اختیار کرتا ہے لیکن تصویروں سے شرک کا اندیشہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اکثر قوموں کے اندر تصویروں اور قبروں ہی کے ذریعہ شرک داخل ہوا ہے۔اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک یا دو مردوں کو عورت امان دے سکتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ام ہانی کی امان کو معتبر قرار دے دیا تھا (۱) اس سے ایسے مرتد کے قتل کا جواز بھی ملتا ہے جس کا ارتداد توبہ نہ کر کے شدید صورت اختیار کر گیا ہو جیسا کہ ابن ابی سرح کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔(۲)

(۱) بخاری:۳۵۷،مسلم:۷۲۰

ابوداود:۲۶۸۳

فصل (۷۷)

غزوہ حنین

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قبیلہ ہوازن نے جب نبی کریم ﷺ کی آمد اور فتح مکہ کی خبر سنی تو مالک بن عوف نے ہوازن، ثقیف اور جشم کو جمع کیا۔ان میں ان کا صاحب رائے بوڑھا درید بن صمۃ بھی تھا۔مصنف نے اس کے بعد غزوہ کی تفصیلات کا ذکر کیا ہے، پھر آگے کی بعض حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اللہ تعالی اپنے رسول ﷺ سے وعدہ پورا فرمایا کہ فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوں گے اور تمام قبائل عرب آپ کی اطاعت اختیار کریں گے۔

جب یہ فتح مبین مکمل ہوئی تو بتقاضائے حکمت الٰہی بنو ہوازن اور ان کے پیروکار اسلام لانے سے رک گئے اور ایک جم غفیر تیار کر کے رسول اللہ ﷺ سے برسر پیکار ہو گئے تاکہ اس طرح اللہ تعالی کا حکم غالب ہو اور رسول اللہ ﷺ کو عزت و غلبہ ملے اور ان سے حاصل شدہ مال غنیمت مجاہدین کے لئے بارگاہ الٰہی میں صد لائق شکر و امتنان ثابت ہو جائے۔اور اللہ تعالی رسول اللہ ﷺ اور اپنے بندوں کو ایسی عظیم الشان قوت و شوکت کے سبب غلبہ عطا فرمائے جو اب تک مسلمانوں کو حاصل نہ تھی تاکہ اس کے بعد عربوں میں کسی کو ان کے مقابلہ کی جرأت نہ پیدا ہو سکے۔

نیز اللہ تعالی کی حکمت بالغہ کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ان کی زبردست قوت وطاقت کے باوجود انہیں شکست وہزیمت کا مزہ چکھائے تاکہ فتح مکہ کے وقت بلند ہونے والے ان سروں کو جو حرم مکہ میں نبی کریم ﷺ کی طرح سر جھکا کر داخل نہیں ہوئے تھے اور جو لوگ یہ کہتے تھے کہ آج ہم قلت کے سبب مغلوب نہیں ہوں گے۔ انہیں یہ بتائے کہ مدد ونصرت صرف اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی ہے، چنانچہ جب مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے تو ان کی دلجوئی کے لئے نصرت کے فرشتے اور اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔

اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ نصرت وفتح کا لباس وہی زیب تن کرتے ہیں جو تواضع کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ☆ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ﴾[القصص:٥-٦]

اور جن لوگوں کو زمین میں کمزور کیا جاتا تھا ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں اور ان کو امام بنائیں اور ملک کے وارث بنائیں اور زمین پر انہی کو حکومت دیں اور فرعون وہامان اور ان کی فوجوں کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ لوگ ڈرتے تھے۔

عربوں کے ساتھ غزوہ کی ابتدا بدر سے ہوئی اور خاتمہ حنین سے اور ان دونوں غزوات میں فرشتوں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ دونوں میں نبی کریم ﷺ نے دشمنوں کی جانب کنکریاں پھینکیں۔ دونوں سے عربوں کا اشتعال مدھم پڑا۔ چنانچہ بدر میں ان کو خوف محسوس ہوا اور ان کی حدت ٹوٹی اور حنین میں ان کی طاقت کا خاتمہ ہوا۔

غزوہ حنین سے مستنبط چند مسائل:

۱- اس غزوہ سے یہ معلوم ہوا کہ مشرک سے ہتھیار بطور مستعار لیا جا سکتا ہے۔

۲- جنگی اسباب و ذرائع اختیار کرنا توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالی کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی ضمانت کے باوجود اسباب اختیار کرنا منافی نہیں ہے۔

۳- اسی طرح اللہ تعالی کا یہ وعدہ کرنا کہ وہ اپنے دین کو غالب کرے گا، اس کے حکم جہاد کے منافی نہیں ہے۔

۴- نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اسلحہ مستعار لیتے وقت ضمان کی شرط لگا دی تھی۔ اس کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے کہ آیا آپ نے مستعار سامان کے بارے میں ضمان کی مشروعیت کو بتایا تھا، یا بعینہ اس مستعار سامان کو واپس کرنے کی ضمانت سے متعلق خبر دی تھی۔

۵- نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دشمن کے گھوڑے اور سواری کو زخمی کرنا جائز ہے جب کہ اس سے اس کے قتل پر مدد مل سکتی ہو، اور حیوان کو اس قسم کی ایذا دہی ممنوع نہیں۔

۶- اس میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو معاف فرما دیا جس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا بلکہ اس کے سینہ پر ہاتھ پھیر کر دعا بھی دی جس سے وہ سچا مسلمان بن گیا۔

۷- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے قبل کفار کے اسلام لانے کا انتظار کرے تا کہ اسلام لانے کے بعد ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ مال غنیمت میں ملکیت تقسیم کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ محض اس پر قبضہ ہو جانے سے نہیں، لہذا اگر کوئی شخص تقسیم سے قبل انتقال کر جائے تو اس کا حصہ بجائے وارثوں کے دوسرے مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔

۸- وہ عطائے عمومی جو نبی کریم ﷺ نے قریش کو بطور تالیف قلوب کے فرمائی تھی، اس کے متعلق حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ غنیمت کے مال سے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد بقیہ چار حصوں میں سے دیا جائے گا۔ مال

غنیمت میں کسی کسی کو زائد حصہ دینے کی مصلحت چونکہ ذوالخویصرہ کی سمجھ میں نہ آسکی تھی، اس لئے اعتراض کرنے والے نے کہہ دیا (عدل وانصاف کیجئے)۔(۱)

۹-اسلام میں امام کو مسلمانوں کے نائب کی حیثیت حاصل ہے جو مسلمانوں کی مصلحت اور دین کے قیام کے لئے کوشش کرے گا، اگر اسلام کے دفاع کے لئے کسی کو مال دینا پڑے یا سرداران دشمنان اسلام کو اپنے پاس بلانا پڑے تاکہ مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں تو یہ جائز ہے، کیونکہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ بڑے فساد کو روکنے کے لئے چھوٹے فساد کو برداشت کرلیا جائے، اور بڑی مصلحت کے لئے چھوٹی مصلحت کو نظر انداز کردیا جائے۔ یہ دونوں قاعدے دین ودنیا کی مصلحتوں کی بنیاد ہیں۔

۱۰- اس غزوہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غلام بلکہ جانوروں کو بھی بعض کو بعض کے بدلے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا ہے، اور یہ کہ دو معاملہ کرنے والے اپنے درمیان غیر محدود مدت مقرر کرلیں اور دونوں راضی ہوں تو بھی جائز ہے، اس لئے کہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔

۱۱- اس غزوہ میں آپ نے فرمایا کہ ''جس نے کسی کافر کو قتل کیا ہو تو اس کا چھینا

---

(۱) بخاری: ۶۱۶۳

ہوا مال اس کا ہو گیا، بشرطیکہ اس کے پاس اس کا ثبوت ہو"۔(۱)

یہاں پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ یہ شرعی طور پر اس کا مستحق ہے یا شرط کے بعد مستحق ہو گا۔ اس کے متعلق دو قول ہیں جو امام احمد سے مروی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سامان کا مستحق ہو گا چاہے امام شرط لگائے یا نہ لگائے۔ دوسرا امام کی شرط کے بغیر مستحق نہیں ہے۔

وجہ اختلاف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بحیثیت رسول ایسا فرمایا تھا تو پھر یہ فرمان ایک عام شرعی حکم بن جائے گا، جس طرح آپ کا ارشاد کہ: "جس شخص نے کسی قوم کی زمین ان کی اجازت کے بغیر بوئی اس کا پیداوار میں کوئی حصہ نہیں، البتہ اخراجات کا وہ مستحق (۲) ہے" یا بحیثیت مفتی آپ نے فرمایا تھا، جیسے آپ نے ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عقبہ سے فرمایا کہ: "شوہر کے مال سے اتنا لے سکتی ہو جو تمہیں اور تمہاری اولاد کو کافی ہو" (۳)۔ یا بحیثیت امام آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی صورت میں آپ ﷺ کے وقت میں آپ کا فرمان امت کے لئے مصلحت میں شامل ہو گا اور بعد میں مصلحت کے اعتبار سے اس کی نگہداشت ضروری ہو گی۔

(۱) بخاری: ۲۱۰۰، مسلم: ۱۷۵۱

(۲) بخاری: ۲۴۰۳

(۳) بخاری: ۲۲۱۱، مسلم: ۱۷۱۴

یہیں سے علما کے درمیان بہت سے مقامات میں اختلاف پیدا ہوا جیسے آپ کا یہ ارشاد کہ ”جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد اور زندہ کرے وہ اس کی ملکیت ہے“۔(۱)

۱۲-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دعویٰ میں ثبوت کے لئے صرف ایک گواہ بغیر قسم کے کافی ہے، اوراس کے لئے (میں گواہی دیتا ہوں) کے الفاظ کا تلفظ بھی مشروط نہیں۔

۱۳-اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتول کافر سے چھینے ہوئے مال کا خمس نہیں نکالا جائے گا، اور یہ کہ وہ اصل غنیمت میں سے ہے اور یہ کہ اس کے مستحق حصہ پانے والے اور نہ پانے والے مثلاً عورت اور بچے سب ہیں۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجاہد جتنے کفار کو قتل کرے گا ان سب کا مال لے گا خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

(۱) بخاری:۲۳۳۵

فصل (۷۸)

غزوہ طائف

جب قبیلہ ثقیف کے لوگ شکست کھا کر بھاگے تو وہ اپنے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے، اور جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ آگے بڑھ کر ان کے قلعہ کے قریب اترے، چنانچہ اہل قلعہ نے بڑی شدت کے ساتھ تیروں کی بوچھاڑ کردی، جس کی وجہ سے بعض مسلمان زخمی ہوئے اور بارہ آدمی شہید ہوئے۔

نبی کریم ﷺ وہاں سے منتقل ہو کر اس جگہ آئے جہاں آج کل طائف کی مسجد ہے اور ان کا اٹھارہ روز محاصرہ جاری رکھا (۱) اور منجنیق کا استعمال فرمایا جو اسلام میں پہلی مرتبہ استعمال کی گئی۔ اور نبی کریم ﷺ نے قبیلہ ثقیف کے انگور کے باغات کاٹنے کا حکم فرمایا، جس میں لوگ فوراً مصروف ہوگئے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ لوگوں نے اللہ اور قرابت کا حوالہ دے کر کہا کہ آپ کاٹنے سے منع فرمادیں، تو آپ نے ان کی درخواست قبول فرمالی۔ پھر نبی کریم ﷺ کے منادی نے ندا دی کہ جو غلام قلعہ سے اتر کر ہماری طرف آجائے وہ آزاد ہے۔ یہ سن کر دس سے کچھ زائد آدمی حاضر ہوگئے جن میں ابوبکرہ بھی تھے۔ ان لوگوں کو آپ نے

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/ ۱۵۸

مسلمانوں کے حوالہ کر دیا تا کہ ان کا خیال رکھیں۔

اس بات سے اہل طائف کو سخت صدمہ ہوا، لیکن اس کے باوجود آپ کو فتح طائف کی اجازت نہ ملی، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو روانہ ہونے کا حکم فرمایا۔ بعض صحابہ کو سخت صدمہ ہوا کہنے لگے، طائف تو فتح ہوا نہیں اور ہم واپس چلے جائیں؟ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: اچھا کل جنگ کرو۔ صبح لڑائی ہوئی تو کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ہم کل ان شاء اللہ واپس جائیں گے۔ یہ سن کر لوگ خاموش ہو گئے اور واپسی کی تیاری شروع کر دی، اور آپ ﷺ کے لبوں پر تبسم تھا۔

جب سفر کا آغاز ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ دعا پڑھو" آئِبُونَ تَائِبُونَ عَابِدُونَ لِرَبِّنَا حَامِدُونَ"

ہم توبہ کرتے ہوئے لوٹے، عبادت کرتے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے۔

لوگوں نے درخواست کی کہ قبیلہ ثقیف کے لئے بد دعا کیجئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا" اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں (مطیع کر کے) ہمارے پاس حاضر کر"۔(۱)

---

(۱) بخاری: ۴۳۲۵، مسلم: ۱۷۷۸

محاصرہ طائف کے بعد نبی کریم ﷺ جعرانہ کی طرف تشریف لے گئے اور اسی مقام سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہوئے اور عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ تشریف لے گئے۔

جب رسول اللہ ﷺ ماہ رمضان میں تبوک سے مدینہ تشریف لائے تو اس مہینے قبیلہ ثقیف کا وفد بھی حاضر خدمت ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب طائف سے واپس ہوئے تو آپ کے پیچھے عروہ بن مسعود روانہ ہوئے اور آپ کے مدینہ پہنچنے سے قبل آپ سے ملاقات کی اور اسلام قبول کر کے اپنی قوم کی طرف جانے کی اجازت چاہی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (جیسا کہ تمہاری قوم سے اندیشہ ہے کہ وہ تم سے جنگ کرے گی) اور نبی کریم ﷺ نے محسوس کر لیا تھا کہ ان لوگوں میں غرور اور نخوت ہے، جس کی وجہ سے وہ قبول اسلام سے رک رہے ہیں۔ عروہ بن مسعود نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں ان کے نزدیک ان کی اپنی آنکھوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہوں، اور وہ واقعی ان میں ایسے ہی محبوب و مطاع تھے، چنانچہ اپنی قوم کو اس امید پر اسلام کی دعوت دینے کے لئے چلے کہ وہ ان کی عظمت اور مرتبہ کے باعث ان کی مخالفت نہ کرے گی، لیکن اس قدر و منزلت کے باوجود جب انہوں نے اسلام کی دعوت دی اور اظہار اسلام کیا تو ہر جانب سے تیر برسنے لگے اور ایک تیر ایسا پیوست ہوا کہ جاں بحق

ہو گئے۔حالت نزاع میں دریافت کیا کہ اپنے خون کے متعلق کیا خیال ہے؟ کہنے لگے: اللہ تعالی نے مجھے اعزاز واکرام بخشا اور شہادت سے نوازا ہے، اس لئے مجھ میں ان شہداء میں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شہید ہوئے، کچھ فرق نہیں۔اس لئے مجھے ان کے ساتھ دفن کرنا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ "ان کی مثال اپنی قوم میں اس طرح ہے کہ جیسے صاحب یس کی اپنی قوم میں تھی"۔(۱)

حضرت عروہ کی شہادت کے بعد قبیلہ ثقیف کے لوگ کئی ماہ رکے رہے، پھر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور سمجھ لیا کہ چاروں طرف سے عربوں سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ تقریباً سبھی اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔چنانچہ انہوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا کہ عروہ کی طرح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کوئی آدمی بھیجیں اور انہوں نے اس کے لئے عبد یالیل سے گفتگو کی۔اس نے ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی عروہ جیسا معاملہ نہ ہو، اور اس شرط پر قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے ساتھ مزید آدمی بھیجے جائیں۔چنانچہ انہوں نے بنی احلاف کے دو آدمی اور بنی مالک کے تین آدمی ساتھ کر دیئے۔ان میں عثمان بن ابی

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱۸۲/۴

العاص بھی تھے۔ یہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچ کر ایک نہر کے قریب اترے جہاں مغیرہ بن شعبہ ان کو دیکھ کر تیزی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلے تاکہ آپ کو قبیلہ ثقیف کے حاضر ہونے کی اطلاع کر دیں۔انہیں راستے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے۔ کہنے لگے میں تجھے اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مجھ سے پہلے حاضر نہ ہونا، میں آپ کو یہ خوشخبری سناؤں گا۔انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آخر ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبیلہ ثقیف کے وفد کی اطلاع دی، پھر مغیرہ ان کے پاس پہنچے اور ظہر کے وقت ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ان کے پہنچنے کے بعد مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا۔خالد بن سعید نبی کریم ﷺ اور قبیلہ ثقیف کے وفد کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے رہے اور آخر کار وہ مسلمان ہوگئے۔ دوران گفتگو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے چند مطالبات کئے۔

پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ان کا لات نامی بت تین سال تک رہنے دیا جائے اور اسے نہ توڑا جائے تاکہ قبیلے کے بیوقوفوں کے شر سے محفوظ رہ سکیں، لیکن نبی کریم ﷺ نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا وہ برابر اس کا اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ ایک ماہ باقی رہنے کی درخواست کی، لیکن آپ نے قطعی طور پر کوئی بھی مدت دینے سے انکار فرما دیا۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو نماز پڑھنے اور بتوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑنے سے معاف کردیا جائے۔اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رہا بتوں کا اپنے ہاتھ سے توڑنے کا معاملہ تو اس سے ہم تمہیں معاف کردیں گے،لیکن نماز کا معاملہ تو یاد رکھو،جس دین میں نماز نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی نہیں۔

جب یہ لوگ مسلمان ہوگئے تو نبی کریم ﷺ نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر فرمادیا۔یہ سب سے نوعمر تھے،لیکن دین سیکھنے کا جذبہ ان میں سب سے زیادہ تھا۔جب ان لوگوں نے اپنے علاقہ کی طرف واپسی کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کے ہمراہ ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو لات نامی بت توڑنے کے لئے بھیجا۔

جب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بت کے اوپر چڑھ کر کلہاڑی برسانا شروع کی،تو قبیلہ ثقیف کی عورتیں روتی چلاتی نکلیں،اس دوران بنی مغیث ان کی حفاظت کے لئے ارد گرد موجود تھے تاکہ عروہ رضی اللہ عنہ کی طرح ان پر تیروں کی بوچھاڑ نہ کی جائے۔جب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اسے پوری طرح منہدم کردیا تو اس سے نکلنے والی دولت کو سمیٹ لیا۔

قبیلہ ثقیف کے وفد کے آنے سے قبل عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

بعدان کے صاحبزادے ابوملیح بن عروہ اور قارب بن اسود نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے اپنے قبیلہ ثقیف سے قطع تعلق کر چکے تھے، چنانچہ اس واقعہ کے بعد آپ نے ان دونوں سے فرمایا کہ: جسے چاہو تم ولی بنالو۔ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی کو ولی نہیں بنائیں گے۔ تو آپ نے فرمایا: اور اپنے ماموں ابوسفیان بن حرب کو بھی؟ چنانچہ ان لوگوں نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔

طائف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو عروہ کے صاحبزادے نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ بتوں کے اندر سے ملنے والی دولت سے ان کے والد کا قرض ادا فرمادیں۔ آپ نے منظور فرمالیا۔ یہ سن کر قارب رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے والد کے قرضوں کی ادائیگی کی درخواست کی۔ عروہ اور اسود دونوں بھائی تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان کی یہ درخواست سن کر فرمایا کہ تمہارے والد اسود کا انتقال حالت شرک میں ہوا ہے۔ اس پر قارب نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! لیکن اس طرح ایک مسلمان رشتہ دار کے ساتھ احسان ہوگا۔ اس سے وہ اپنے کو مراد لے رہے تھے۔ وہ قرض تو مجھ پر ہے، چنانچہ آپ نے ان کا بھی قرض اس رقم سے ادا فرمادیا۔

غزوہ طائف سے مستنبط احکام ومسائل:

اس غزوہ سے مندرجہ ذیل فقہی احکام ومسائل ثابت ہوتے ہیں:

۱-حرمت والے مہینوں میں قتال کرنا جائز ہے، اوراس کی تحریم منسوخ ہوچکی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ مدینے سے مکہ کی طرف ماہ رمضان کی آخری تاریخوں میں روانہ ہوئے اور مکہ میں انیس دن قیام فرمایا۔ پھر قبیلہ ہوازن کی طرف تشریف لے گئے اوران سے قتال فرمایا، پھر طائف کے لئے روانہ ہوئے اوران کا تقریبا بیس دن محاصرہ جاری رکھا۔

ان ایام وشہور کے اعداد وشمار پر غور وفکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ محاصرہ کی کچھ مدت ماہ ذوالقعدہ میں بھی تھی۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس مدت میں صرف محاصرہ کیا گیا تھا اور قتال تو ماہ شوال میں ہوا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدا کرنا اوراس کو کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھنا دونوں میں فرق ہے۔

۲-اس غزوہ سے اس بات کا جواز نکلتا ہے کہ انسان اہل وعیال کے ساتھ جنگ میں جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ام سلمہ اور زینب رضی اللہ عنہما تھیں۔

۳-اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلہ میں ان پر پتھر برسانے کے لئے منجنیق کا

نصب و استعمال کیا جا سکتا ہے، خواہ اس سے بے قصور عورتوں اور بچوں کو بھی نقصان پہنچے۔

۴- دشمنوں کے درختوں کو بھی کاٹا جا سکتا ہے، جو ان کو نقصان پہنچائے، کمزور کرے اور انہیں غیظ و غضب میں مبتلا کرے۔

۵- نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مشرکین کے غلام بھاگ کر مسلمانوں سے ملیں تو وہ آزاد ہوں گے۔ ابن منذر نے اس پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

٦- اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام جب کسی قلعے کا محاصرہ کرے اور وہ فتح نہ ہو اور وہاں سے کوچ کرنے اور محاصرہ ختم کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو ایسا کر سکتا ہے۔

۷- اس میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عمرہ کے لئے جعرانہ سے احرام باندھا، اور طائف سے جو شخص مکہ میں بغرض عمرہ داخل ہونا چاہے اس کے لئے یہی سنت ہے۔ لیکن عمرہ کا احرام باندھنے کی نیت سے مکہ سے جعرانہ جانے کو کسی عالم نے مستحب نہیں سمجھا ہے۔

۸- اس واقعہ سے نبی اکرم ﷺ کا (رحمة للعالمين) (وبالمومنين رؤف رحيم) کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جو قوم و قبیلہ آپ سے برسر پیکار ہوئی اور آپ کے

صحابہ کی ایک جماعت کو شہید کیا اور آپ کے قاصد عروہ کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا۔ ان تمام بداعمالیوں کے باوجود آپ نے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی اور ان کی ہدایت کی تمنا فرمائی۔ یہ آپ کے کمال رحمت وشفقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

۹- اس واقعہ سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ سے کمال محبت اور ہر ممکن آپ سے تقرب والفت کی خواہش کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مغیرہ رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ ان ہی کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کو وفد طائف کی آمد کی خوشخبری سنائیں، تاکہ وہی آپ کی فرحت ومسرت کا سبب بنیں۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جائز ہے کہ کوئی اپنے دوسرے بھائی سے درخواست کرے کہ وہ اسے ایک نیکی کرنے موقع دے۔

بعض علما کا یہ قول صحیح نہیں کہ نیکیوں میں ایثار کرنا جائز نہیں، حالانکہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر کے اندر نبی کریم ﷺ کے جوار میں دفن ہونے کے معاملہ میں اپنے آپ پر ترجیح دی، اور عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر انہیں ناگواری نہیں ہوئی، بلکہ اس کی تکمیل فرمائی۔

۱۰- اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شرک اور طاغوتی اڈوں کو ایک دن بھی باقی نہ رکھا جائے، بلکہ ان کو منہدم کر دیا جائے بشرطیکہ انہیں مٹانے اور ختم کرنے کی استطاعت

ہو، کیونکہ یہ جگہیں شرک وکفر کی علامات ہیں جو تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔اس لئے استطاعت ہوتے ہوئے انہیں قائم رہنے دینا جائز نہیں ہے۔

یہی حکم ان زیارت گاہوں کا بھی ہے جنہیں قبروں پر تعمیر کیا گیا ہے،اور اللہ کو چھوڑ کران کی پرستش کی جاتی ہے،جن پتھروں کی لوگ تعظیم کرتے ہیں،تبرک حاصل کرتے ہیں،نذر ونیاز پیش کرتے ہیں،اور بوسہ دیتے ہیں،ان میں سے کسی کو قدرت کے بعد باقی رکھنا جائز نہیں۔ان میں سے اکثر تو لات وعزی اور منات کے درجہ کے ہیں، بلکہ بعض کے ساتھ اس سے زیادہ شرک وخرافات کا رواج ہے،اللہ رحم فرمائے۔آمین۔

ان مشرکوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ بت پیدا کرتے ہیں،روزی دیتے ہیں،مارتے ہیں،اور زندہ کرتے ہیں، بلکہ مشرکین بھی وہی اعمال کرتے تھے جو کہ آج کل ان کے مشرک بھائی اپنے یہاں صنم کدوں (مزارات) میں کرتے ہیں۔اس طرح آج کے لوگ بھی اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں،اور ہر ایک مرحلہ پر انہی کی اتباع کررہے ہیں۔

جہالت کے غلبہ اور علم کی کمی کے باعث اکثر لوگوں پر شرک کا غلبہ ہو چکا ہے،ان کے نزدیک نیکی بدی بن چکی ہے، اور بدی نیکی دکھائی دیتی ہے۔سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت سمجھنے لگے ہیں۔چھوٹوں کی نشو ونما اور بڑوں کا بڑھاپا اسی میں گزر رہا

ہے۔

شعائر اسلام غائب ہو چکے ہیں اور غربت اسلام نے شدت اختیار کر لی ہے۔ علماء کم ہو گئے ہیں، سفہاء کا غلبہ ہو گیا ہے اور معاملہ بگڑ چکا ہے، اس طرح بحر و بر میں فساد برپا ہو چکا ہے اور لوگ اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ امت محمدیہ میں سے ایک جماعت ضرور ہمیشہ حق پر قائم رہے گی اور ثابت قدم رہی گی اور اہل شرک و بدعت کا مقابلہ کرتی رہے گی تا آنکہ اللہ تعالی زمین اور اہل زمین کا وارث بن جائے اور قیامت آ جائے وہی بہتر وارث ہے۔

۱۱- اس غزوہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زیارت گاہوں میں جو مال خرچ ہوتا ہے، اسے امام وقت جہاد اور دوسری مصلحتوں میں خرچ کر سکتا ہے۔ ان کو فوجیوں میں تقسیم کر سکتا ہے، اور دوسرے نیک کاموں میں لگا سکتا ہے، اور ان مزارات پر جو اوقاف ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے، اور اس سلسلہ میں ائمہ اسلام میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

فصل (۷۹)

غزوہ تبوک

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اور ہجرت کا نواں سال شروع ہو گیا تو آپ ﷺ نے صدقات کی وصولی کے لئے محصلین کو بھیجا، چنانچہ عیینہ بن حصن کو بنو تمیم کے پاس، یزید بن حصین کو اسلم اور غفار کے پاس، عدی بن حاتم کو طئی اور بنو اسد کے پاس، مالک بن نویرہ کو بنو حنظلہ کے پاس، زبرقان بن بدر اور قیس بن عاصم کو بنو سعد کے پاس، علاء بن حضرمی کو بحرین کے لئے اور علی رضی اللہ عنہ کو نجران کے لئے روانہ فرمایا۔

اسی سال یعنی سنہ ۹ ہجری میں غزوہ تبوک واقع ہوا، یہ زمانہ سخت تنگی، قحط سالی کا تھا اور آئندہ موسم کا پھل لگ چکا تھا۔ نبی کریم ﷺ کا دستور تھا کہ جنگ کے موقعوں پر کبھی ظاہر نہ کرتے کہ کدھر کا قصد ہے لیکن غزوہ تبوک کے موقع پر تنگ حالی اور بعد مسافت کے باعث صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ رومیوں سے جنگ درپیش ہے۔ آپ ﷺ نے جد بن قیس سے فرمایا: ''اے جد! کیا اس سال رومیوں سے نبرد آزمائی کے لئے چلو گے؟ اس نے حیلہ سازی کی یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے آزمائش سے معاف نہ رکھیں گے؟ سب لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عورتوں سے نہایت رغبت ہے، میں ڈرتا ہوں کہ رومی عورتوں کو دیکھ کر بے اختیار نہ ہو جاؤں، آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: خیر نہ جاؤ،

اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَمِنۡهُم مَّن يَقُولُ ائۡذَن لِّي وَلَا تَفۡتِنِّيٓ﴾ [التوبة:٤٩]

ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں، مجھے رہ جانے کی اجازت دے دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے۔

منافقوں نے ہمتیں پست کرنا شروع کیں اور کہنے لگے اس گرمی میں نہ جاؤ، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَقَالُواْ لَا تَنفِرُواْ فِي الۡحَرِّ قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَّوۡ كَانُواْ يَفۡقَهُونَ﴾ التوبة:٨١]

یہ کہتے ہیں گرمی میں کوچ نہ کرو۔ اے پیغمبر! کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ سخت ہے، کاش ان میں عقل ہوتی۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مالداروں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے تعمیل کی، عثمان رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر تین سو اونٹ مع ساز و سامان کے اور ایک ہزار دینار پیش خدمت کیے۔

اسی دوران نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں کچھ لوگ باچشم تر حاضر ہوئے جن کی تعداد سات تھی اور آپ سے کچھ سواریوں کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ واپس چلے گئے۔ شدت الم کے باعث ان کی آنکھوں سے

آنسو جاری تھے کہ ان کے پاس کچھ نہیں کہ جس کے ذریعہ وہ صدقہ کر کے شریک جہاد ہوسکیں۔(۱)

اس موقع پر اشعریوں نے ابوموسی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ نبی کریم ﷺ سے سواریاں مانگیں۔آپ اس وقت ناراض تھے۔غصہ سے قسم کھا کر فرمانے لگے، واللہ میں تمہیں ہرگز سواری نہ دوں گا، اور پھر میرے پاس سواری ہے بھی نہیں، اس کے بعد ہی کچھ اونٹ آ گئے۔آپ کا غصہ فرو ہو گیا اور انہیں واپس بلا کر اونٹ مرحمت فرمائے۔ ساتھ ہی فرمایا: (میں نے تمہیں سواری نہیں دی، لیکن وہ اللہ ہے جس نے یہ اونٹ بھیج دئے ہیں۔میں جب قسم کھاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ اس کے خلاف عمل کرنا بہتر ہے تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دوں گا)۔(۲)

اسی موقع پر ایک رات علبہ بن زید نے نماز پڑھی اور رورو کر دعا کی: یارب العزت! تو نے جہاد کا حکم دیا ہے لیکن مجھے اتنا نہیں دیا کہ تیرے رسول ﷺ کا ساتھ دے سکوں، اور نہ اپنے رسول کو اتنا دیا ہے کہ مجھے ساتھ لے جاسکیں۔اے اللہ! اگر میں جہاد کے نا قابل ہوں تو میں تیری راہ میں ہر وہ تکلیف معاف کرتا ہوں جو کسی مسلمان کے

(۱) سورۃ التوبۃ: ۹۲

(۲) بخاری: ۳۱۳۳

ہاتھ سے مجھے پہنچی ہے، جان کی ہو، مال کی ہو یا آبرو کی۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آج کی رات صدقہ کرنے والا کہاں ہے؟ اس آواز پر کوئی کھڑا نہیں ہوا۔ آپ نے دوبارہ سوال فرمایا تو حضرت علبہ کھڑے ہوئے، آپ نے ان سے فرمایا ''علبہ تیری یہ دعا بطور زکاۃ مقبول لکھ لی گئی''۔(۱)

منافقین کی متعدد ٹولیوں نے عذر لنگ پیش کر کے عدم شرکت کی اجازت چاہی، لیکن بارگاہ نبوی سے انہیں اجازت نہیں دی گئی۔ عبداللہ بن ابی یہود اور منافقین کی ایک جماعت کے ہمراہ وادی ثنیۃ الوداع میں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا لشکر دو لشکروں سے کم نہ تھا لیکن روانگی کے وقت یہ پیچھے رہ گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے محمد بن مسلمہ انصاری کو مدینہ میں نائب مقرر فرمایا، اور علی بن ابی طالب کو اپنے اہل بیت پر بطور نگراں مقرر فرمایا۔ جب مسلمانوں کا لشکر روانہ ہو گیا تو ابن ابی لشکر کے پیچھے رہ گیا۔

علی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول! (ﷺ) مجھے عورتوں و بچوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ ''میرا

(۱) مجمع الزوائد ۳/۱۱۴، یہ روایت ضعیف ہے۔

تمہارا وہی تعلق ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون علیہ السلام کا تھا مگر خبردار میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا"۔(۱)

اس غزوہ میں کچھ مسلمان بھی پیچھے رہ گئے لیکن ان کے ایمان اور عزم جہاد میں شک یا تذبذب کی وجہ سے نہ تھا۔ ان میں کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع، ابوخیثمہ، اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم تھے لیکن ابوذر اور ابوخیثمہ بعد میں جا ملے تھے۔

اس غزوہ میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تیس ہزار فوج تھی، جس میں دس ہزار سوار تھے۔ آپ تبوک میں بیس دن اقامت پذیر رہے اور نماز قصر ادا کرتے رہے، اس وقت ہرقل حمص میں تھا۔ ابوخیثمہ کے جہاد میں شرکت کا واقعہ یوں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو مدینہ سے رخصت ہوئے چند دن گزرے تھے کہ ابوخیثمہ اپنے گھر گئے۔ اس وقت شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی دونوں بیویاں اپنے خیموں میں پانی چھڑک رہی ہیں، اور پانی بھی خوب ٹھنڈا کرلیا ہے اور کھانا بھی اچھا تیار کرلیا ہے، خیمہ میں داخل ہوتے ہی یہ سب چیزیں دیکھ لیں۔ پھر دل ہی میں کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ دھوپ اور گرمی اور آندھی میں رہیں اور ابوخیثمہ ٹھنڈی چھاؤں، لذیذ کھانے، اور خوبصورت عورتوں میں عیش کرے، یہ تو بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے، پھر گویا ہوئے،

(۱) بخاری:۴۴۱۶، مسلم:۲۴۰۴

اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی کے خیمہ میں داخل نہ ہوں گا اور حضور اکرم ﷺ سے جا ملوں گا، پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور روانہ ہو گئے حتی کہ تبوک میں آپ ﷺ سے جا ملے۔

راستہ میں ابوخیثمہ کی عمیر بن وہب سے ملاقات ہوئی، وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں تھے، یہ دونوں رفیق سفر ہو گئے اور جب تبوک سے قریب پہنچے تو ابوخیثمہ نے عمیر بن وہب سے کہا کہ مجھ سے پیچھے رہ جانے کی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جانے تک مجھ سے الگ نہ ہونا، ایسا نہ ہو کہ راستہ بھول جاؤں۔

جب یہ دونوں تبوک میں نبی ﷺ کی منزل کے قریب پہنچے تو لوگ کہنے لگے، دیکھنا کوئی بھٹکا ہوا سوار آ رہا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابوخیثمہ ہوں گے، عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ! اللہ کی قسم! یہ ابوخیثمہ ہی ہیں۔ سواری سے اتر کر خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سلام کیا اور سارا ماجرا سنایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے سن کر فرمایا: اچھا کیا اور ان کے لئے دعائے خیر فرمائی۔ (۱)

نبی کریم ﷺ جب ثمود کے علاقے حجر سے گزرے تو فرمایا کہ یہاں سے پانی نہ

(۱) بخاری: ۲۷۵۷

پیو، اور نہ اس سے وضو کرو، اور تم نے جو اس سے آٹا گوندھ لیا ہے وہ اونٹوں کو کھلا دو اور تم میں سے کوئی بھی اپنے رفیق کو ہمراہ لئے بغیر باہر نہ نکلے۔

لہذا بنی ساعدہ کے دو آدمیوں کے سوا تمام لوگوں نے ایسا ہی کیا، یہ دونوں تنہا نکلے۔ ایک اپنی کسی ضرورت کے باعث اور دوسرا اپنے اونٹ کی تلاش میں، جو اپنی ضرورت سے نکلا تھا، اس نے خودکشی کی کوشش کی اور جو اپنے اونٹ کی تلاش میں نکلا تھا، اسے ہوا نے اڑا کر بنی طے کے ایک پہاڑ پر ڈال دیا۔

جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا، پھر آپ نے اسے بلوایا، جس نے خودکشی کی کوشش کی تھی تو وہ بالکل شفایاب ہو گیا اور دوسرے کو قبیلہ طے نے آپ کی خدمت میں مدینہ واپس تشریف لانے کے بعد پیش کیا۔

امام زہری کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ جب مقام حجر میں پہنچے تو آپ نے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا اور سواری کو تیز کر لیا اور فرمایا کہ "ظالموں کے گھروں میں صرف روتے ہوئے داخل ہوا کرو کیونکہ ڈر ہے کہ جو عذاب انہیں لاحق ہوا، تمہیں بھی لاحق ہو جائے"۔(۱)

(۱) مسند احمد: ۲/ ۵۸، اس کی سند جید ہے۔

صحیحین میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے پانی بہادینے کا حکم فرمایا اور یہ ہدایت فرمائی کہ لوگ اس کنویں سے پانی لیں جس پر صالح علیہ السلام کی اونٹنی جاتی تھی۔(۱)

ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ صبح ہوئی تو لوگوں کے پاس پانی نہ تھا۔انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوکر شکایت کی، چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تو اللہ تعالی نے ابر بھیجا اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہوگئے اور حسب ضرورت پانی جمع بھی ہوگیا۔(۲)

پھر آپ ﷺ نے کوچ کرنے کا فرمان صادر فرمایا اور کچھ لوگ آگے بڑھے، جب کوئی شخص پیچھے رہ جاتا تو لوگ کہتے کہ فلاں شخص رہ گیا، آپ فرماتے کہ چھوڑ دو، اگر اس میں کوئی خیر ہوگا تو اللہ تعالی اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تم اس سے آرام پاگئے۔

جب ابوذر غفاری کو اونٹنی سے شکایت ہوئی تو انہوں نے سامان اتار کر اپنی پیٹھ پر لادلیا اور پیادہ پا نبی اقدس ﷺ کے نقش پا پر چل پڑے۔ نبی اکرم ﷺ ایک منزل پر اترے تھے کہ کسی شخص نے عرض خدمت کیا: یارسول اللہ کوئی آدمی راستہ پر تن تنہا چلا

(۱) بخاری:۳۳۷۸، مسلم:۲۹۸۱

مجمع الزوائد:۶/۱۹۵، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

آ رہا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ ابوذر ہوں گے۔جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو واقعی ابوذر ہی ہیں۔آپ نے فرمایا ''اللہ تعالی ابوذر پر رحم فرمائے،تنہا چلتا ہے،تنہا مرے گا اور تنہا ہی اٹھے گا''۔

صحیح ابن حبان میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو ان کی اہلیہ رونے لگیں۔وہ کہنے لگے،کیوں روتی ہو؟انہوں نے جواب دیا کہ کس طرح آنسو نہ بہاؤں جب کہ آپ ایک ویرانے میں فوت ہو رہے ہیں اور میرے پاس اتنا کپڑا بھی نہیں جو آپ کے کفن کے لئے کافی ہو سکے،اور آپ کو دفن کرنے کی میرے اندر ہمت بھی نہیں اور نہ کوئی تعاون کرنے والا ہے،تو انہوں نے جواب دیا کہ خوش ہو جاؤ اور روؤ نہیں،کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کی ایک جماعت جس میں میں بھی شامل تھا،فرماتے سنا ہے کہ'' تم میں سے ایک آدمی ویرانے میں فوت ہوگا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے جنازہ میں شریک ہوگی''۔اب ان میں سے کوئی زندہ باقی نہیں رہا اور تمام فوت ہو چکے ہیں۔اس لئے وہ تنہا فوت ہونے والا میں ہی ہوں۔اللہ کی قسم میں نے نہ غلط کہا اور نہ تکذیب کی،اس لئے راستہ کی طرف دیکھو۔ان کی اہلیہ نے عرض کیا کہ حجاج کرام جا چکے ہیں،راستے خالی ہو چکے ہیں،اب یہاں کون ہوگا،انہوں نے کہا جاؤ اور جا کر دیکھو۔اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں ٹیلے کی جانب جا کر دیکھتی

اور پھر واپس آ کر تیمارداری کرتی، میں اور وہ اس حالت میں تھے کہ کچھ لوگ سواریوں پر نظر آئے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا، وہ تیزی سے میری طرف آئے اور قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، اے اللہ کی بندی! کیا معاملہ ہے؟ میں نے جواب دیا: ایک مسلمان فوت ہو رہا ہے، کیا تم اسے کفن دو گے؟ انہوں نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے جواب دیا، رسول اللہ ﷺ کے صحابی ابوذر غفاری ہیں، کہنے لگے رسول اللہ ﷺ کے دوست اور ساتھی؟ میں نے کہا: ہاں وہی ہیں۔ انہوں نے ابوذر کے متعلق ''ان پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں'' جیسے الفاظ میں اظہار عقیدت پیش کیا پھر ان کی خدمت میں تیزی سے بڑھے۔ جب یہ لوگ ابوذر کے پاس پہنچے تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خوش ہو جاؤ (اور پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ حدیث بیان کی) اس کے بعد کہا کہ اگر میرے یا میری بیوی کے پاس کفن دینے کے لئے کوئی کپڑا ہوتا تو مجھے اس میں کفنایا جاتا۔ اس لئے میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ تم میں سے وہ شخص مجھے کفن نہ دے جو کسی جگہ کا گورنر، نمائندہ یا حاکم وغیرہ رہ چکا ہو انہوں نے غور کیا تو سب کے سب مذکورہ مناصب میں سے کسی نہ کسی منصب کو اختیار کر چکے تھے۔ صرف ایک انصاری نوجوان بوذر کے معیار پر پورا اترا۔ اس نے بڑھ کر عرض کیا، اے چچا جان! میں آپ کو اپنی چادر یا ان دو کپڑوں میں کفن دوں گا جو میری

والدہ نے کاتے اور بنے تھے۔ انہوں نے فرمایا، ہاں ”تم مجھے کفن دینا“ چنانچہ اس انصاری نوجوان نے انہیں کفن پہنایا، سب نے نماز جنازہ پڑھی پھر انہیں دفن کیا۔ یہ سب لوگ یمن کے تھے۔(۱)

صحیح مسلم میں معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہی کہ تبوک پہنچنے سے قبل رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”کل ان شاء اللہ تم لوگ تبوک کے چشمہ پر پہنچو گے لیکن تم چاشت ہونے سے قبل نہیں پہنچ سکتے۔ اگر کوئی جائے تو ہرگز اس کا پانی استعمال نہ کرے، جب تک میں نہ پہنچ جاؤں“۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا دو آدمی پہلے سے پہنچ چکے تھے اور چشمہ کا پانی ذرا ذرا سا رک رک کر بہہ رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں سے دریافت فرمایا: کیا تم نے اس میں سے کچھ استعمال کیا ہے؟ وہ کہنے لگے جی ہاں۔ آپ ﷺ ان سخت خفا ہوئے اور سخت سست کہا۔ پھر لوگوں نے چلو سے تھوڑا تھوڑا پانی جمع کیا جس سے رسول اللہ ﷺ نے اپنا چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور اس استعمال شدہ پانی کو دوبارہ اس چشمہ میں ڈال دیا۔ اچانک کثرت سے پانی کا فوارہ ابلنے لگا اور لوگوں نے خوب پانی پیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اے معاذ! وہ زمانہ قریب ہے، اگر تیری زندگی

(۱) صحیح ابن حبان: ۶۶۷۰، اور اس کی سند جید ہے۔

رہی تم خود بھی دیکھو گے کہ اس پانی سے یہاں کے درخت سیراب ہوا کریں گے اور یہ جگہ باغات سے بھر جائے گی''۔(۱)

جب نبی کریم ﷺ تبوک پہنچے تو ایلہ کا حاکم حاضر خدمت ہوا اور صلح کی درخواست پیش کی اور جزیہ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔اسی موقع پر اہل جربا اور اذرح بھی حاضر ہوئے اور جزیہ دینا منظور کرلیا۔اس وقت نبی کریم ﷺ نے ایلہ کے حاکم کو ایک تحریری فرمان جاری فرمایا جس کا مضمون یہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ تحریر اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے یُحنہ بن روبہ اور اس کی قوم اہل ایلہ کے لئے پروانہ امن ہے،اہل ایلہ کی کشتیاں اور قافلے خواہ وہ خشکی میں ہوں یا سمندر میں،اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے ذمہ میں ہیں، اور اہل شام اور اہل یمن اور اہل بحر میں سے جو لوگ بھی ان کے ساتھ ہوں گے وہ قافلے بھی ان کی امان وپناہ میں ہیں۔اگر کوئی ان کا آدمی خلاف معاہدہ کام کرے گا تو اس کا مال اس کی جان کو نہ بچا سکے گا، بلکہ وہ کسی بھی مسلمان کے لئے مباح ہوگی۔مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ خشکی یا تری میں کوئی راستہ یا جگہ کام میں آنے سے روکیں۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید کو دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر بن عبدالملک

(۱) مسلم: ۲۲۸۱

الکندی کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ اسے تم نیل گائے کا شکار کرتے دیکھو گے۔ حضرت خالد جب وہاں پہنچے جہاں سے اس کا قلعہ نظر آ رہا تھا اور چاندنی رات تھی تو وہ وہیں ٹھہر گئے۔ دیکھا کہ ایک نیل گائے آئی اور محل کے دروازے پر سینگ رگڑنے شروع کر دیئے، اس کی بیوی نے کہا کہ کیا تم نے کبھی ایسی گائے دیکھی ہے وہ بولا نہیں، پھر اکیدر اپنے مصاحبین کی ایک جماعت کے ساتھ باہر نکلا۔ اسی وقت اسے رسول اللہ ﷺ کے لشکر نے گرفتار کر لیا اور اس کے بھائی حسان کو قتل کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے اکیدر کی جان بخشی کے بعد جزیہ دینے پر صلح کر لی، وہ نصرانی تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ نے اکیدر کو قتل سے بچا لیا تھا۔ خالد کے ساتھ چار سو بیس شہسوار تھے۔ انہوں نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو بکریاں، چار سو زرہ اور چار سو نیزوں پر صلح کی تھی۔

نبی کریم ﷺ کا حصہ الگ کر کے یہ مال غنیمت تقسیم کیا گیا۔ پہلے خمس نکالا گیا پھر باقی مال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صحابی کو پانچ پانچ حصے ملے تھے۔

رسول اللہ ﷺ دس دن سے زیادہ قیام کے بعد تبوک سے واپس تشریف لائے تھے۔

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک میں ایک رات میں اٹھا تو لشکر کی ایک جانب شعلہ نظر آیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ اچانک جناب رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر

وعمر رضی اللہ عنہم نظر آئے اور دیکھا کہ عبداللہ ذوالبجادین فوت ہوگئے ہیں اور ان کے لئے قبر کھودی گئی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ قبر میں کھڑے ہیں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہم میت کو قبر میں اتار رہے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ اپنے بھائی کو میرے قریب کردو۔ ان دونوں حضرات نے انہیں قریب کردیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں اس سے راضی ہوں ،تو بھی راضی ہوجا''۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی حدیث فرماتے ہیں کہ کاش وہ صاحب قبر میں ہی ہوتا۔

ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: تبوک میں جبریل نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا: اے محمد! (ﷺ) معاویہ بن معاویہ مزنی کے جنازہ میں شرکت کیجئے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نکلے اور جبریل ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ اترے اور اپنا دایاں پیر پہاڑوں پر رکھا تو وہ پست ہوگئے، اور بایاں پیر زمین پر رکھا تو وہ پست ہوگئی، یہاں تک کہ مکہ ومدینہ کی طرف دیکھ لیا۔ پھر نبی کریم ﷺ اور جبریل علیہ السلام اور فرشتوں نے ان کی نماز پڑھی۔ فارغ ہوکر آپ ﷺ نے جبریل سے پوچھا کہ معاویہ کو یہ مرتبہ کیسے ملا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کھڑے، بیٹھے، سواری پر اور پیدل ہر حال میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ پڑھنے کی وجہ سے ایسا بلند مرتبہ ملا ہے۔ اس حدیث کو ابن السنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔(۱)

(۱) شعب الإیمان للبیہقی: ۲۵۵۳، یہ روایت نہایت ہی ضعیف ہے۔

غزوہ تبوک سے واپسی پر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بے شک مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ تم جہاں چلے اور جو وادی بھی تم نے طے کی، وہ تمہارے ہمراہ تھے‘‘۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا مدینہ میں رہتے ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! انہیں عذر نے روک رکھا تھا۔(۱)

منافقین کی ایک سازش:

جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے مدینہ واپس لوٹ رہے تھے تو راستہ میں کچھ منافقین نے آپس میں یہ سازش کی کہ آپ کو راستہ میں ایک پہاڑی سے نیچے گرادیں۔ جب قافلہ نبوی اس جگہ پہنچا تو وہ آپ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے تھے، لیکن اللہ تعالی نے ان کی اس سازش سے آپ (ﷺ) کو آگاہ فرمادیا، چنانچہ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ ’’تم میں سے جو کوئی وادی کے راستہ سے جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ کشادہ ہے‘‘ اور یہ کہہ کر آپ نے پہاڑی والا راستہ اختیار فرمایا اور دوسرے صحابہ نے نشیبی راستہ اختیار کیا، البتہ سازشی منافقین نے نقاب پہن کر آپ ﷺ کے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا۔ نبی ﷺ کے ہمراہ حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما تھے، آپ نے عمار کو اونٹنی کی نکیل پکڑنے کا حکم دیا اور حذیفہ کو پیچھے سے اونٹنی ہانکنے کے

(۱) بخاری: ۲۸۳۹

لئے فرمایا۔ یہ لوگ جا رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے ایک جماعت کے اچانک حملہ کرنے کی آواز آئی اور اتنے میں انہوں نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے غصہ میں حذیفہ کو آواز دی کہ انہیں ہٹا دیں۔ جب حذیفہ نے رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی دیکھی تو اپنا ڈنڈا لے کر مڑے اور ان کی سواریوں کی منہ پر ضربیں لگائیں اور انہیں نقاب پہنے ہوئے دیکھا تو یہ خیال کیا کہ مسافروں کی طرح ان لوگوں نے نقاب پہن لی ہے۔ حضرت کو جب انہوں نے دیکھا تو اللہ تعالی نے ان پر کافی رعب طاری کر دیا، اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی سازش کا پردہ فاش ہو گیا ہے، چنانچہ تیزی سے بھاگ کر لوگوں میں خلط ملط ہو گئے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے حذیفہ سے فرمایا کہ تم نے ان میں سے کسی کو پہچانا؟ انہوں نے جواب دیا، سواری فلاں فلاں کی تھی، چونکہ رات اندھیری تھی، اس لئے ان لوگوں کو نہ پہچان سکا، آپ نے پوچھا کہ ان کا مقصد کیا تھا؟ حذیفہ نے بتایا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے میرے ساتھ چلنے کی سازش تیار کی تھی کہ جب میں گھاٹی پر چڑھوں تو وہ مجھے نیچے گرا دیں۔ حذیفہ نے یہ سن کر کہا کہ آپ ان کی گردن کیوں نہیں مار دیتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ چرچا کریں کہ محمد (ﷺ) نے اپنے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے

۔ پھر آپ نے ان تمام منافقین کے نام ان دونوں صحابہ کو بتا دیئے اور فرمایا کہ یہ بات پوشیدہ رکھنا۔(۱)

مسجد ضرار کی تعمیر:

نبی کریم ﷺ جب غزوہ تبوک تشریف لے جا رہے تھے تو ذی اوان میں اترے، یہاں سے مدینہ ایک گھنٹہ کا راستہ ہے۔ اس وقت مسجد ضرار کے بنانے والے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ تبوک جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ ہم نے بیماروں اور بارش کی رات میں مجبوری کی وجہ سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ دو رکعت نماز پڑھ کر اسے بابرکت فرمادیں۔ اس وقت آپ نے جواب دیا تھا کہ سفر درپیش ہے، پابرکاب ہو رہا ہوں۔ عدیم الفرصت ہوں، واپس آؤں گا تو یاد دلانا، ان شاءاللہ تمہاری مسجد میں تمہاری خاطر نماز پڑھیں گے۔ لیکن واپسی میں مدینہ پہنچنے سے پہلے وحی الٰہی نے اس مسجد کی حقیقت کھول دی اور آپ نے مالک بن الدخشم اور معن بن عدی کو بلوایا اور حکم فرمایا کہ (جاؤ اور اس مسجد کو منہدم کر ڈالو اور جلا دو) چنانچہ ان حضرات نے حکم کی تعمیل کی اور مسجد والے

---

(۱) مسند احمد: ۴۵۳۵، اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

ادھر ادھر بھاگ گئے۔ اللہ تعالی نے اس موقع پر یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَاراً وَكُفْراً وَتَفْرِيْقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[التوبة:١٠٧]

اور جن لوگوں نے ایک مسجد بنائی ضرر پہنچانے کے لئے اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کے لئے مسلمانوں میں۔

مدینہ میں شاندار استقبال:

غزوہ تبوک سے رسول اللہ ﷺ مظفر و منصور واپس ہوئے تھے۔ سفر لمبا تھا، خطرے بے شمار تھے، چنانچہ جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچے اور شہر میں خوشخبری پہنچی تو لوگوں میں بے اندازہ مسرت تھی۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب کے سب استقبال کے لئے باہر نکل آئے۔ مدینے کی لڑکیوں نے ان اشعار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا شاندار استقبال کیا:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَادَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

چودھویں کا چاند ثنیات الوداع سے ہم پر طلوع ہوا۔ ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا۔ جب تک اللہ کی طرف بلانے والا بلاتا رہے۔

ان اشعار کے بارے میں بعض راویوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ان کی روایات میں ہے کہ یہ شعر اس وقت گائے گئے تھے، جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے تھے۔ حالانکہ یہ صریح غلطی ہے، کیونکہ مقام ''ثنیات الوداع'' ملک شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ سے مدینہ کے راستے پر۔

جب آپ ﷺ مدینہ سے قریب ہوئے تو فرمایا کہ ''یہ طیبہ ہے اور یہ احد کا پہاڑ ہے جو کہ ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم اسے دوست رکھتے ہیں''۔(۱)

داخل ہوتے ہی سب سے پہلے مسجد میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی جو کہ آپ کی سنت طیبہ تھی۔ پھر لوگوں سے ملنے کے لئے بیٹھ گئے۔ جو لوگ اس غزوہ میں ساتھ نہیں گئے تھے، آ کر معذرت کرنے اور قسمیں کھانے لگے۔ ان لوگوں کی تعداد اسی کے قریب تھی۔ آپ نے بظاہر عذر قبول کر لئے اور باطن کا معاملہ علاّم الغیوب کے حوالہ کر دیا۔ ان لوگوں کے متعلق یہ آیت اور اس کے بعد والی آیات نازل ہوئیں:

﴿يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ﴾(۲)

آپ کی واپسی کے بعد وہ لوگ آپ کے پاس آ کر معذرت کرتے ہیں۔

---

(۱) بخاری:۱۸۶۷، مسلم:۱۳۶۵

(۲) التوبۃ:۹۴

فصل (۸۰)

غزوہ تبوک سے مستنبط مسائل

۱-شہرالحرام میں قتال کرنا جائز ہے۔

۲-امام المسلمین کو چاہئیے کہ مسلمانوں کو وہ چیزیں بتا دے جس کے چھپانے میں ان کا نقصان ہو، اور باقی مصلحت کے لئے چھپا لے۔

۳-جب امام المسلمین تمام لوگوں کو نکلنے کا حکم دے تو سب کا نکلنا ضروری ہے، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ امام کے اذن کے بغیر پیچھے رہ جائے، اور لشکر کے نکلنے سے متعلق یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو فرداً فرداً حکم دیا جائے۔ جہاد جن تین موقعوں پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ان میں سے ایک تو یہ ہے، دوسرا جب دشمن شہر کا محاصرہ کر لے۔ تیسرا یہ کہ جب میدان جنگ میں صفیں جم جائیں۔

۴-جان کے ساتھ جہاد کرنے کی طرح مال و دولت سے بھی جہاد کرنا واجب ہے، اور یہی درست رائے ہے جس میں کچھ شبہ نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاد بالنفس کے ساتھ ساتھ ہی جہاد بالمال کا ذکر کیا گیا ہے، بلکہ ایک جگہ کے علاوہ تمام مقامات پر جہاد بالمال کا ذکر جہاد بالنفس سے پہلے ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد بالمال جہاد بالنفس کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور ضروری

ہے۔ اور جب جسمانی طور پر حج سے مجبور شخص پر مالی حج واجب ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں مالی جہاد کا واجب ہونا اولی ہے۔

۵-عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس غزوہ میں عظیم سرمایہ سے لشکر اسلام کی مدد کی اور تمام لوگوں پر سبقت حاصل کی۔

۶-غزوہ میں شرکت سے عاجز اور معذور وہ شخص ہے جو کوشش اور جد وجہد کے باوجود مال مہیا کرنے میں ناکام رہے۔ کیونکہ اللہ تعالی نے عاجز لوگوں سے حرج کی نفی اس وقت کی، جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے کہ آپ سواری کا انتظام کریں، پھر وہ روتے ہوئے واپس لوٹے۔

۷-جب امام سفر میں نکلے تو اپنا کوئی نائب مقرر کر دے تو اس کا حکم بھی مجاہدین کا ہوگا، کیونکہ دراصل مجاہدین کو اس سے تعاون مل رہا ہے۔

۸-قوم ثمود کے علاقہ کے کنوئں سے پانی پینا، کھانا پکانا، آٹا گوندھنا، اور وضو کرنا جائز نہیں، البتہ بئر ناقہ کے سوا دیگر مقامات سے چوپایوں کو پانی پلانا جائز ہے۔ بئر ناقہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں باقی تھا اور آج تک صدیاں گزرنے کے بعد بھی معلوم ومعروف ہے، سواروں کا قافلہ اس کے علاوہ کسی اور کنویں پر جاتا ہی نہیں۔

۹-جو کوئی ان علاقوں سے جہاں پر اللہ تعالی کا عذاب نازل ہوا، گزرے تو وہ اس

کے اندر داخل نہ ہو اور نہ وہاں پر قیام کرے۔ کپڑا لپیٹے ہوئے تیزی کے ساتھ اور حالت گریہ وزاری میں اور عبرت اندوز ہوتے ہوئے ایسے علاقہ سے گزر جائے۔

۱۰- حالت سفر میں نبی کریم ﷺ دو نمازیں ایک ساتھ ادا فرماتے تھے۔ معاذ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث اس واقعہ سے تعلق رکھتی ہے(۱) اس میں ایک نماز کو مقدم کرکے ایک ساتھ دو نمازوں کے پڑھنے کا ذکر ہے۔ ہم اس کا سبب ذکر کر چکے ہیں۔ مقدم کرکے جمع کا ثبوت صرف اسی سفر میں ہے، اس طرح عرفہ میں داخل ہونے سے پہلے بھی جمع تقدیم کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۱- ریت سے تیمّم کرنا جائز ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ اور تبوک کے ریگستانی علاقہ میں سفر طے کرتے تھے، اور اپنے ساتھ مٹی نہیں لے گئے تھے، اور پورے میدان میں کہیں پانی نہیں تھا۔ صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے پیاس کی شدت کی شکایت بھی کی تھی۔

۱۲- تبوک میں آپ ﷺ کا بیس دن سے زیادہ قیام رہا اور آپ نمازوں میں قصر کرتے تھے مگر امت کو یہ حکم نہیں دیا کہ جب تم میں سے کوئی اس سے زیادہ قیام کرے تو قصر نہ کرے، بلکہ آپ کی یہ اقامت (اتنی مدت) رہی اور حالت سفر کی یہ اقامت سفر

(۱) ابوداود: ۱۲۲۰

سے خارج نہیں، خواہ طویل ہو یا مختصر بشرطیکہ اس جگہ کو وطن نہ بنائے اور وہیں مقیم ہونے کا ارادہ بھی نہ رکھے۔

ابن المنذر رفرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مسافر کو اس بات کی اجازت ہے کہ جب تک وہ مدت مخصوص کے لئے اقامت کا ارادہ نہ کر لے قصر کرتا رہے، چاہے اس پر کئی سال گزر جائیں۔

۱۳- قسم کھانے والا اگر مصلحت اور بھلائی دیکھے تو اپنی قسم کا توڑنا اسے جائز بلکہ مستحب ہے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ یہ بات اس کی صوابدید پر منحصر ہے کہ خواہ قسم توڑنے سے قبل کفارہ ادا کر دے یا بعد میں، دونوں طرح ادا کر سکتا ہے۔

۱۴- حالت غصہ کی قسم معتبر سمجھی جائے گی، بشرطیکہ حالت غضب اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ قسم کھانے والا ہوش وحواس کھو چکا ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ کیا کہہ رہا ہے تو ایسی شکل میں اس کے کوئی معاملات معتبر نہ سمجھے جائیں گے، اور ایسے شخص کی نہ قسم معتبر ہوگی اور نہ طلاق وعتاق قابل اعتبار ہوگا۔

۱۵- اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ تمہاری طرف یہ تعاون سفر میں نے نہیں بھیجا بلکہ اللہ تعالی نے ارسال فرمایا ہے۔ ایسا کلام گاہے بگاہے تسکین قلب کے لئے ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں نہ کسی کو کچھ

دیتا ہوں اور نہ کسی سے کچھ روکتا ہوں، بلکہ میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے حکم ہوتا ہے وہاں رکھ دیتا ہوں''۔

کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے اور حکم کے مطابق امور میں تصرف فرماتے تھے، چنانچہ اللہ تعالی اگر آپ کو کسی امر کا حکم فرماتا، آپ اس کو نافذ کر دیتے کیونکہ اصل عطا کنندہ اور روکنے والا تو صرف اللہ ہی ہے۔

۱۶- اہل معاہدہ اور اہل ذمہ لوگ جب کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کریں جس سے اسلام کو ضرر پہنچتا ہو تو ان کے مال وجان کی حفاظت سے متعلق کیا ہوا معاہدہ فوراً ختم ہو جائے گا اور اگر امام ان کی جان و مال پر غلبہ حاصل کر سکے تو ان کی جان و مال ہر مسلمان کے لئے مباح ہے اور جو بھی اسے پکڑے گا، اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ جیسے آپ ﷺ نے اہل ایلہ کے ساتھ مصالحت میں فرمایا تھا۔

۱۷- رات کے وقت میت کو دفن کرنا جائز ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ذوالبجادین کو دفن کیا تھا، اگر کوئی ضرورت یا مخصوص مصلحت ہو تو ایسا کیا جائے گا۔

۱۸- امام المسلمین جب کوئی لشکر بھیجے اور اسے مال غنیمت یا قیدی حاصل ہوں یا کوئی قلعہ فتح ہو جائے تو خمس نکالنے کے بعد باقی سب کچھ اہل لشکر کا حق ہوگا، لیکن اگر جنگ کے دوران فوج کا ایک حصہ بطور سریہ بھیجا جائے اور فوج کی پشت پناہی کے بل پر

اوراس کی قوت سے اسے کچھ حاصل ہوتو یہ خمس اور نفل نکالنے کے بعد سارا مال غنیمت فوج کا ہوگا، صرف اہل سریہ کا نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی یہی سنت طیبہ تھی۔

۱۹- آپ نے فرمایا تھا کہ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تمہارے سفر اور ہر نقل وحرکت میں ساتھ ہوتے ہیں۔ اس سے قلبی اور ارادی معیت مراد ہے اور یہ جہاد بالقلب ہے۔ جہاد کے چار مراتب میں سے ایک یہ بھی ہے، اور بقیہ تین مراتب جہاد لسانی، جہاد مالی اور جہاد بدنی ہیں۔

۲۰- معصیت و گناہ کی جگہوں کو جلا دینا چاہیئے۔ جس طرح آنحضرت ﷺ نے مسجد ضرار کو جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح ہر ایسی جگہ کو جس کی صورت حال مسجد ضرار جیسی ہو، امام پر واجب ہے کہ اسے منہدم اور جلا کر ختم کردے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتو کم از کم اس جگہ کی شکل وصورت بگاڑ کر ایسا بنا دینا چاہیئے کہ وہاں معصیت کا کام انجام نہ پا سکے۔ جب مسجد ضرار کے متعلق یہ طرز عمل روا رکھا گیا تو مقامات شرک، شراب نوشی اور شراب سازی کے گھر، منکرات وفحاشی کے اڈوں کا حکم تو اس سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہیئے۔

عمر رضی اللہ عنہ نے ایک پورا گاؤں ہی جلا دیا تھا، جس میں شراب کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ اس طرح رویشد ثقفی کی شراب کی دوکان کو بھی نظر آتش کرادیا تھا اور اسے فاسق وبدمعاش کے نام سے موسوم کیا تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے جب اپنے مکان پر عوام

الناس سے حجاب اختیار کرلیا تو اسے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جلا دیا تھا۔

نیز نبی کریم ﷺ نے تارکین جمعہ و جماعت کے گھروں کو جلا دینے کا ارادہ کرلیا تھا، لیکن عورتوں اور بچوں کی وجہ سے رک گئے کیونکہ ان پر مسجد میں جماعت کی حاضری واجب نہیں۔

۲۱۔ مسجد قربت الٰہی کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے وقف نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اگر قبر پر مسجد بنائی جائے تو اسے ڈھا دینا چاہیئے۔ اگر مسجد میں مردہ دفن کیا جائے تو اسے وہاں سے منتقل کردینا چاہیئے، کیونکہ اسلام میں مسجد اور قبر دونوں ایک ساتھ وجود میں آئیں تو دونوں ناجائز ہیں۔ ایسا وقف نہ صحیح ہے اور نہ جائز، نہ ایسی مسجد میں نماز صحیح ہوگی، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، اور قبر کو مسجد بنانے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ یہ ہے دین اسلام کی صحیح تعلیمات، جسے اللہ کے رسول لے کر آئے تھے، لیکن آج اس دین کی اجنبیت سب کے سامنے ہے۔

فصل (۸۱)

کعب بن مالک اور ان کے رفقا کا واقعہ

غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے تین صحابیوں، کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم، جن کے ناموں کے ابتدائی حروف کا مجموعہ کلمہ ''مکہ'' بنتا ہے اور ان کے ناموں کے آخری حروف کا مجموعی کلمہ ''عکۃ'' بنتا ہے، کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک نہ ہوسکا اور غزوہ بدر میں جو لوگ شریک نہیں ہوئے، ان پر اللہ اور اس کے رسول کا کوئی عتاب نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ صرف قریش کے قافلے کے ارادے سے نکلے تھے مگر اللہ تعالی نے آپ اور آپ کے دشمنوں کو بغیر کسی وقت اور جگہ کی تعیین کئے جمع کر دیا (اس طرح ان میں جنگ واقع ہوگئی) اور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ میں شریک ہوا، جب اسلام پر ہم سب نے عہد کیا تھا، غزوہ بدر کو عقبہ پر میں ترجیح نہیں دیتا، اگر چہ غزوہ بدر لوگوں کے درمیان مشہور ہو گیا۔

جس وقت میں غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک غزوہ نہیں ہوا، اس وقت میں مالی طور پر اتنا مستحکم اور فارغ البال تھا کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی دو اونٹنیاں نہیں رہیں، مگر اس غزوہ کے وقت میرے پاس ایک

ساتھ دو اونٹنیاں تھیں۔

ادھر رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو اسے مخفی رکھ کر دوسرے رخ کا اظہار فرماتے تھے، مگر اس غزوہ میں آپ نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ یہ غزوہ آپ نے سخت گرمی میں کرنا چاہا اور ایک طویل سفر درپیش تھا۔ دشمنوں کی کثیر تعداد سے مقابلہ تھا۔ اس لئے آپ نے لوگوں کے سامنے یہ معاملہ واضح طور پر بیان فرما دیا، تاکہ اس کے لئے وہ اچھی طرح تیاری کر لیں اور آپ کو جس رخ پر چلنا تھا اسے بھی صاف صاف بتا دیا تھا۔ اور جو مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے، وہ بے شمار تھے، جن کی فہرست تیار نہیں کی جا سکتی تھی اور جس آدمی نے بھی اس جنگ سے غائب ہو جانے کا ارادہ کیا، وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس میں غیر حاضر ہو جانا ایک امر مخفی تھا۔ سوائے اس کے کہ اس سلسلے میں اللہ تعالی کی طرف سے وحی نازل ہو جائے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے اس غزوہ کا ارادہ اس وقت فرمایا، جب پھل درختوں پر خوب پک چکے تھے، اور لوگوں کو اس کے سائے میں وقت گزارنا مرغوب تھا۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ نے تیاری شروع کی اور آپ کے ساتھ لوگوں نے بھی تیاریاں شروع کر دیں اور میں روزانہ اس ارادہ سے نکلتا کہ سفر کا ضروری سامان لے لوں اور ان

کے ساتھ روانہ ہو جاؤں۔لیکن بغیر کچھ کئے واپس آ جاتا۔ پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ مجھے دقت کیا ہے، جب چاہوں گا لے لوں گا (پیسے میرے پاس ہیں، سامان بازار میں موجود ہے) میں اسی لیت ولعل میں رہا کہ کوچ کی گھڑی آ گئی اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمان روانہ ہو گئے اور میں نے ابھی تک کچھ سامان تیار نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا چلو، میں آپ کی روانگی کے ایک دو دن بعد ہی روانہ ہو جاؤں گا اور راستہ میں قافلہ سے جا ملوں گا۔ ان سب کی روانگی کے بعد بھی میں سامان تیار کرنے کے لئے نکلا لیکن پھر بھی کچھ کئے بغیر واپس آ گیا۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ مجھ پر ایسی ہی نیستی طاری رہی اور انہوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور لڑائی کا معاملہ بہت آگے نکل گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی ارادہ کیا کہ اب بھی مدینہ سے روانہ ہو کر ان کو پا لوں گا۔ کاش! میں نے ایسا ہی کیا ہوتا لیکن مجھے اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں باہر نکلتا اور لوگوں میں گھومتا تو مجھے اس بات سے بڑا رنج ہوتا کہ میں یہاں یا تو وہ لوگ دیکھتا ہوں جو نفاق کے لئے مطعون و متہم ہیں یا ان کو دیکھتا ہوں جنہیں معذور سمجھا گیا ہے اور ضعفاء میں سے ہیں۔

ادھر رسول اللہ ﷺ نے بھی مجھے اس وقت یاد نہ فرمایا جب تک تبوک نہ پہنچ

گئے وہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا: ''کعب بن مالک نے کیا کیا''؟ بنوسلمہ کے ایک شخص نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! انہیں ان دھاری والی چادروں اور خود بینی نے روک لیا'' اس پر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بولے: تم نے بری بات کہی! یارسول اللہ! اللہ کی قسم ہم نے ان سے خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھ پر حزن وملال طاری ہونے لگا اور میں جھوٹ بولنے کے بارے میں سوچنے لگا اور کہنے لگا: کل آپ کی ناراضگی سے میں کیسے بچ نکلوں؟ اور اس کے لئے میں اپنے خاندان کے ہر فرد سے مدد لینے لگا۔ اور پھر جب رسول اللہ ﷺ کے پہنچنے کی خبر دی گئی تو مجھ سے باطل خیالات کافور ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں جھوٹ کے سہارے آپ سے کبھی بچ نہیں سکوں گا تو میں نے سچ بولنے کا عزم کر لیا۔

صبح آپ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی، آپ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں دو رکعت ادا فرماتے پھر لوگوں سے ملاقاتیں کرتے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ سے پیچھے رہ جانے والے آکر آپ سے قسمیں کھا کر عذر پیش کرنے لگے اور یہ اسّی سے کچھ زائد لوگ تھے، آپ ﷺ نے ان کے ظاہر کو قبول فرما لیا اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا، میں آپ کے پاس حاضر ہوا، سلام کیا تو

آپ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی والی مسکراہٹ آگئی اور فرمایا: ادھر آؤ، میں آگے بڑھ کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا، مجھ سے دریافت کیا: کس وجہ سے تم شریک غزوہ نہیں ہوئے؟ کیا تم نے سواری خرید نہیں لی تھی؟ میں نے جواب دیا: بے شک یا رسول اللہ! اگر میں آپ کے سوا دنیا والوں میں سے کسی کے سامنے بھی بیٹھتا تو کوئی نہ کوئی عذر بیان کر کے نکل جاتا اور مجھے بات بنانے کی صلاحیت دی گئی ہے، مگر اللہ کی قسم! اگر میں جھوٹ سے آپ کو راضی بھی کرلوں تو عنقریب اللہ کی ناراضگی مجھ پر اترے گی، اور اگر میری سچ گوئی سے آپ ناراض بھی ہو جائیں تو میں اللہ کے عفو ودرگزر کا امیدوار ہوں، درحقیقت میرے پاس کوئی عذر نہیں، اور واللہ! میں اس سے پہلے کبھی اتنا مالدار اور طاقتور نہ تھا جتنا آپ سے پیچھے رہ جانے کے وقت تھا، آپ نے فرمایا: (اس نے سچ کہا ہے۔ اٹھ جاؤ جہاں تک کہ تمہارے بارے میں اللہ فیصلہ کرے)

میں اٹھ گیا اور میرے ساتھ بنوسلمہ کے کچھ لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے پیچھے پیچھے چلے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم ہوا کہ اس سے پہلے تم نے کوئی گناہ کیا ہے اور تم اس بات سے قاصر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے عذر پیش کر دیتے، جیسا کہ اور پیچھے رہنے والوں نے عذر پیش کیا تھا۔ تمہارے گناہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کا استغفار کافی ہو جاتا۔

بنوسلمہ کے یہ لوگ برابر مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ پھر اپنے آپ کو جھوٹا بنادوں ،لیکن میں نے ان لوگوں سے پوچھا: کیا میرے علاوہ بھی کوئی آدمی ان حالات سے دوچار ہوا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں دو آدمی اور تھے،جنہوں نے تمہاری طرح گفتگو کی ہے اور ان سے بھی وہی کہا گیا جو تم سے کہا گیا۔ میں نے پوچھا، وہ دو آدمی کون ہیں، انہوں نے بتایا کہ قبیلہ بنوعمرو بن عوف کے مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ واقفی ہیں۔ بہرحال، انہوں نے مجھ سے ان دو بزرگوں کا ذکر کیا جن کا عمل نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ دونوں حضرات غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کا ذکر سن کر میں خاموش ہوگیا اور اپنی راہ اختیار کی ۔رسول اللہ ﷺ نے ہم تینوں سے کلام کرنے سے منع فرمادیا تھا، چنانچہ لوگوں نے ہم سے کترانا شروع کردیا۔ سب ہمارے لئے بدل چکے تھے، یہاں تک کہ ہمارے لئے یہ سرزمین بالکل اجنبی ہوگئی اور میں خود اپنے لئے اجنبی ہوگیا۔ وہ زمین ہی نہ تھی جسے میں جانتا اور پہچانتا تھا۔

اس کیفیت وحالت میں پچاس راتیں گزر گئیں۔ رہے میرے دو ساتھی تو وہ اپنے گھروں میں بیٹھ گئے اور روتے رہے، اور میرا معاملہ یہ تھا کہ میں نسبتاً نوعمر اور جری تھا مگر مجھ سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا جس

وقت آپ ﷺ نماز کے بعد تشریف فرما ہوتے اور سلام کرتا، دل میں سوچتا اور دیکھتا کہ آیا میرے سلام کا جواب دینے کے لئے آپ نے ہونٹوں کو ہلایا یا نہیں، پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور آپ کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتا تھا جب نماز میں مصروف ہوجاتا تو آپ میری طرف نگاہ ڈالتے تھے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو اعراض فرمالیتے، یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی یہ سرد مہری میرے لئے بہت طویل ہوگئی تو میں گیا اور ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ ابوقتادہ میرے چچازاد بھائی اور سب سے زیادہ عزیز تھے، میں نے انہیں سلام کیا مگر واللہ انہوں نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا: ابوقتادہ! میں تم کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، کیا تم جانتے نہیں ہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت ہے۔ اس پر بھی وہ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ یہی بات کہی اور ان کو اللہ کا واسطہ دیا۔ وہ خاموش رہے۔ پھر اتنا جواب دیا کہ "الله ورسوله أعلم" یعنی اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔

اس پر میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ میں اسی وقت مڑا اور دیوار پھاندکر واپس چلا گیا۔ پھر میں صبح کے وقت بازار آیا، بازار میں چلا جارہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نبطی جو شامی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو مدینہ آکر گندم بیچتے تھے، میرے متعلق پوچھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کعب بن مالک کا پتہ بتانے والا کوئی ہے۔

تو لوگ میری طرف اشارہ کر کے اسے بتانے لگے، وہ میرے پاس آیا اور شاہ غسان کا ایک خط دیا جس کا مضمون یہ تھا:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ ظلم و ستم کیا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے ذلت اور ضائع ہونے کی جگہ مقدر نہیں کی ہے۔ تم ہمارے پاس آ جاؤ تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے''۔

جب میں نے یہ خط پڑھا تو سوچا کہ یہ بھی ایک مصیبت اور آزمائش ہے۔ لہذا میں ایک تنور کے پاس گیا اور خط اس میں پھینک دیا۔ بہر حال میں اسی حالت پر قائم رہا تا آنکہ جب پچاس راتوں میں سے چالیس گزر گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا قاصد میرے پاس آ رہا ہے۔ اس نے آ کر کہا: رسول اللہ ﷺ تمہیں اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لو۔ میں نے پوچھا: بیوی کو طلاق دے دوں۔ کہا: نہیں بلکہ اس سے الگ رہو، اور اس کے قریب مت جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ کے قاصد نے میرے دونوں ساتھیوں کو بھی یہی پیغام پہنچایا۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے جا کر کہا: ''تم اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ اور انہی کے پاس اس وقت تک رہو، جب تک اللہ تعالی فیصلہ نہ کر دے، جو اس معاملہ میں کرنے والا ہے''۔

کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ: ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس

حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! ہلال بالکل بوڑھے آدمی ہیں، ان کے پاس کوئی خادم بھی نہیں۔ کیا آپ ناپسند فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کر دیا کروں۔ آپ نے فرمایا: نہیں نہیں، لیکن وہ تم سے قریب نہ ہوں۔ (خدمت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں)۔ بیوی بولیں، اللہ کی قسم! جب سے ان کا یہ معاملہ ہوا ہے، برابر روتے رہتے ہیں اور آج بھی رو رہے ہیں اور مجھے تو ان کی بصارت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ کعب بن مالک کا آگے بیان ہے کہ:

پھر مجھ سے میرے بعض اہل خانہ نے کہا، رسول اللہ ﷺ سے تم بھی اپنی بیوی کے لئے اجازت حاصل کر لیتے۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے ہلال ابن امیہ کی بیوی کو ان کی خدمت کے لئے اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا: میں آپ سے اپنی بیوی کے لئے اجازت نہیں مانگوں گا۔ نہیں معلوم کہ آپ مجھ سے اس کے بارے میں کیا فرمائیں، پھر میں جوان آدمی ہوں۔ اس کے بعد ہم لوگ دس روز تک اسی حالت پر رہے اور پچاس دن مکمل ہو گئے۔ اس وقت سے جب سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ہم سے کلام کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ پھر میں نے اپنے گھر کی چھت پر پچاسویں رات کی صبح کی نماز اس حالت میں پڑھی جس کی کیفیت اللہ تعالی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

﴿ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾[التوبة:۱۱۸]

زمین باوجود وسیع ہونے کے ان پر تنگ ہوگئی تھی۔

اور میرا دم گھٹ رہا تھا کہ جبل سلع کے اوپر سے آواز لگانے والے کی بھرپور آواز سنی، وہ کہہ رہا تھا، ''یا کعب بن مالک ابشر'' کعب بن مالک! تیرے لئے خوشخبری ہے۔ یہ آواز سن کر میں سجدے میں گر گیا، کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ کشادگی آ گئی ہے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ مزید بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے جس وقت نماز پڑھی اس وقت لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہم تینوں آدمیوں کی معافی ہوگئی ہے۔

یہ خوشخبری سن کر لوگ ہمیں بشارت دینے کے لئے دوڑ پڑے، اس طرح بشارت دینے والے دوڑ کر ہمارے دونوں ساتھیوں کی طرف بھی گئے۔ ایک آدمی نے میرے پاس آنے کے لئے اپنا گھوڑا استعمال کیا اور بنو اسلم کے کا ایک آدمی دوڑتے ہوئے پہاڑ پر چڑھ گیا (اور وہاں سے آواز دی کی بخشش ہوگئی ہے)

اس لئے اس کی آواز اس کے گھوڑے سے پہلے میرے پاس پہنچ گئی۔ پھر جب وہ شخص جس کی آواز میں نے سنی تھی، بشارت دیتا ہوا میرے پاس پہنچا تو مارے خوشی کے اپنے دونوں کپڑے اتارے اور اسے پہنا دیئے۔ خدا کی قسم! اس دن ان دونوں کپڑوں کے سوا اور کوئی کپڑا میرے پاس نہ تھا۔ اس لئے میں نے خود اپنے لئے دو کپڑے مستعار

لئے اور پہن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے چل دیا۔ اس وقت لوگ مجھے معافی کی خوشخبری دے رہے تھے، کہتے تھے، اللہ کی طرف سے معافی مبارک ہو۔ بہر حال میں جا کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور آپ کے ارد گرد لوگ حاضر تھے۔ مجھے دیکھ کر طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہو گئے، سلام کیا، مبارکباد دی اور اللہ کی قسم! مہاجرین میں ان کے سوا اور کوئی بھی میرے لئے کھڑا نہیں ہوا۔ میں طلحہ کی یہ بات نہیں بھولتا۔

جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو اس وقت آپ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: "جب سے تمہاری ماں نے تمہیں جنم دیا ہے اس دن سے جتنے دن گزرے ہیں، ان میں سے سب سے بہتر دن کی خوشخبری تمہیں دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ کی جانب سے ہے یا اللہ کی جانب سے؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بشارت ہے"۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ بشارت دے رہے تھے، اس وقت آپ کا چہرہ مبارک چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا، اور ہم آپ کی یہ چیز پہچانتے تھے۔ جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اللہ سے میری توبہ اور میری معافی کے عوض میں اللہ اور اس کے رسول کے لئے صدقہ کرتے ہوئے اپنے مال و جائداد سے

چھٹکارا حاصل کرلوں۔ آپ نے فرمایا: ''اپنی جائداد اپنے لئے روک لو، تمہارے لئے یہی بہتر ہے''۔ میں نے عرض کیا: خیبر میں جو میرا حصہ ہے، اسے میں روک لیتا ہوں، یارسول اللہ! سچائی کی وجہ سے اللہ تعالی نے مجھے نجات دی۔ اللہ سے میری توبہ کا یہ اثر ہونا چاہیئے کہ جب تک میں زندہ رہوں سچ ہی بولتا رہوں۔

کعب بن مالک مزید فرماتے ہیں کہ: جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس چیز کا ذکر کیا، اس وقت سے اللہ کی قسم! کسی بھی ایسے آدمی کو جسے سچائی کی وجہ سے اللہ تعالی نے آزمائش میں ڈالا ہو، میں نے اپنے آپ سے افضل نہیں پایا۔ اللہ کی قسم! جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا، اس وقت سے آج کے دن تک ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں کیا، اور مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالی بقیہ زندگی میں بھی مجھے اس (جھوٹ) سے محفوظ رکھے گا۔

اللہ تعالی نے ہمارے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿لَقَد تَّابَ اللہ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ☆ وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لاَّ مَلْجَأَ مِنَ اللّهِ إِلاَّ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ

عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ☆ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾[التوبة:۱۱۷-۱۱۹]

بیشک اللہ نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو تھے، مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے، پھر اللہ تعالی نے ان پر مہربانی فرمائی، بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا اور مہربان ہے۔ اور تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہوگئیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ کے سوا کوئی پناہ نہیں، پھر اللہ تعالی نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

حضرت کعب بن مالک مزید فرماتے ہیں کہ: اللہ کی قسم! اللہ تعالی نے جب سے اسلام کے سیدھے راستے پر لگایا ہے ایسی نعمت سے کبھی سرفراز نہیں فرمایا جو میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولنے کی نعمت سے بڑی ہو۔ میں اس وقت بالکل جھوٹ نہیں بولا، ورنہ اسی طرح ہلاک ہوجاتا، جس طرح وہ لوگ ہلاک ہوگئے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس سلسلہ میں جو وحی نازل فرمائی تو

جھوٹ بولنے والوں کے لئے اتنے سخت الفاظ فرمائے کہ اس سے سخت الفاظ کسی کے لئے نہیں فرمائے ہیں۔ارشا فرمایا:

﴿سَيَحْلِفُونَ بِاللّهِ لَكُمْ إِذَا انقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُواْ عَنْهُمْ فَأَعْرِضُواْ عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاء بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ☆ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْاْ عَنْهُمْ فَإِن تَرْضَوْاْ عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّهَ لاَ يَرْضَى عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾[التوبة:٩٥-٩٦]

یہ سب تمہارے سامنے آ آکر اللہ کی قسمیں کھائیں گے(کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ بالکل گندے ہیں، (انہوں نے نفاق وخلاف کرکے) جو کرتوت کئے ہیں،ان کے بدلے میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے۔ یہ تمہارے سامنے اس لئے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے تو اللہ تعالی اس سرکش قوم سے راضی نہ ہوگا۔(۱)

(۱) کعب بن مالک کے واقعے کے لئے ملاحظہ ہو: بخاری:۴۴۱۸، مسلم:۲۷۶۹

فصل (۸۲)

واقعہ کعب رضی اللہ عنہ سے مستنبط احکام وفوائد

واضح رہے کہ کعب رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ حدیث سے مندرجہ ذیل احکام وفوائد کا علم ہوتا ہے:

۱۔کسی مسلمان کی غیبت کرنے والے کی تردید کرنا مستحب ہے، جیسا کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے کیا۔

۲۔سچائی کا دامن نہ چھوڑنا، اگرچہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑے، کیونکہ سچائی کا انجام بھلائی اور بہتری ہوتا ہے۔

۳۔سفر سے واپسی پر سب سے پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنا مستحب ہے۔

۴۔سفر سے لوٹ کر واپس آنے والے کے لئے بوقت ضرورت مستحب ہے کہ کسی کھلی جگہ پر یا مسجد میں لوگوں سے ملاقات کرے۔

۵۔انسان کی ظاہری حالات کی بنیاد پر احکام شریعت نافذ ہوتے ہیں اور باطنی کیفیات کا حال اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

اہل بدعت اور علانیہ طور پر گناہوں کا ارتکاب کرنے والے سے قطع تعلق کرنا اور ان سے سلام کلام بند کر دینا جائز ہے، تاکہ دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔

۷-کسی گناہ کے ارتکاب کے بعد بطور حسرت وندامت رونا مستحب بلکہ ضروری ہے۔

۸-مصلحتاً کسی ایسے کاغذ یا مکتوب کا جلا دینا جائز ہے جس میں اللہ تعالی کا نام ہو، جیسا کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔

۹-طلاق کنایہ، جیسے بیوی سے یہ کہنا کہ اپنے میکے چلی جاؤ بغیر نیت کے واقع نہیں ہوتی۔

۱۰-عورت اپنے شوہر کی خدمت کرسکتی ہے، لیکن یہ اس کے ذمہ واجب یا لازم نہیں ہے۔

۱۱-کسی نعمت کے حصول کے وقت سجدہ شکر کرنا، مستحب ہے، اسی طرح کسی مصیبت کے ٹلنے پر سجدہ شکر ادا کرنا صدقہ وخیرات کرنا بھی مستحب ہے۔

۱۲-کسی کو خوشخبری اور مبارکباد پیش کرنا، اور اس کے دینے والے کو بطور انعام کپڑا یا کچھ اور دینا مستحب ہے۔

۱۳-کسی معزز ومکرم شخص کی تکریم میں کھڑے ہوکر استقبال کرنا مستحب ہے، اور اس سے کسی کو مسرت وخوشی ہوتو یہ بھی درست ہے، جیسا کہ کعب رضی اللہ عنہ کو طلحہ رضی اللہ عنہ کے کھڑے ہونے سے ہوئی تھی۔

یہ عمل اس حدیث کے خلاف نہیں کہ ”جولوگوں کے کھڑے ہونے سے خوش ہو، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے“ (ا) کیونکہ یہ وعید متکبرین اوران لوگوں کے لئے ہے جو کھڑے نہ ہونے پر غصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت فاطمہ کو دیکھ کر مارے خوشی کے کھڑے ہوجاتے تھے اور حضرت فاطمہ آپ کو دیکھ کر احتراما کھڑی ہوجایا کرتی تھیں۔

یہی حکم ہراس شخص کے لئے قیام کا ہے جس سے اللہ تعالی کی محبت ہو اور کسی اسلامی بھائی کے لئے جیسے اللہ تعالی کی نعمت پر خوشی حاصل ہوئی ہو۔ اوراعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۴- انسان اپنی خوبیوں کی تعریف کرسکتا ہے، بشرطیکہ فخر وغرور کے لئے نہ ہو۔

۱۵- نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں فوج کے لئے کوئی دیوان ”دفتر رجسٹر“ نہ تھا یہ طریقہ سب سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے جاری فرمایا۔

۱۶- عقبہ کی حیثیت سارے واقعات سے زیادہ افضل اوراہم ہے۔

۱۷- جب کسی شخص کو اگر عبادت اور تقرب الی اللہ کا موقع نصیب ہو تو اسے پورے شوق وذوق واحتیاط سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے، کیونکہ عزم وارادہ جلد

(ا) بخاری فی الأدب المفرد: ۹۷۷، یہ حدیث صحیح ہے۔

کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس میں استقامت کم ہی میسر ہوتی ہے۔ اگر کسی کو نیکی کا موقع ملے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو بطور سزا اللہ تعالی اس کے اور اس کے قلب وارادہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾[الأنفال:٢٤]

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، جب وہ تم کو تمہاری زندگی کے لئے پکارتے ہیں اور جان لو کہ اللہ تعالی آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

اور فرمایا:

﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ﴾[الأنعام:١١٠]

ہم ان کے دلوں کو پلٹ دیتے ہیں۔

اس کی وضاحت ایک دوسری آیت میں فرمائی ہے:

﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾[الصف:٥]

پھر جب وہ ٹیڑھے ہوتے گئے تو اللہ تعالی نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

مزید فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّهُ لِيُضِلَّ قَوْماً بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُم مَّا

يَتَّقُونَ﴾[التوبة:١١٥]

اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کر دے جب تک ان کو ان امور سے اطلاع نہ دے جن سے ان کو بچنا ہو۔

اس طرح کا مضمون قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے۔

۱۸-رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر سے پیچھے وہی لوگ رہ جاتے تھے جو منافق ہوتے یا معذور اور کسی کام پر مامور ہوتے تھے۔

۱۹-امام المسلمین کو چاہئیے کہ وہ ایسے لوگوں کو آزاد ہرگز نہ رہنے دے جو اس سے (غزوات) میں پیچھے رہ جائیں، بلکہ ان سے باز پرس اور محاسبہ کرے تا کہ وہ اطاعت کریں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کعب رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا تھا ”کعب کا کیا حال ہے“ ان کے متعلق سوال ان کی اصلاح کی غرض سے تھا اور دوسرے منافقین کا ذکر نا قابل التفات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

۲۰-اللہ اور رسول کی خاطر گمان غالب اور صوابدید کی بنیاد پر کسی پر طعن وتنقید کیا جاسکتا ہے، محدثین نے اسی کی بنیاد پر راویوں کے متعلق جرح وتعدیل کی ہے، اور علماء اہل سنت نے اہل بدعت پر تنقید وتردید کی ہے۔

۲۱-مذکورہ بالا اصولوں کی بنیاد پر تنقید کرنے والے کی تردید بھی جائز ہے، جبکہ

تردید کرنے والے کو یقین ہو کہ تنقید کرنے والا غلطی پر ہے، جیسا کہ معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی مجلس میں تنقید کرنے والے کی تردید کی اور آپ نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی اور کوئی نکیر نہیں کی۔

۲۲-سفر سے واپس آنے کے لئے مسنون ہے کہ شہر میں باوضو داخل ہو اور اپنے گھر جانے سے قبل دو رکعت مسجد میں نماز ادا کرے۔

۲۳-امام وحاکم کو چاہیئے کہ وہ ایسے شخص کے سلام کا جواب تادیباً نہ دے جو اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے تاکہ دوسروں کو بھی زجروتوبیخ ہو۔

۲۴-امام وحاکم اپنے ساتھیوں وعزیزوں سے محاسبہ کرسکتا ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے تین صحابہ سے مواخذہ کیا اور ان کے علاوہ اور کسی سے ایسا معاملہ نہیں فرمایا۔احباب کے عتاب اور اس سے لطف اندوزی کے واقعات بہت ہیں پھر اس عتاب مواخذہ کے لطف اندوزی وکیف وسرور کا کیا پوچھنا جو کہ حبیب اللہ اور محبوب کائنات کی طرف سے ہو، جو کہ سراسر سبق آموز اور فائدہ مند ہو۔

تینوں صحابہ کو مختلف قسم کی مسرتیں حاصل ہوئیں رضاء الٰہی کی مسرت، شرف قبولیت کی لذت اور انعام واکرام کی خلعتوں سے جس طرح نوازا گیا، اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

۲۵- اللہ تعالی نے کعب اور ان کے دو ساتھیوں کو ان کی سچائی کی وجہ سے توفیق دی اور انہیں جھوٹے اور ناحق عذر سے بچالیا کہ ان سے تھوڑی دیر کے لئے دنیا تو سدھر جاتی ہے لیکن عاقبت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی ہے۔ سچے لوگ دنیا میں کچھ تکلیف تو ضرور اٹھاتے ہیں لیکن آخرت سنور جاتی ہے۔ دنیا و آخرت کا معاملہ اسی پر قائم ہے۔ ابتداء کار کی تلخی انتہاء میں حلاوت پیدا کرتی ہے اور ابتداء کی حلاوت سے انجام تلخ ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے چونکہ ان تمام لوگوں میں سے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے صرف ان تینوں ہی سے ممانعت کلام کا فرمان صادر کیا تھا، اس لئے یہ ان کے صدق وصفا اور باقی لوگوں کے جھوٹ کی دلیل و علامت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صادقین سے ان کی غلطی کے باعث تادیب کے لئے وقتی علیحدگی اختیار فرمائی اور جو منافقین تھے ان کے حق میں یہ علاج کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالی اپنے بندوں کے گناہوں کی سزا پر ایسا ہی کرتا ہے، چنانچہ بندہ مومن جس سے وہ محبت رکھتا ہے، ادنی و معمولی سی غلطی اور لغزش پر گرفت کرتا ہے تا کہ وہ مسلسل ہوشیار اور چوکنا رہے اور اگر کوئی بندہ اس کی نگاہوں سے گر جاتا ہے اور ذلیل ہو جاتا ہے تو پھر اسے گناہوں پر آزاد چھوڑ دیتا ہے اور جیسے جیسے وہ گناہ کرتا ہے، اس پر انعامات میں اضافہ کرتا ہے۔

۲۶-کعب نے فرمایا تھا کہ ”میں ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پھاندکر اندر گیا تھا“ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ساتھی اور پڑوس کے گھر بغیر اجازت اندر داخل ہوسکتا ہے بشرطیکہ اسے اس کی رضامندی کا علم ہو۔ جب نبی کریم ﷺ ان تینوں صحابیوں کو اپنی بیویوں سے علیحدگی کا حکم فرمایا تو ایک طرح سے کامیابی کی خوشخبری تھی۔ اس بہانے ان سے گفتگو کی گئی اور وقتی علیحدگی کا حکم دیا۔

۲۷-کعب بن مالک کے یہ الفاظ ”اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ“ اس بات کی دلیل ہیں کہ ان جیسے کنایتی الفاظ سے اس وقت تک طلاق واقع نہیں ہوتی جب تک نیت نہ کی جائے۔

۲۸-بشارت دینے والے کی بشارت پر کعب رضی اللہ عنہ کا سجدہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان صحابہ کی عادت جمیلہ تھی اور یہ سجدہ شر کے دور ہونے اور نعمت کے حصول پر بطور سجدہ شکر کے مستحب تھا۔ نبی کریم ﷺ کو جب جبریل نے یہ خوشخبری سنائی کہ جو شخص آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اس پر اللہ تعالی دس مرتبہ رحمت نازل فرمائے گا تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا تھا۔ اسی طرح امت کے حق میں شفاعت کی قبولیت پر بھی آپ نے شکرانہ کا سجدہ کیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی سجدہ شکر ادا کیا جب انہیں مسیلمہ کذاب کے قتل ہونے کی خبر ملی، اور علی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا

ذوالثدیہ خوارج کے ساتھ جنگ میں مقتولین میں سے ملا ہے تو انہوں نے بھی سجدہ شکر ادا کیا۔

۲۹- کعب بن مالک کو خوشخبری دینے والے کا گھوڑے پر سوار ہو کر جلدی پہنچنا اور دوسرے کا پہاڑی پر جلدی چڑھ کر توبہ کی قبولیت کا اعلان مسرت سنانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں اخوت ومحبت اور باہمی خیرخواہی بدرجہ اتم موجود تھی اور ایک دوسرے کی مسرتوں میں بھرپور شرکت کرتے تھے اور حقیقی خوشی محسوس کرتے تھے۔

۳۰- کعب بن مالک کا خوشخبری دینے والے کو عطیہ دینا اس بات کی دلیل ہے کہ بشارت دینے والوں کو عطیہ دینا اخلاق کریمہ کی علامت ہے نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مبشر کو تمام کپڑے دے دینا جائز ہے اور کسی دینی یا دنیوی نعمت کے حصول پر مبارکباد دینا مستحب ہے۔ اس کے استقبال میں اٹھنا اور مصافحہ کرنا بھی سنت ہے۔ مبارکباد دینے والے کو یہ الفاظ کہنا چاہیئے۔ اللہ کا عطیہ مبارک ہو، اللہ کا احسان مبارک ہو۔ اس میں نعمت کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی ہے کہ اللہ تعالی اسے مبارک بنائے۔

۳۱- انسان کا سب سے بہترین دن وہ ہے جس میں اللہ تعالی اس کی توبہ قبول

کرے۔توبہ کی قبولیت پر نبی کریم ﷺ نے جس خوشی اور اطمینان کا اظہار فرمایا اس سے امت پر آپ کے کمال شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۲-توبہ کی قبولیت پر بطور شکر حسب استطاعت صدقہ کرنا مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ’’کچھ مال اپنے لئے روک لو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا‘‘ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی اپنے تمام مال کے صدقہ کر دینے کی نذر مان لے، اس پر تمام مال خرچ کرنا واجب نہیں، بلکہ اس کے لئے کچھ حصہ رکھ لینا جائز ہے۔ اسی طرح اس سے سچائی کی عظمت اور اس پر دونوں جہاں کی سعادت کے دارومدار کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالی نے انسانوں کو صرف دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک سعداء، یعنی مومن اور سچے لوگ، اور دوسرے اشقیاء یعنی جھوٹے لوگ اور یہ تقسیم ہر طرح جامع و کامل ہے۔

۳۳-آیت کریمہ ﴿لَقَد تَّابَ اللہ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالأَنصَار﴾ سے بندہ توبہ کے مرتبہ کو سمجھ سکتا ہے اور یہ توبہ بندہ مومن کا منتہائے کمال ہے، اور اللہ تعالی یہ اعلی درجہ غزوات میں قربانیوں کے بعد عطا فرماتا ہے، جب مسلمان اپنی جان و مال اور وطن کو اللہ تعالی کی رضا کی خاطر خیر باد کہہ دیتا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا عظیم مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالی ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے اور ان کی توبہ وانابت کو قبول فرمائے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے توبہ کی قبولیت

والے دن کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ”آج کا دن تمہارے لئے سب سے زیادہ خوشی کا دن ہے، جب سے تم پیدا ہوئے“۔اس حقیقت کو صحیح طور پر وہی آدمی سمجھ سکتا ہے جو اللہ تعالی کی ذات، بندوں پر اس کے حقوق، عبودیت کے استحقاق اور خود اپنی ذات اور اپنے حالات کو سمجھے اور یہ محسوس کرے کہ اس کی بندگی اللہ تعالی کے حقوق کے مقابلہ میں قطرہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو سمندر بیکراں میں ڈالا جائے گا، بشرطیکہ ریا اور دیگر آفتوں سے پاک وصاف ہو۔

پاک ہے وہ ذات جس کے عفو درگزر کے علاوہ بندوں کو کوئی سہارا نہیں۔اس نے ابتدا میں ان کو توفیق دی اور توبہ قبول فرمائی اور جب انہوں نے توبہ کی تو دوبارہ قبولیت توبہ کی خبر دی۔اس ذات نے انہیں توفیق بخشی اور پھر توبہ قبول کر کے ان فضل فرمایا۔

اسی لئے تمام خیر اور ہر طرح کی بھلائیاں اس کی جانب سے ہیں اس کی توفیق سے ہیں اور اسی کے لئے ہیں۔اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، جس پر چاہتا ہے فضل وکرم فرماتا ہے، اور جسے چاہتا ہے حکمت وعدل کے باعث محروم کر دیتا ہے۔

فصل (۸۳)

غزوہ تبوک سے واپسی پرابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج

غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد سنہ ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے تین سو مسلمانوں کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر حج بیت اللہ کے لئے روانہ فرمایا، اور آپ نے بیس اونٹ قربانی کے لئے بھیجے اور اپنے دست مبارک سے ان کو قلادے پہنائے اور علامتیں ڈالیں۔ یہ اونٹ ناجیہ بن جندب اسلمی کے زیرنگرانی تھے جس میں پانچ عدد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔

ابن اسحاق کا قول ہے کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ ابھی راستہ میں تھے کہ مشرکین اور رسول اللہ کے درمیان معاہدہ ختم کرنے کے لئے سورہ براءت نازل ہوئی، چنانچہ علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے اور قافلہ حج سے جا ملے۔

جب ابوبکر نے علی کو دیکھا تو دریافت فرمایا: امیر بن کر آئے ہو یا مامور؟ انہوں نے جواب دیا امیر نہیں بلکہ مامور بن کر آیا ہوں اور مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس لئے بھیجا ہے کہ میں اہل مکہ کے سامنے سورہ براءت پڑھ کر ان کے ساتھ سارے معاہدوں کے خاتمہ کا اعلان کردوں۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کرانا شروع کیا اور جب دسویں ذی الحجہ کا دن آیا تو علی کھڑے ہوئے اور جمرہ اولی کے پاس ان ساری باتوں کا

اعلان کر دیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہنے کا حکم دیا تھا۔اس روایت کو حمیدی نے زید بن نفیع کے واسطے سے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حج کے موقع پر آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا گیا تھا؟ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، میں جو پیغام لے کر گیا تھا وہ چار باتوں پر مشتمل تھا:

۱- برہنہ ہو کر کوئی طواف نہ کرے

۲- جنت میں صرف مومن داخل ہوں گے۔

۳- اس سال کے بعد مسجد حرام میں مسلمان اور کافر جمع نہ ہوں گے۔

۴- جس کا نبی کریم ﷺ سے کوئی معاہدہ ہے وہ اس مدت تک باقی رہے گا۔(۱)

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک سے فارغ ہوئے اور مکہ فتح ہو گیا اور قبیلہ ثقیف کے لوگ مسلمان ہو گئے تو مختلف اطراف سے آپ کے پاس وفود عرب آنا شروع ہو گئے تاکہ مشرف با اسلام ہوں اور امان حاصل کریں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

وفد بنی تمیم ،وفد طئی ، وفد بنی عامر،وفد عبدقیس، وفد بنی حنیفہ، وفد کندہ، وفد اشعریین ،وفد ازد،وفد اہل نجران ،وفد ہمدان ،وفد نصاری نجران۔اور ان کے علاوہ دوسرے وفود بھی حاضر ہوئے تھے۔(۲)

---

(۱) ترمذی:۳۰۹۱،یہ حدیث جید ہے۔

(۲) سیرت ابن ہشام:۴/۲۰۵

فصل (۸۴)

آپ ﷺ کا طریقہ جسمانی علاج میں

ہم نے گزشتہ صفحات میں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور سنت حسنہ کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے، اب ہم طب نبوی کے متعلق چند چیزوں کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ نے کیا کہا اور کیا طریقے اختیار فرمائے ہیں اور کس مرض کا کیا علاج تجویز فرمایا ہے، ہم اس میں اس حکمت کا تذکرہ کریں گے کہ جس تک پہنچنے میں اطباء عاجز ہو چکے ہیں کیونکہ اطباء کے مقابلہ میں طب نبوی معجزات پر مشتمل ہے۔

چنانچہ ہم اللہ تعالی سے استعانت کرتے ہوئے یہاں صرف ان مفردات ومرکبات روحانی اور قدرتی دواؤں کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے طریقہ علاج کا ذکر کریں گے جو کہ آپ سے مروی اور ثابت ہے۔

نظر بد کا علاج:

صحیح مسلم میں ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نظر حق ہے، اگر کوئی چیز قضا وقدر سے بھی بڑھ جاتی تو وہ نظر ہی ہوسکتی تھی'' (۱) نیز صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: نبی اکرم ﷺ نے نظر بد،

---

(۱) مسلم: ۲۱۸۸

بخار، اور پھوڑے پھنسی کے امراض میں جھاڑ پھونک کی اجازت دی ہے"۔(۱)

امام مالک نے ابن شہاب سے، انہوں نے ابوامامہ بن سہل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو غسل کرتے دیکھا تو کہا کہ: اللہ کی قسم! میں نے آج تک ایسا بانکا شخص نہیں دیکھا اور نہ ایسی خوبصورت جلد دیکھی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس پر سہل رضی اللہ عنہ کو نظر لگ گئی اور زمین پر گر گئے۔ نبی کریم ﷺ یہ سن کر عامر کے پاس آئے اور فرمایا کہ تم میں کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے؟ تم نے برکت کی دعا کیوں نہیں کی؟ اب ان کے لئے غسل کرو۔ یہ سن کر عامر نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھ، دونوں کہنیاں، دونوں گھٹنے، پیروں کی انگلیاں اور مستورہ جسم ایک برتن میں دھوئے پھر اسے سہل پر بہا دیا تو وہ اچھے ہو کر لوگوں کے ساتھ چلے گئے۔(۲)

عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے ابن طاوس سے انہوں نے اپنے والد سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ "نظر کا لگنا برحق ہے اور جب تم میں سے کسی سے غسل کرنا طلب

(۱) مسلم: ۲۱۹۶

(۲) ابوداود: ۳۸۸۰، اس کی سند جید ہے۔

کیا جائے تو اسے غسل کر لینا چاہیئے‘‘۔(۱)

اس حدیث کا موصول ہونا صحیح ہے۔امام ترمذی فرماتے ہیں کہ نظر لگانے والے کو حکم دیا جائے کہ ایک برتن میں وہ اپنا ہاتھ ڈالے ، پھر اس میں کلی کرے ، چہرہ دھوئے ، پھر بایاں ہاتھ دھوئے ، پھر اپنے دائیں گھٹنے پر پانی ڈالے ، پھر دایاں ہاتھ برتن میں ڈالے اور بائیں گھٹنے پر سے پانی انڈیلے ، پھر جسم کا باقی حصہ دھوئے اور برتن زمین پر نہ رکھا جائے۔اب یہ پانی یکبارگی نظر لگنے والے کے اوپر پیچھے سے ڈال دیا جائے۔

نظر بد کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

ایک انسانی ، دوسری جناتی ۔ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ: ’’نبی کریم ﷺ نے اپنے گھر میں ایک باندی دیکھی ، جس کے چہرے پر پھوڑے پھنسیاں تھیں آپ نے فرمایا کہ اس کی جھاڑ پھونک کراؤ کیونکہ اسے نظر لگ گئی ہے‘‘ (۲)امام بغوی فرماتے ہیں کہ حدیث میں ’’سعفہ‘‘ سے مراد جناتی نظر ہے،اور جناتی نظر نیزوں کی نوک سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ جنوں اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگتے تھے،ایک گروہ نے عقل

(۱)مسلم:۲۱۸۸،۵۷۳۹-۵۷۳۹و مسلم:۲۱۹۷

(۲)بخاری:

وفہم کی کمی کے باعث نظر بد کا انکار کیا ہے۔حالانکہ مختلف مذاہب کے عقلاء اور فلاسفہ نہ تو نظر بد کا انکار کرتے ہیں اور نہ اسے محض اوہام وخرافات سمجھتے ہیں۔ہاں اس کے اسباب اور تاثیرات کے سلسلہ میں خیالات مختلف ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالی نے انسانی جسموں اور روحوں میں مختلف قوتوں اور طبیعتوں کو پیدا فرمایا ہے، اوران میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات وکیفیات رکھی ہیں۔اس لئے کوئی بھی عقلمند اور صاحب بصیرت جسموں میں ان روحوں کی تاثیر کا انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ چیز محسوس اور مشاہد ہے۔

آنکھ کی خود کوئی تاثیر نہیں بلکہ تاثیر روح کی ہوتی ہے اور روحیں اپنی طبیعت، کیفیت، قوت، خاصیت میں مختلف تاثیروں کی ہوتی ہیں، اور آنکھ سے چونکہ روح کا ایک خاص قسم کا زائد تعلق ہوتا ہے، اس لئے اس فعل کو اس کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔

چنانچہ حاسد کی روح محسود پر مبین طور پر ضرر رساں ہوتی ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو حکم فرمایا کہ اس کے شر سے پناہ مانگیں۔محسود کے ضرر پہنچنے کے سلسلہ میں حاسد کی نگاہوں کی تاثیر کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو انسانیت کی حقیقت اور اس کی صفات وتاثیرات کی معرفت سے بالکل کورے اور ناواقف ہوتے ہیں۔

محسوسات میں سانپ کے ذریعہ اس کی مثال دی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کے اندر زہر چھپا رہتا ہے۔ جب اپنے دشمنوں کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک غضبی قوت بیدار ہوتی ہے اور نفس پر ایک خبیث اور موذی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس میں بعض کیفیات اتنی شدید اور قوی ہوتی ہیں کہ حمل کو گرا دیتی ہیں اور بعض سے آنکھ کی بینائی زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض زہریلے چھوٹے سانپوں کے بارے میں فرمایا کہ (نگاہ کو ڈھونڈتے ہیں اور اسقاط حمل کرا دیتے ہیں)۔(۱)

اس طرح تاثیر اتصال بدن پر موقوف نہیں، جیسا کہ بعض کم علم اور طبیعت وشریعت سے ناواقف لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ تاثیر کبھی اتصال بدن سے ہوتی ہے اور کبھی سامنا ہونے سے، کبھی محض دیکھ لینے سے اور کبھی صرف روحانی توجہ سے اور کبھی دعاؤں اور تعویذ گنڈوں سے اور کبھی محض وہم وتخیل سے بھی اثر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح نظر بد لگانے والے شخص کی نگاہوں کی وجہ سے صرف نظر بد لگنا موقوف نہیں، بلکہ بسا اوقات نابینا شخص کے سامنے کسی چیز کی تعریف وتوصیف کی جائے، تو وہ اسے دیکھے بغیر متاثر کر دیتا ہے۔ اور بہت سے لوگ کسی چیز کا خاکہ سن کر ہی اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہر نظر لگانے والا حاسد ہوتا ہے، اور ہر حاسد نظر لگانے والا نہیں

(۱) بخاری:۳۲۹۷، مسلم:۲۲۳۳

ہوتا، اور چونکہ حسد عام ہے اس لئے نظر کے مقابلہ میں اس سے پناہ مانگنے کا حکم زیادہ عام ہے۔ یہ تاثیر اصل میں تیر ہوتے ہیں جو حاسد اور نظر لگانے والے کے مزاج وطبیعت سے نکلتے اور خارج ہوتے ہیں اور محسوس کی طرف جاتے ہیں۔ کبھی تو یہ تیر نشانے پر لگ جاتے ہیں اور کبھی خطا ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان کا جسم انہیں کسی بچاؤ کے بغیر کھلا مل جاتا ہے تو یہ اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر محتاط و مسلح ہوتا ہے تو اثر نہیں کر پاتے۔ یہ تیر کبھی کبھی خود اس شخص کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں، جہاں سے چلے تھے، جیسا کہ ہم تیر اندازی میں محسوس ومشاہدہ کرتے ہیں۔

کبھی کبھی انسان کو خود اپنی نظر لگ جاتی ہے، اور کبھی وہ بغیر ارادہ بھی نظر لگا دیتا ہے، اس میں صرف طبیعت ومزاج کا دخل ہوتا ہے اور یہ سب سے بدتر صورت ہے۔

نظر بد کا علاج:

سنن ابوداود میں سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سیلابی علاقے سے گزرے، میں نے اس میں داخل ہو کر غسل کیا، لیکن باہر آتے آتے مجھے بخار آ گیا۔ نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا: ابوثابت سے کہو کہ وہ اعوذ باللہ پڑھیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، اے میرے آقا! کیا دم کرانا اچھی بات

ہے۔آپ نے فرمایا کہ (جھاڑ پھونک صرف نظر، بخار اور ڈنک لگنے میں ہوتا ہے)(۱)

تعوذ اور دم کی صورت یہ ہے کہ آدمی معوذتین اور سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور پناہ مانگنے والی دعائیں پڑھے جن میں سے بعض یہ ہیں:

" أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ"(۲)

میں اللہ کے مکمل کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں ہر شیطان وزہریلی چیز سے اور ہر ملامت کرنے والی آنکھ سے۔

" أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِّنْ شَرِّ مَا خلَقَ "

اللہ کے پورے کلمات کے ذریعہ جن کو کوئی نیک وبد تجاوز نہیں کر سکتا مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

" أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ وَمِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيهَا، وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ وَمِنْ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّيْلِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ

(۱)ابوداود:۳۸۸۸، یہ روایت ضعیف ہے۔

(۲)بخاری:۳۳۷۱

بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ "(۱)

میں اللہ کے پورے کلمات کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں، اس چیز کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا اور پھیلا دیا اور ان چیزوں کی برائی سے جو آسمان سے اترتی ہے اور چڑھتی ہے اور اس سے بھی جس کو زمین میں پھیلایا اور جو زمین سے نکلتی ہے اور رات و دن کے فتنوں سے اور رات کے ہر آنے والے کی برائی سے مگر وہ نہیں جو بھلائی کے ساتھ آئے، اے بڑی مہربانی کرنے والے!۔

"أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتَ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَن يَّحْضُرُوْن"(۲)

میں اللہ کے کلمات تامہ کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں، اس کے غضب، اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیطانوں کے وسوسے سے اور ان کے میرے پاس حاضر ہونے سے۔

" اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ، وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اللّٰهُمَّ أَنْتَ تَكْشِفُ الْمَأْثَمَ وَالْمَغْرَمَ، اللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ

(۱) مسند احمد: ۳/۴۱۹

(۲) ابوداود: ۳۸۹۳

وَعْدُكَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ "(۱)

اے اللہ! میں تیرے باعزت چہرے اور تیرے پورے کلمات کے ذریعہ ان چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، جن کی پیشانی کو تو پکڑے ہوئے ہے، اے اللہ! تو ہی قرض اور خطاؤں کو دور کرتا ہے۔ تیرا لشکر شکست نہیں کھا سکتا، تیرا وعدہ غلط نہیں ہوسکتا، تو پاک ہے، ہم تیری ہی حمد کرتے ہیں۔

" أَعُوذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيمِ الَّذِى لَا شَيْءَ أَعْظَمُ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَايُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَأَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنَى وَبِأَسْمَائِهِ مَاعَلِمْتُ مِنْهَا مَالَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ ذِى شَرٍ لَا أُطِيقُ شَرَّهُ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ ذِى شَرٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ "

میں اللہ برتر کی ذات پاک کے ذریعہ پناہ چاہتا ہوں، جس سے بڑا کوئی نہیں۔ اور ان پورے کلمات کے ذریعہ جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کرسکتا، اور اللہ کے اسماء حسنی کے ذریعہ جن کو میں جانتا ہوں اور جنہیں نہیں جانتا، ان چیزوں کے شر سے جنہیں اس نے پیدا کیا اور پھیلایا اور ہر شر والی چیز کے شر سے جسے برداشت کرنے کی مجھے طاقت

(۱) ابوداود: ۵۰۵۲، اس کی سند ضعیف ہے۔

نہیں، اور جس کی پیشانی تیری گرفت میں ہے۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔

”تَحَصَّنْتُ بِاللّٰهِ الَّذِي لَاإِلٰهَ إِلَّاهُوَ إِلٰهِي وَإِلٰهُ كُلِّ شَيْءٍ، وَاعْتَصَمْتُ بِرَبِّي وَرَبِّ كُلِّ شَيْءٍ وَتَوَكَّلْتُ عَلَي الْحَيِّ الَّذِیْ لَايَمُوتُ ، وَاسْتَدْفَعْتُ الشَّرَّ بِلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ،حَسْبِيَ الرَّبُّ مِنَ الْعِبَادِ، حَسْبِيَ الْخَالِقُ مِنَ الْمَخْلُوقِ ، حَسْبِيَ الرَّازِقُ مِنَ الْمَرْزُوقِ ،حَسْبِیَ الَّذِی هُوَ حَسْبِیْ، حَسْبِيَ الَّذِیْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَكَفَى سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ دَعَا لَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ مَرْمَى حَسْبِيَ اللّٰهُ لَاإِلٰهَ إِلَّاهُو عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ“

میں اس اللہ کی حفاظت میں داخل ہوا، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی میرا اور ہر چیز کا معبود ہے، میں نے اپنے اور ہر چیز کے پروردگار کی حفاظت اختیار کی اور اس ذات پر بھروسہ کیا جو زندہ ہے، مر نہیں سکتا۔ اور (لاحول ولاقوۃ الا باللہ) کے ذریعے شر کو دفع کیا، مجھے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے، بندوں سے رب کافی ہے، مخلوق سے خالق کافی ہے، مرزوق سے رازق کافی ہے۔ مجھے وہی ذات کافی ہے جو کافی ہے، وہ اللہ کافی ہے جس کی قبضہ میں ہر چیز کی حکومت ہے، وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور اللہ کافی ہے اور بس دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہے۔ اللہ کے سوا

کوئی مقصد نہیں۔ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اس پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

جس نے بھی ان دعاؤں اور تعویذات کا تجربہ کیا، وہ سمجھ لے گا کہ یہ کس قدر فوائد ونفع سے بھری ہیں، اور ان کی کس قدر اہمیت ہے۔ ان سے نظر بد سے بچاؤ ہوسکتا ہے اور کہنے والے کی قوت ایمانی کے مطابق ان سے دفاع ہوسکتا ہے، اور اس کی قوت توکل وثبات قلب کے مطابق تحفظ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ایک ہتھیار ہے اور ہتھیار اس کے چلانے والے کی قوت وطاقت پر موقوف ہوتا ہے۔

خود اپنی نظر لگنے کا علاج:

جب نظر لگنے والے کو خود اپنی نظر کسی کو لگ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے یہ دعا پڑھ کر اس سے محفوظ ہونا چاہیئے:

”اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلَيْهِ“

اے اللہ! اس پر برکت فرما۔

جیسے نبی کریم ﷺ نے عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا جب سہل بن حنیف کو ان کی نظر لگی: کیا تم نے دعائے برکت نہیں کی، یعنی ”اللہ بارک علیہ“ نہیں پڑھا۔ نیز ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ پڑھنے سے نظر دور ہو جاتی ہے۔

ہشام بن عروہ اپنے والد بزرگوار سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی تعجب خیز چیز دیکھتے یا کسی باغ میں داخل ہوتے تو ”مَاشَاءَ اللّٰهُ قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰه“ پڑھا کرتے تھے۔

اسی قبیل سے جبریل علیہ السلام کا دم وہ دعا ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ پر کیا، جو صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے:

” بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ اللّٰهُ يَشْفِيكَ بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ“(۱)

اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں، ہر مرض سے جو آپ کو تکلیف دے، ہر نظر بد یا حاسد کی نظر شر سے، اللہ آپ کو شفا دے۔ اللہ کے نام سے آپ پر دم کرتا ہوں۔

پھر مصنف نے ہر تکلیف کے علاج کے لئے الٰہی رقیہ اور معالجہ کا ذکر کیا ہے، جس کو ہم طب نبوی یا دستور محمدی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سنن ابوداود میں ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مرفوع کو مصنف نے ہر مرض سے شفا کے لئے ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے جس کو کوئی تکلیف ہو، یا اس کا بھائی کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو اسے چاہیئے کہ یہ دعا پڑھے:

” رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِي فِي السَّمَاءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ أَمْرُكَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

(۱) مسلم: ۲۱۸۶

كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَاءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْأَرْضِ ، اغْفِرْلَنَا حُوبَنَا وَخَطَايَانَا، أَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِينَ ، أَنْزِلْ رَحْمَةً مِن رَّحْمَتِكَ وَشِفَاءً مِنْ شِفَائِكَ عَلَى هَذَالْوَجْعِ "(۱)

اے ہمارے پروردگار (اللہ) جو آسمان میں ہے، تیرا نام مقدس ہے۔ تیرا حکم آسمان اور زمین میں ہے۔ جس طرح تیری رحمت آسمان میں ہے (اسی طرح) زمین میں اپنی رحمت نازل فرما اور ہمارے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرمادے۔ تو ہی پاک لوگوں کا پروردگار ہے۔ اپنے پاس سے رحمت نازل فرما اور اپنی شفا سے شفا نازل فرما اس درد پر۔

چنانچہ یہ دعا پڑھتے ہی وہ وہ مرض سے شفایاب ہوجائے گا۔ پھوڑے، چوٹ اور زخم کے علاج کے متعلق صحیحین میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب انسان کو تکلیف ہو، پھوڑا یا زخم وغیرہ ہو تو شہادت کی انگلی زمین پر رکھے پھر اٹھائے اور یہ دعا پڑھے:

"بِسْمِ اللّٰهِ ، تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيقَةِ بَعْضِنَا يُشْفَى سَقِيمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا "

اللہ کے نام سے یہ ہماری زمین کی مٹی ہے اور ہم میں سے ایک کا تھوک ہے، ہمارا

(۱) ابوداود: ۳۸۹۳، یہ روایت ضعیف ہے۔

بیمار ہمارے پروردگار کے حکم سے شفایاب ہو جائے۔

اس دعا میں ہر زمین کی مٹی مراد ہے یا صرف زمین مدینہ کی مٹی؟ اس سلسلہ میں دو قول ہیں۔

فصل (۸۵)

آپ ﷺ کا شدت مصیبت کے وقت علاج کا طریقہ

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ☆الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ ☆أُولَـئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ [البقرة:۱۵۵-۱۵۷]

اور خوشخبری دے دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت تو کہیں ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی، اور مہربانی، اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔

صحیح میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعا روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص اگر مبتلائے مصیبت ہو جائے تو یوں کہا کرے:

﴿إِنَّا لِلّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعون ، اللهم أجُرْنِي فِي مُصِيبَتِى وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا﴾(۱)

ہم اللہ کے ہی ہیں اور اسی کی طرف واپس جانا ہے، اے اللہ! میری مصیبت میں

(۱) مسلم:۹۱۸

مجھے پناہ دے اور مجھے اس سے بہتر بدل عطا فرما۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت میں پناہ دے گا اور بہتر بدل عطا فرمائے گا۔ یہ کلام مصیبت کا سب سے بہترین علاج اور دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے، کیونکہ یہ دو عظیم اصولوں پر مشتمل ہے کہ اگر بندے کو ان کی معرفت حاصل ہو جائے تو مصیبت میں اسے اطمینان و سکون حاصل ہوگا۔ وہ دو اصول یہ ہیں:

پہلا اصول: بندہ اور اس کے اہل و عیال اور مال و دولت یہ سب کی سب چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور بندے کے پاس بطور امانت اور عاریۃً ہیں۔

دوسرا اصول: بندے کا انجام کار اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور دنیا کو چھوڑ کر تن تنہا چلے جانا ہے۔

جب بندے کی یہ ابتدا اور انتہا ہے تو اس میں غور و فکر مصیبت کا سب سے بڑا علاج ہے۔ پھر نعمت کے حصول پر فرحت کیوں؟ اور مصیبت کے نزول پر رنج و غم کیوں؟

نیز ایک علاج یہ بھی ہے کہ اسے اس بات کا یقینی علم ہو کہ جو تکلیف پہنچی ہے، وہ ٹلنے والی نہ تھی، اور جو ٹل گئی، وہ پہنچنے والی نہ تھی۔ یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ مصیبت پر صبر کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب ہے وہ یقیناً فوت شدہ چیز سے زیادہ ہے۔ نیز بندہ کو چاہیئے کہ وہ دائیں بائیں کے دوسرے مصیبت زدگان کو بھی دیکھے۔ اسے ہر طرف

آزمائش اور حسرت کا ایک سلسلہ نظر آئے گا۔ دنیا کی مسرتیں خواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان سے انسان تھوڑا ہنستا ہے تو بہت زیادہ روتا ہے۔ بندہ کو یہ بھی یقین رکھنا چاہئیے کہ بے چینی اور گریہ وزاری سے مفقود چیز واپس نہیں لوٹ سکتی بلکہ پریشانی اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

بندہ یہ بھی سوچے کہ اللہ تعالی نے صبر کرنے والوں اور (إنا لله و إنا إليه راجعون) پڑھنے والوں سے جن نعمتوں کا وعدہ کیا ہے وہ فوت شدہ چیز سے کہیں زیادہ اعلی واعظم ہے۔ بندہ اس کو بھی ملحوظ رکھے کہ ضرورت سے زائد گریہ وزاری اور اظہار پریشانی، دشمنوں کو خوش اور دوستوں کو رنجیدہ اور اللہ تعالی کو ناراض کرے گی۔ بندے کو یہ بھی جاننا چاہئیے کہ صبر واحتساب کے بعد جو لذت حاصل ہوگی وہ فوت ہونے والی چیز اگر باقی رہتی تو اس کی لذت سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔اور بندہ یہ بھی سوچ کر تسلی حاصل کرے کہ اللہ تعالی اس کا ضرور نعم البدل عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالی کی ذات کے علاوہ ہر چیز کا بدل موجود ہے۔اور بندے کو یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ نعمت کا جتنا حصہ اس کے حق میں مقدر تھا اسے مل چکا ہے۔اب اتنے پر راضی اور مطمئن ہے تو اسے اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی حاصل ہوگی، اور اگر اس سے ناراض ہے تو اللہ تعالی اس سے ناراض ہوگا۔اور یہ کہ بندہ کو ہر چیز جزع وفزع سے تھک ہار کر صبر کرنا ہی ہوگا اور ایسی صورت

میں نہ تو ثواب ملے گا اور نہ وہ قابل تعریف ہوگا۔ نیز بندہ کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ بیماریوں کا بہترین علاج رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم ہو جانا ہے، اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی رضا ورغبت کا خیال رکھا جائے اور اس کی مخالفت نہ کی جائے۔

بندہ مومن کو چاہیئے کہ دونوں نعمتوں اور لذتوں کے درمیان مقابلہ کرے کہ فوت شدہ چیز زیادہ فائدہ مند تھی یا اس کے فوت ہونے کے بعد صبر کرنے کے صلہ میں حاصل شدہ اجر وثواب کی نعمت زیادہ نفع بخش ہے۔ بندہ کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ مصیبت کے ذریعہ آزمائش میں ڈالنے والی ذات احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین ہے۔ اس ذات پاک نے اسے ہلاک کرنے کے لئے مبتلائے مصیبت نہیں کیا ہے، بلکہ اس کا مقصد اس کے ایمان ویقین وصبر واستقامت کا امتحان ہے، تاکہ اس کے خوف وخشیت الٰہی اور تضرع وزاری کو سنے اور اپنے دروازہ رحمت پر پڑا ہوا دیکھے۔

بندہ مومن کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ یہ مصیبتیں مہلک اور خطرناک بیماریوں کو روکنے اور دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں، جیسے تکبر، خود پسندی اور سنگ دلی۔ اور یہ بھی سوچے کہ دنیا کی تلخی ہی در اصل آخرت کی حلاوت اور ثمر شیریں ثابت ہوگی، اگر سمجھ میں نہ آئے تو نبی صادق ومصدوق ﷺ کے اس ارشاد گرامی پر غور وفکر کرے۔ ''جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے اور دوزخ کو شہوتوں اور مرغوبات سے گھیر دیا گیا ہے''۔ اسی مقام پر مخلوقات کی عقل کا تفاوت ظاہر ہوتا ہے اور لوگوں کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔(۱)

(۱) بخاری: ۶۴۸۷، مسلم: ۲۸۲۳

فصل (۸۶)

نبی کریم ﷺ کا حزن وغم کے علاج کا طریقہ

صحیحین میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بے چینی کے موقع پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

"لَاإِلٰـهَ إِلَّااللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ،لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ "(۱)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بزرگ اور حلیم ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا پروردگا رہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو ساتوں آسمانوں کا رب اور زمین کا رب اور عرش کریم کا رب ہے۔

نیز جامع ترمذی میں انس سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی رنج وغم لاحق ہوتا تو یہ دعا فرماتے:

"يَا حَيُّ يَاقَيُّومُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيثُ "(۲)

اے زندہ اے ہر چیز کو قائم رکھنے والے! تیری رحمت کے طفیل مدد مانگتا ہوں۔

(۱) بخاری:۶۳۴۵، مسلم:۲۷۳۸

(۲) ترمذی:۳۵۲۲، یہ حدیث حسن ہے۔

نیز ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کسی بات کا صدمہ ہوتا تو آپ آسمان کی جانب سر مبارک اٹھاتے اور "سُبْحَانَ اللَّـهِ الْعَظِيمِ" پڑھتے اور دعا میں خوب سعی فرماتے اور "يَا حَيُّ يَاقَيُّومُ" پڑھتے۔

سنن ابو داود میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پریشان اور مصیبت زدہ آدمی کی دعائیں یہ ہیں:

"اللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُو، فَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَأَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ، لَاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ"(۱)

اے اللہ میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔اس لئے مجھے چشم زدن کے لئے بھی میرے سپرد نہ کر، اور میری حالت درست فرما، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

نیز اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ مجھے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسے کلمات نہ بتاؤں جنہیں تکلیف اور پریشانی کے وقت میں کہہ لیا کرو وہ یہ ہیں:

"اللّٰهُ رَبِّي لَاأُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا "

اللہ میرا پروردگار ہے، میں اس کا کسی کو شریک نہیں بناتا۔

(۱) بخاری فی الأدب المفرد: ۷۰۱، یہ حدیث حسن کے قریب ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اسے سات بار کہا جائے۔(۱)

مسند احمد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

جب بندے کو غم اور دکھ پہنچے تو وہ یہ دعا کرے:

" اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيمَ رَبِيعَ قَلْبِي، وَنُورَ صَدْرِي وَجَلَاءَ حُزْنِي وَذَهَابَ هَمِّي"(۲)

اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں، تیری بندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ مجھ پر تیرا فیصلہ ہی ہے۔ میں تیرے اس نام کے طفیل سوال کرتا ہوں جسے تو نے اپنے لئے اختیار کیا ہے، یا تو نے اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا تو نے اسے اپنے پاس علم غیب (مخفی) میں رکھا کہ تو قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا

(۱) ابوداود: ۵۲۵، اس کی سند جید ہے۔

(۲) مسند احمد: ۱/۳۹۱، یہ حدیث حسن ہے۔

نور، میرے غم کا مداوا اور میری فکر کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے۔

جو بھی اسے پڑھے گا، اللہ تعالی اس کا رنج وغم دور کر دے گا اور اس کی جگہ فرحت عطا فرمائے گا۔

جامع ترمذی میں سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذوالنون علیہ السلام کی دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یہ ہے:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾

تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بیشک میں ظالموں میں سے ہوں۔

کوئی مسلمان بھی ان الفاظ سے دعا کرے تو اس کی دعا (ضرور) قبول کی جائے گی۔(۱) ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ "میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ کوئی مصیبت زدہ ایسا نہیں جو اسے کہے اور اس کی تکلیف دور نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی یونس (علیہ السلام) کی دعا ہے"۔

سنن ابوداود میں ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوامامہ سے فرمایا: میں تمہیں ایسا کلام نہ بتاؤں کہ جب تم اسے پڑھو تو اللہ عزوجل تمہارا غم دور کر دے اور تمہارا قرض ادا فرما دے۔ راوی کہتے ہیں، میں نے عرض کیا، ہاں ضرور اے

(۱) مستدرک حاکم: ۱/۵۰۵، اس کو صحیح کہا اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔

اللہ کے رسول (ﷺ) آپ نے فرمایا جب صبح اور شام ہو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو:

" اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحَزَنِ ،وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ ،وَأَعُوذُ بِكَ مِن غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ "

اے اللہ! میں غم وحزن سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں عجز اور سستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور میں بزدلی اور کنجوسی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں غلبہ قرض اور آدمیوں کے قہر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، چنانچہ اللہ عزوجل نے تمام رنج وغم دور فرما دیئے اور میرے سارے قرضے ادا کر دیئے۔(۱)

سنن ابوداود میں ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو استغفار لازم کر لے اللہ تعالی اسے ہر غم سے نجات عطا کرے گا، وہ اسے ہر تنگی سے نکال دے گا اور اسے ایسی جگہ سے رزق ملے گا جہاں کا اسے وہم گمان کبھی نہ ہوگا۔(۲) اور سنن میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم پر جہاد واجب ہے، کیونکہ یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالی لوگوں کو رنج وغم سے

(۱) ابوداود: ۱۵۵۵

(۲) ابوداود: ۱۵۱۸، اس کی سند ضعیف ہے۔

نجات دیتا ہے۔(۱)

مسند میں مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو جب کوئی غم ہوتا تو آپ نماز کی طرف رجوع فرماتے اور کہتے اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة:٤٥]

صبر کر کے اور نماز پڑھ کر اللہ سے مدد مانگو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس پر رنج وغم کی کثرت ہو اسے کثرت سے "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" پڑھنا چاہیئے۔ صحیحین سے ثابت ہے کہ یہ کلمات جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہیں۔(۲)

اور یہ مذکورہ طریقہ پندرہ قسموں پر مشتمل ہے۔ اگر ان سے رنج وغم زائل نہ ہو سکے تو مطلب یہ ہے کہ بیماریاں جڑ پکڑ چکی ہیں اور اس کے اسباب مستحکم ہو گئے ہیں اور اب مکمل استفراغ کی ضرورت ہے۔ وہ پندرہ قسمیں یہ ہیں:

۱-توحید ربوبیت پر ایمان کامل رکھنا۔

۲-توحید الوہیت پر ایمان کامل رکھنا۔

(۱) مسند احمد: ۵/۳۱۴، اس کی سند جید ہے۔

(۲) بخاری: ۲۹۹۲، مسلم: ۲۷۰۴

۳-توحید علمی پر ایمان کامل رکھنا۔

۴-اللہ تعالی کو اس سے پاک جاننا کہ وہ کسی بندے پر ظلم کرتا اور بندے کا بغیر سبب کے مواخذہ کرتا ہے۔

۵-بندوں کا اعتراف ظلم وخطا۔

٦-اللہ تعالی کی محبوب ترین چیز کے ذریعہ اس تک پہنچنا اور یہ درجہ اس کے اسماء وصفات کو حاصل ہے اوران اسماء وصفات کے معانی کے اعتبار سے بہترین اور جامع یہ دونوں نام ہیں: ''الحی القیوم''۔

۷-صرف اللہ واحد سے استعانت چاہنا۔

۸-ذات ربوبیت سے بندے کی آس اور امید کا اقرار۔

۹-اللہ تعالی پر توکل کامل اور ہر کام اس کے سپرد کرنا اور اس بات کا اعتراف کہ بندہ کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے، جس طرح چاہتا ہے اسے پھیرتا ہے، اس کا حکم بندہ کے حق میں جاری ہے اور اس کا فیصلہ عادلانہ ہے۔

۱۰-باغ قرآن سے اس کا قلب شمیم انگیزیاں حاصل کرے جو اس کے قلب کے لئے موسم بہار بن جائے گا، جس کے باعث وہ شبہات وشہوات کے ظلمات میں روشنی لے کر چل سکے، اور جس کی وجہ سے ہر فوت شدہ چیز پر صبر وسکون اور تسلی حاصل کرے۔

ہر مصیبت کو برداشت کر سکے اور دل کے روگ دور کر سکے جو اس کے حزن وملال کو دور کردے اور صدمہ غم والم سے شفایاب ہو سکے۔

۱۱- اللہ تعالی کی جناب میں استغفار وانابت اور رجوع کرے۔

۱۲- اللہ برتر وبزرگ کی جناب میں توبہ کرے۔

۱۳- اللہ کے راستے میں جہاد کرے۔

۱۴- نماز کو بصد ذوق وشوق واہتمام سے ادا کرے۔

۱۵- لاحول ولاقوۃ کے سہارے براءت اور تمام آلام وہموم کے بارے میں اللہ تعالی کی طرف معاملات کی سپردگی کردے۔

فصل (۸۷)

نبی کریم ﷺ کا بے خوابی اور گھبراہٹ کے علاج کا طریقہ

جامع ترمذی میں بریدہ سے مروی ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ شکایت عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! میں گھبراہٹ کے باعث رات کو سو نہیں پاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بستر پر جاؤ تو یہ دعا پڑھ لیا کرو:

”اللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَمَا أَظَلَّتْ، وَرَبَّ الْأَرَضِيْنَ السَّبْعِ وَمَا أَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا أَضَلَّتْ، كُنْ لِي جَارًا مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا أَنْ يُّفْرِطَ عَلَيَّ أَحَدٌ مِنْهُمْ، أَوْ يَبْغِى عَلَيَّ، عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ“(۱)

اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور ان چیزوں کے جن پر ان کا سایہ ہے، اے ساتوں زمینوں کے پرودگار اور ان چیزوں کے جن کو انھوں نے چھپا رکھا ہے اور شیاطین کے پروردگار اوان کے جن کو انھوں نے گمراہ کیا، اپنی ساری مخلوق کے شر سے مجھے پناہ دینے والا بن جا۔ اس بات سے کہ ان میں سے کوئی مجھ پر افراط کرے یا مجھ پر زیادتی کرے، تیرا پڑوسی غالب اور تیری ثنا بڑی ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۱) ترمذی: ۳۵۱۸، اس کی سند قوی نہیں ہے۔

اسی کتاب میں عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھبراہٹ کے موقع پر یہ دعا سکھلایا کرتے تھے:

" أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ ، وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَ أَعُوذُبِكَ رَبَّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ "(۱)

اللہ کے پورے کلمات کے ذریعہ میں پناہ چاہتا ہوں، اس کے غضب سے، بندوں کے شر سے شیطانوں کے وسوسے سے اور اس بات سے کہ میرے پاس وہ آئیں۔

راوی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو اپنے باشعور بچوں کو یہ دعا سکھلایا کرتے تھے اور جو چھوٹے تھے، اسے لکھ کر ان کے گلے میں لٹکا دیا کرتے تھے۔

عمرو بن شعیب سے مرفوعا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم آگ لگی ہوئی دیکھو تو تکبیر کہو کیونکہ تکبیر (اللہ اکبر) آگ کو بجھا دے گی"۔(۲)

چونکہ آگ کا سبب شیطان ہوتا ہے اور وہ اس سے پیدا ہوا ہے اور اسی سے اس کا خمیر ہے، اس لئے آگ سے شیطان کو مدد ملتی ہے، اور آگ فطرتاً بلندی اور فساد پسندی پر مبنی ہے۔ یہ دونوں عادتیں شیطانی صفات میں سے ہیں۔ وہ انہی کی طرف دعوت دیتا

(۱)ابوداود:۳۸۹۳،اس کی سند حسن ہے۔

(ابوداود:۳۸۹۳

ہے اور اس کے سبب انسان ہلاکت میں پڑتا ہے۔

آگ کے شعلے اور شیطان دونوں ہی دنیا میں فساد اور تعلی کے طالب ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالی کی کبریائی کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی لہذا جب مسلمان ''اللہ اکبر'' کہتا ہے تو تکبیر کا اثر آگ کو بجھا دیتا ہے، اور شیطان کو بھی بھگا دیتا ہے جو آگ کا اصل مادہ ہے۔

ہم نے اور ہمارے دوستوں نے بارہا اس کا تجربہ کیا اور ایسا ہی پایا۔

فصل (۸۸)

نبی کریم ﷺ کا حفظان صحت کے سلسلہ میں اسوہ حسنہ

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾[الأعراف: ٣١]

کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی کہ بدن میں تحلیل ہونے والے اجزا کے مطابق کھانا اور پانی داخل کرنا چاہیئے تاکہ اس سے بدن کی کمیت اور کیفیت میں فائدہ مند حد تک استفادہ ہو، لیکن جب یہ مقدار بڑھ جائے گی تو یہ اسراف میں داخل ہوگی۔اس لئے دونوں باتیں صحت کے لئے مضر اور مرض کی ذمہ دار ہیں۔یعنی خورد ونوش بند کر دینا یا اس میں اسراف سے کام لینا۔

پس اللہ تعالی کے ان دو کلمات طیبہ میں حفظان صحت کی تمام باتیں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں اور چونکہ صحت وسلامتی بندہ پر اللہ تعالی کی سب سے بڑی نعمتوں اور بے پایاں عطیات میں سے ہے بلکہ سب سے بڑی نعمتوں میں سے عمومی عافیت ہے اس لئے جسے توفیق ملے اس کی حفاظت وقدر کرنی چاہیئے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''دو نعمتیں ایسی ہیں جو بہت سارے لوگوں کے حق

میں قابل رشک ہیں۔ ایک صحت، دوسرے فارغ البالی‘‘۔(۱) امام ترمذی نے مرفوعا روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ’’جو صبح اس حالت میں کرے کہ اس کا جسم بعافیت ہو اور گھر بحفاظت ہو، اور اس کے پاس اس دن کی روزی موجود ہو تو گویا اسے ساری دنیا دے دی گئی ہے‘‘۔(۲)

اور ترمذی ہی میں مرفوعا مذکور ہے کہ: ’’قیامت کے دن انعامات میں سے اللہ تعالی سب سے پہلے بندہ سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے جسمانی صحت نہیں دی تھی اور تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا‘‘۔(۳)

اسی وجہ سے اسلاف میں سے بعض نے آیت کریمہ ﴿ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ پھر البتہ ضرور تم سے انعامات الٰہی کے متعلق پوچھا جائے گا۔(التکاثر:۸) میں نعمت کی تفسیر صحت سے کی ہے۔

امام احمد نے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ ’’اللہ سے یقین اور عافیت مانگو، اس لئے کہ یقین کے بعد عافیت سے بہتر کوئی چیز عطا نہیں کی گئی۔(۴)

---

(۱) بخاری:۶۴۱۲

(۲) ترمذی:۲۳۴۷، اس کی سند حسن ہے۔

(۳) ترمذی:۳۳۵۵، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ترمذی:۳۵۸۸، یہ حدیث حسن ہے۔

لہذا دین و دنیا دونوں کی عافیت جمع کر دی گئی اور دونوں جہاں میں یقین و عافیت کے ذریعے ہی بندے کی کامیابی ہے۔ یقین سے آخرت کے عذاب سے بچاؤ ہے اور عافیت سے قلب و جسم امراض دنیا سے نجات پاتے ہیں۔

سنن نسائی میں مرفوعاً مذکور ہے کہ: اللہ تعالی سے عافیت اور معافی طلب کرو کیونکہ کسی کو یقین کے بعد عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں دی گئی ہے"۔(۱)

دعا میں جو تین الفاظ مذکور ہیں، ان میں عفو کے ذریعہ گزری ہوئی برائیوں کا ازالہ ہو جائے گا اور عافیت کے ذریعہ موجودہ برائیوں کا اور معافات کے ذریعہ آئندہ برائیوں کا۔

(۱) نسائی: ۸۷۹

فصل (۸۹)

نبی کریم ﷺ کا کھانے پینے میں اسوہ حسنہ

خوردونوش میں نبی کریم ﷺ کی عادت طیبہ یہ نہ تھی کہ ایک ہی قسم کی غذاؤں پر قائم رہتے۔ان کے علاوہ دوسری استعمال نہ فرماتے کیونکہ یہ طریقہ صحت کے لئے بہت نقصان دہ ہے خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ آپ ﷺ اہل وطن کی عادت ومعمول کے مطابق مختلف اشیاء تناول فرماتے تھے۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی بھی کھانے میں عیب نہیں نکالا، جی چاہا تو تناول فرمالیا ورنہ چھوڑ دیا۔اور طبیعت راغب نہ ہوتو کھانا نہ کھایا جائے اور زبردستی پیٹ میں بھرنے کی کوشش نہ کی جائے۔حفظان صحت کے معاملہ میں یہ ایک مرکزی اصول ہے۔ کیونکہ خواہش کے برعکس کھانا کھانے سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہوگا۔

آپ ﷺ گوشت پسند فرماتے تھے۔دست کا حصہ اور اگلے حصے کا گوشت زیادہ مرغوب تھا(۱)، کیونکہ یہ ہلکا اور زود ہضم ہوتا ہے۔نیز آپ میٹھی چیز اور شہد پسند کرتے

(۱) بخاری:۳۳۴۰،مسلم:۱۹۴

تھے۔ یہ تینوں چیزیں یعنی گوشت، حلوا اور شہد بدن، جگر اور اعضا رئیسہ کے لئے غیر معمولی مفید ہیں۔

آپ ﷺ علاقے کے تازہ پھل بھی استعمال فرماتے اور ان سے پرہیز نہ کرتے۔ یہ طریقہ بھی اصول غذائیت کے مطابق ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے ہر جگہ، ہر علاقہ میں ایسے پھل پیدا فرمائے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے لئے فائدہ مند ہوں اور ان کی صحت وعافیت میں اضافہ کا سبب بنیں۔

عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص علاقائی پھلوں اور غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے وہ جسمانی طور پر بیمار اور کمزور رہتا ہے۔

کھانے پینے کے آداب:

صحیح روایت میں آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا (۱) بلکہ اس طرح بیٹھتا ہوں کہ جیسے بندہ بیٹھتا ہے اور اس طرح کھاتا ہوں جس طرح بندہ کھاتا ہے''۔

اس کی تشریح میں چار زانو بیٹھنا، ٹیک لگانا اور پہلو کے بل ٹیک لگا کر بیٹھنا بھی شامل ہے، اور تینوں طرح کی ٹیک مضر صحت ہے۔ آپ تین انگلیوں سے کھانا تناول

(۱) بخاری:۵۳۹۸

فرماتے تھے اور یہ صورت سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ آپ ﷺ شہد میں ٹھنڈا پانی ملا کر پیتے تھے (۱) اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پینے والے کو قے کرنے کا حکم فرمایا (۲)، اور یہ بھی ثابت ہے کہ ضرورت کے وقت آپ نے کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا ہے (۳)۔ نیز آپ پانی پینے کے دروان تین مرتبہ سانس لیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس سے سیرابی ہوتی ہے اور پانی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اس سے شفایابی بھی حاصل ہوتی ہے۔ (۴)

جامع ترمذی میں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں پانی مت پیو بلکہ دو یا تین دفعہ کر کے پیو اور جب پیو تو بسم اللہ کہو اور جب پینے سے فارغ ہو جاؤ تو الحمدللہ کہو''۔ (۵)

---

(۱) ترمذی: ۱۸۹۵

(۲) مسلم: ۲۰۲۴

(۳) بخاری: ۱۶۳۷، مسلم: ۲۰۲۷

(۴) مسلم: ۲۰۲۸

(۵) ترمذی: ۱۸۸۶، اس کی سند ضعیف ہے۔

برتنوں کو ڈھانکنے کی ہدایت:

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: ''برتنوں کو ڈھانک دو، پینے کے برتنوں کا منہ بند کردو، کیونکہ سال میں ایک ایسی بھی شب آتی ہے جب وبا نازل ہوتی ہے اور وہ کسی ایسے برتن کے پاس سے گزرتی ہے جس پر ڈھکنا نہ ہو یا پانی کے برتن کے پاس سے گزرتی ہے جو کھلا ہو تو یہ وبا اس میں گر پڑتی ہے''۔(۱)

اس حدیث کے ایک راوی لیث بن سعد کا بیان ہے کہ عجمی لوگ ہمارے یہاں سال میں ایک بار کانون الاول (دسمبر) کے ماہ میں ایک شب کو احتیاط کرتے ہیں۔ برتن کو ڈھانکنے سے متعلق ایک روایت صحیح میں منقول ہے کہ آپ نے برتن ڈھانک دینے کا حکم دیا اگرچہ ایک لکڑی کا تختہ ہی رکھ دیا جائے۔(۲)

برتن کو ڈھانکنے یا منہ بند کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرنے کا بھی حکم ہے(۳) نیز آپ نے کھڑے ہو کر منہ لگا کر پینے، برتن میں سانس لینے اور اس میں پھونکنے سے منع فرمایا ہے، اور پیالہ کے سوراخ سے بھی پینے کی ممانعت ہے۔(۴)

(۱) بخاری: ۵۶۲۳، مسلم: ۲۰۱۴

(۲) مسلم: ۲۰۱۲

(۳) بخاری: ۵۶۲۹

(۴) ابوداود: ۳۷۲۲، یہ حدیث صحیح ہے۔

فصل (۹۰)

نبی کریم ﷺ کا خوشبو کے استعمال میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ خوشبو پسند فرماتے تھے اور کوئی دے تو واپس نہیں لوٹاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ ”جسے ریحان پیش کیا جائے وہ اسے واپس نہ کرے کیونکہ اس کی خوشبو اچھی اور اٹھانے میں ہلکی ہے“۔ ابوداود اور نسائی میں بجائے ریحان کے ”طیب“ خوشبو کے الفاظ مذکور ہیں۔(۱) مسند بزار میں آپ سے مروی ہے کہ: ”بیشک اللہ تعالی پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیزوں کو پسند فرماتا ہے اور صاف ستھرا ہے اور صاف ستھری چیزوں کو پسند فرماتا ہے۔ کریم ہے اور کرم کو پسند فرماتا ہے۔ سخی ہے جود وسخاوت کو پسند فرماتا ہے۔ لہذا اپنے صحنوں اور گھروں کو صاف ستھرا رکھو، یہود جیسے نہ بنو جو کوڑا کرکٹ گھروں میں جمع رکھتے ہیں“۔(۲)

خوشبو میں ایسی خاصیت ہے کہ اسے فرشتے پسند کرتے ہیں اور شیاطین اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی لئے پاکیزہ روحیں بھی خوشبو کو پسند کرتی ہیں اور خبیث روحیں بدبو کو پسند کرتی ہیں۔ ہر روح کو اپنی مناسب چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کا

(۱) مسلم:۲۲۵۳، ابوداود:۴۱۷۲

ترمذی:۲۸۰۰، الصحیحۃ للألبانی:۲۳۶

ارشاد ہے:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾[النور:٢٦]

پلیداور گندی عورتیں پلیداور گندے مردوں کے لئے ہیں۔ پلید مرد پلید عورتوں کے لئے ہیں۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں، اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اگرچہ تذکرہ مردوں اورعورتوں کا ہے لیکن یہ اصول تمام اعمال واقوال، کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے اور سونگھنے کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ خواہ لفظ کو عام مان لیا جائے یا معنی میں وسعت دے دی جائے۔

فصل (۹۱)

نبی کریم ﷺ کا فیصلوں اور احکام میں اسوہ حسنہ

اس باب میں ہم عام قوانین کا ذکر نہیں کریں گے اگرچہ آپ کے مخصوص فیصلے بھی عام قانون ہی کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم یہاں صرف وہ جزوی احکام بیان کئے جائیں گے جن کے ذریعہ آپ نے لوگوں کے درمیان فیصلے فرمائے ہیں اور اسی کے ضمن میں کچھ اصولی احکام وقضایا کا بھی ذکر کریں گے۔

آپ ﷺ نے تہمت لگانے والے کو قید کی سزا دی ہے۔(۱) عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور دادا کے واسطے سے روایت کی ہے کہ ''ایک آدمی نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے سو کوڑے لگوائے، سال بھر کے لئے جلا وطن کر دیا، مزید حکم دیا کہ ایک غلام آزاد کرے لیکن قصاص نہیں لیا''۔(۲)

امام احمد نے سمرہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ ''جو اپنے غلام کو قتل کرتا ہے ہم اسے قتل کی سزا دیتے ہیں''۔(۳) اگر یہ حدیث محفوظ مان لی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ امام بطور تعزیر بوقت مصلحت ایسا کر سکتا ہے۔

(۱) ابوداود: ۳۶۳۰، اس کی سند حسن ہے۔

(۲) دارقطنی: ۳/۱۴۳، اس کی سند حسن ہے۔

(۳) ابوداود: ۴۵۱۵، اس کی سند ضعیف ہے۔

ایک شخص کو آپ نے یہ حکم دیا کہ وہ اپنے قرضدار کو پکڑے رہے، جیسا کہ ابو داود نے ذکر کیا ہے۔(۱)

ابوعبید نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قاتل کو قتل کرنے اور باندھنے والے کو باندھنے کا حکم فرمایا، یعنی اسے موت تک روکے رکھے۔(۲)

محدث عبدالرزاق نے مصنف میں علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بخیل کو تاحیات قید رکھا جائے گا۔ آپ ﷺ نے قبلیہ عرینہ والوں کو قصاص میں یہ سزا دی کہ ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے اور آنکھوں میں سلائی ڈالی، کیونکہ انہوں نے چرواہے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ پھر انہیں چھوڑ دیا گیا اور وہ بھوک پیاس سے مر گئے۔(۳)

صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے دوسرے پر دعوی کیا کہ اس نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہے، چنانچہ مدعی علیہ نے اقبال جرم کرلیا، تو آپ نے فرمایا کہ قاتل کو گرفتار کرلو۔ جب لوگ اس کو پکڑ کر لے جانے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس کو قتل کر دیا تو وہ اسی کی طرح ہو جائے گا۔ چنانچہ اس شخص نے واپس آکر عرض کیا کہ میں نے

---

(۱) ابوداود: ۳۶۲۹، اس میں ضعف ہے۔

(۲) مصنف عبدالرزاق: ۱۷۸۹۲

(۳) مصنف عبدالرزاق: ۱۷۸۹۳

آپ کے حکم ہی سے گرفتار کیا ہے، تو آپ نے فرمایا، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ تمہارے اور تمہارے ساتھی کے گناہوں کا ذمہ دار ہو؟ پھر اسے چھوڑ دیا۔(۱)

مذکورہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ''وہ بھی اسی کی طرح ہو جائے گا'' اس کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے۔ایک یہ کہ جب قاتل سے قصاص لے لیا جائے گا، تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اس طرح قاتل اور قصاص لینے والا ایک طرح کے ہو جائیں گے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصاص لینے والا قتل ہونے سے قبل قاتل کی طرح گناہگار ہو جائے گا۔آپ کا ارشاد یوں تھا ''اگر قتل کرے تو اس جیسا ہوگا'' اس سے قتل ہو جانے کے بعد مماثلت لازم آتی ہے۔اس طرح حدیث میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ صاحب حق کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیئے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اس نے قتل کا ارادہ کئے بغیر قتل کر دیا تھا تو ایسی صورت میں بھی زیادتی میں دونوں یکساں ہوں گے۔قاتل تو اپنے جرم کے سبب زیادتی کا مرتکب ہوگا اور انتقام لینے والا اس لئے زیادتی کا مرتکب ہوگا کہ اس نے جان بوجھ کر قتل نہ کرنے والے کو قتل کر دیا۔

(۱) مسلم:۱۶۸۰

اس تشریح پر امام احمد کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے، جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔اس میں وارد ہے کہ ''یارسول اللہ! میں نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔اس پر رسول اللہ ﷺ نے ولی سے فرمایا کہ: اگر وہ سچا ہے اور پھر تم نے اسے قتل کر دیا تو تم جہنم میں داخل ہوگے۔ یہ سن کر ولی نے قاتل کو چھوڑ دیا''۔(۱)

ایک یہودی نے ایک پڑوسی عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر قتل کر ڈالا تھا۔تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اس کا سر بھی اسی طرح توڑا جائے۔(۲)

اس سے مندرجہ ذیل چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کیا جائے۔

مجرم کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس میں وہ ماخوذ ہے۔

قتل کی سزا میں ولی کی اجازت کی ضرورت نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے مقتول کے اولیاء کے حوالے نہیں کیا نہ ان سے یہ فرمایا کہ اگر چاہو تو اسے قتل کر دو، چاہو تو

---

(۱) ابوداود:۴۴۹۸،اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) بخاری:۲۴۱۳،مسلم:۱۶۷۲

معاف کردو، بلکہ اسے قتل کروایا۔امام مالک کا یہی مسلک ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ آپ نے اس طرح سے قصاص عہد شکنی کی وجہ سے کیا تھا، تو یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ عہد شکنی کرنے والے کا سر پتھر سے نہیں کچلا جاتا بلکہ اس کا سر تلوار سے قلم کیا جاتا ہے۔

ایک عورت نے دوسری عورت پر سنگ باری کی نتیجۃً وہ ہلاک ہوگئی، اور اس کا بچہ جو ابھی پیٹ میں تھا، وہ بھی مرگیا۔ اس مقدمہ میں رسول اللہ ﷺ نے بچہ کے لئے تاوان (ایک غلام یا لونڈی) کا حکم دیا، اور مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبہ (خاندان کے وارثین) سے دلوائی۔(۱)

صحیح بخاری میں ہے نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے پیٹ میں بچہ کے قتل کے بدلہ میں ایک غلام یا ایک باندی کا فیصلہ فرمایا۔ پھر جس عورت کے خلاف آپ نے فیصلہ فرمایا تھا وہ وفات پا گئی تو آپ نے فرمایا کہ اس کی میراث اس کے لڑکوں اور شوہر کو ملے گی اور دیت کی ادائیگی عصبہ پر ہوگی۔(۲)

(۱) بخاری:۵۷۵۸، مسلم:۱۶۸۱

(۲) بخاری:۶۹۰۵

اس فیصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل شبہ عمد میں قصاص نہیں ہے، اور عصبہ کے ذمہ دیت یا تاوان کی ادائیگی ہوگی، اور قاتلہ کے شوہر اور اولاد کے ذمہ دیت کی ادائیگی نہیں ہوگی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے قتل کردینے کا فیصلہ فرمایا جس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کیا تھا، اور اس کے مال ومتاع کے چھین لینے کا حکم دیا۔(۱) امام احمد کا یہی مذہب ہے اور یہی صحیح ہے، لیکن ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسے شخص پر زانی کی حد جاری کی جائے گی، لیکن رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ زیادہ برحق اور لائق اتباع ہے۔

صحیحین میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ "اگر بغیر اجازت کوئی تمہارے گھر میں جھانکے اور وہ اس کی آنکھ پھوڑ ڈالے تو اس پر نہ دیت ہے نہ قصاص"(۲) یہ بغیر اجازت گھر میں جھانکنے والے کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کا فیصلہ ہے۔

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ ایک ایسی لونڈی کے قتل کردیئے جانے پر جو آپ کو گالیاں دیتی تھی، اس کا خون رائیگاں فرمایا۔(۳) اسی طرح یہودیوں کی ایک جماعت

---

(۱) ابوداود: ۴۴۵۷

(۲) بخاری: ۶۹۰۲، مسلم: ۲۱۵۸

(۳) ابوداود: ۴۳۶۱

کو ان کے گالیاں دینے اور ایذا رسائی کی وجہ سے آپ نے قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابو برزہ سے سب وشتم کرنے والے کو قتل کرنے کا ارادہ کرنے پر فرمایا ''رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو اس کا حق حاصل نہیں''۔(۱) اس موضوع سے متعلق دس سے زیادہ صحیح اور حسن اور مشہور حدیثیں مروی ہیں۔

مجاہد نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ: جو مسلمان اللہ کو یا انبیاء میں سے کسی ایک کو سب وشتم کرتا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کر رہا ہے، یہ ارتداد ہے۔ اس سے توبہ کرائی جائے، اگر وہ رجوع کرے تو خیر، ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ صحیحین میں مذکور ہے کہ آپ نے زہر دینے والے کو معاف کر دیا تھا۔(۲) یہ بھی ثابت ہے کہ یہودیوں میں سے جس نے آپ پر سحر کیا، اسے آپ نے قتل نہیں کیا۔ اور عمر، حفصہ اور جندب رضی اللہ عنہم سے جادوگر کا قتل ثابت ہے۔

اسیران جنگ بدر کے بارے میں آپ نے بعض لوگوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا، اور بعض کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اور بعض کو احسان کرتے ہوئے ویسے ہی رہا کر دیا۔ اور

(۱) ابوداود: ۴۳۶۳، اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) بخاری: ۳۱۶۹

بعض کوغلام بنالیا،لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے کبھی کسی بالغ شخص کوغلام نہیں بنایااور یہ احکام منسوخ نہیں ہوئے ہیں،حسب مصلحت امام المسلمین کواس میں اختیار ہے۔

یہود کے ساتھ آپ کے متعدد قضایااور فیصلے وابستہ ہیں۔پہلے پہل آپ ﷺ نے یہود مدینہ سے معاہدہ صلح وامن فرمایا، بعد میں بنی قینقاع سے جنگ فرمائی۔آپ کامیاب ہوئے اور ازراہ احسان چھوڑ دیا۔پھر بنونضیر نے آپ سے (خلاف عہد) جنگ کی۔آپ فتحیاب ہوئے اورانہیں جلاوطن فرمادیا۔کچھ عرصہ بعد بنوقریظہ نے آپ سے جنگ کی،آپ کوفتح نصیب ہوئی،آپ نے ان کے قتل کاحکم صادرفرمایا۔پھر خیبر کے یہود نے آپ ﷺ سے جنگ کی،آپ ان پر غالب ہوئے۔آپ نے انہیں ارض خیبرمیں بودوباش کی اجازت دے دی اوربعض کوقتل کی سزادی۔

فصل (۹۲)

نبی کریم ﷺ کا تقسیم غنائم سے متعلق فیصلہ اور طریقہ

نبی کریم ﷺ نے شہسوار کو تین حصے اور پیدل کو ایک حصہ دینے کا فیصلہ فرمایا، اور مقتول کا سارا ساز وسامن قاتل کو دینے کا حکم دیا۔

طلحہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، لیکن آپ نے ان دونوں کا بھی حصہ لگایا۔ انہوں نے عرض کیا، ہمیں اجر وثواب بھی ملے گا؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں تمہیں اجر وثواب بھی ملے گا۔

عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ رقیہ رضی اللہ عنہا جو کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں، ان کی تیمارداری کی وجہ سے غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، لیکن بایں ہمہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا بھی حصہ لگایا۔ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ میرا اجر؟ تو آپ نے فرمایا کہ تمہیں اجر وثواب بھی ملے گا، اور آپ کے اس طرح کے عمل پر سارے علماء کا اتفاق ہے۔

ابن حبیب فرماتے ہیں کہ: اس طرح کی تقسیم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جنگ میں غیر حاضر رہنے والے کا حصہ نہیں لگایا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ: امام احمد اور امام مالک اور متقدمین اور متاخرین کی ایک

جماعت کا قول ہے کہ جب امام المسلمین فوجی مصلحت کی خاطر کسی شخص کو میدان جنگ کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھیج دے، تو اس کا بھی حصہ لگایا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے مقتول سے حاصل شدہ ساز وسامان پر خمس نہیں لگایا، بلکہ اسے اصل مال غنیمت قرار دیا اور ایک شخص کی شہادت کی بنیاد پر اس کا فیصلہ فرما دیا ہے۔

فصل (۹۳)

نبی کریم ﷺ کا ہدایا وتحائف قبول کرنے کا طریقہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی خدمت میں ہدایا وتحائف پیش کیا کرتے تھے اور آپ قبول فرمالیتے تھے۔ بادشاہوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ہدایا اور تحائف آتے تھے۔ آپ ان کے ہدایا قبول فرمالیا کرتے تھے اور ان کو اپنے اصحاب کے مابین تقسیم کردیتے تھے۔ ایک دفعہ ابوسفیان نے بھی آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرمالیا۔

ابوعبید نے ذکر کیا ہے کہ عامر بن مالک نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا لیکن آپ نے اسے واپس کردیا اور فرمایا: (ہم کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتے)(۱) ابوعبید کہتے ہیں کہ حالت شرک میں ابوسفیان کا ہدیہ آپ نے اس لئے قبول فرمالیا تھا کہ اس زمانہ میں آپ کے اور اہل مکہ کے مابین معاہدہ ومصالحت تھی۔

اسی طرح مقوقس (حاکم مصر) کا ہدیہ بھی قبول فرمالیا تھا کیونکہ اس نے آپ کے قاصد حاطب کا بڑا اکرام کیا تھا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا تھا اور آپ ﷺ کو اپنے

---

(۱) فتح الباری: ۱۶۸۵، یہ مرسل ہے۔

قبول اسلام سے مایوس نہیں کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے کسی مشرک کا جس کے ساتھ جنگ جاری ہو ہدیہ کبھی اور کسی زمانہ میں قبول نہیں فرمایا۔

امام سحنون کا قول ہے کہ: اگر رومی حاکم امام المسلمین کو ہدیہ وتحفہ پیش کرے تو اسے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ ذاتی ہدیہ تصور کیا جائے گا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس ہدیہ میں سارے مسلمانوں کا حق ہوگا، اور بیت المال سے اس کے عوض میں ہدیہ دیا جائے گا۔ امام احمد کا قول ہے کہ اس کا حکم مال غنیمت کا ہے۔

فصل (۹۴)

نبی کریم ﷺ کا اموال واملاک کے تقسیم کا طریقہ

اموال کی تین قسمیں ہیں:

مال زکاۃ وصدقات۔

مال غنیمت۔

مال فئے (بغیر لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کردہ مال)۔

اموال زکاۃ اور غنیمت اور ان کے تقسیم کے طریقہ کار کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اور جیسا کہ پہلے واضح کر چکے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے زکاۃ کے آٹھوں صنفوں کو دینے کا التزام نہیں فرمایا ہے بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی صنف کو آپ نے دے دیا ہے۔

جہاں تک مال فئے کا تعلق ہے تو آپ نے غزوہ حنین کے دن اس میں مولفة القلوب کو دیا اور انصار کو کچھ نہیں دیا جس پر وہ لوگ قدرے ناراض ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر واپس جائیں اور تم لوگ اپنے خیموں میں رسول اللہ ﷺ کو لے کر جاؤ۔ اللہ کی قسم! تم جس چیز کو لے کر لوٹو گے وہ ان کی چیزوں سے کہیں بہتر ہے''۔(۱) علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے آپ کی

(۱) بخاری: ۴۳۳۰، مسلم: ۱۰۶۱

خدمت میں کچھ سونا بھیجا تو اسے آپ نے چار افراد کے درمیان تقسیم فرما دیا۔(۱)

سنن میں مذکور ہے کہ رشتہ داروں کا حصہ بنی مطلب اور بنی ہاشم کو دیا۔ بنی نوفل اور بنی عبد شمس کو چھوڑ دیا اور فرمایا کہ ہم بنی مطلب دور جاہلیت یا عہد اسلام میں کبھی الگ نہیں ہوئے، ہم دونوں ایک ہیں اور اپنے دست مبارک کی انگلیوں کو ایک ساتھ ملا لیا۔(۲) اور آپ نے ان کے اغنیاء وفقرار کے مابین برابر تقسیم نہیں کیا، اور نہ ہی تقسیم میراث کی طرح مرد کو عورت کا دوگنا دیا، بلکہ آپ نے حسب مصلحت اور لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اس مال سے غیر شادی شدہ کو دیا تا کہ وہ شادی کر لے، اور قرضدار کو دیا تا کہ وہ اپنا قرض ادا کر لے اور فقیروں کو دیا تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر لیں۔

نبی کریم ﷺ کی سنت اور اسوہ حسنہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خمس کے مصارف وہی رکھے جو زکاۃ کے مصارف ہیں، اور ان مذکورہ مصارف اور اصناف کے علاوہ کہیں اور نہیں تقسیم فرماتے تھے اور نہ اسے میراث کی طرح تقسیم فرماتے تھے، آپ کے اسوہ حسنہ اور سیرت طیبہ کے مطالعہ کرنے والے اس سلسلہ میں ذرا بھی

---

(۱) بخاری: ۳۳۴۴، مسلم: ۱۰۶۴

(۲) بخاری: ۳۱۴۰

شک وشبہ نہیں رکھتے۔

علماء کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا مال فئے رسول اللہ ﷺ کی ملکیت ہوتا تھا، جس میں آپ آزادی سے جیسے چاہتے تصرف فرماتے تھے، یا آپ کی ملکیت نہیں ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں دو قول ہیں جو کہ امام احمد وغیرہ کے مذہب میں مذکور ہیں۔ آپ کے اسوہ وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طرح تصرف فرماتے تھے جس طرح اللہ تعالی آپ کو حکم فرماتا تھا، اور اس کی ہدایات کے مطابق تقسیم فرماتے تھے، اور اس میں اپنی مشیئت اور ارادے کو دخل نہیں دیتے تھے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے آپ کو اس کا اختیار دیا تھا کہ رسالت کے ساتھ عبدیت کو پسند کرتے ہیں یا بادشاہت کو چنانچہ آپ نے مقام عبدیت کو اختیار فرما لیا تھا۔

ان دونوں میں فرق اس طرح ہے کہ بندگی والا رسول اپنے مالک اور مرسل کے حکم واجازت سے تصرف کرتا ہے اور بادشاہی والے رسول کو اختیار ہوتا ہے جس کو چاہے عطا کرے جس کو چاہے محروم کردے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے سلیمان علیہ السلام کے متعلق فرمایا جو بادشاہ اور رسول دونوں تھے۔

اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [ص:۳۹]
یہ ہمارا عطیہ ہے، آپ جسے چاہئے عطا کیجئے اور جسے چاہئے محروم کر دیجئے، ہم حساب نہ لیں گے۔

یعنی جس کو چاہے دیجئے اور جس کو چاہے نہ دیجئے ہم آپ سے حساب و کتاب نہ لیں گے۔ یہ مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے اسے چھوڑ کر اس سے اعلی اور بلند مرتبہ اختیار فرما لیا جس کو ہم مقام عبودیت خالصہ جانتے ہیں اور یہ فرمایا کہ: "اللہ کی قسم میں کسی کو نہ تو دیتا ہوں اور نہ کسی سے روکتا ہوں۔ صرف اسی کو دیتا ہوں، جس کو دینے کا حکم ملتا ہے"۔(۱)

اسی وجہ سے آپ اس مال سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا ایک سال کا خرچ لیتے تھے، اور باقی ماندہ سے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے فوجی ساز وسامان اور ہتھیاروں کا انتظام فرماتے تھے۔ اسی قسم کے اموال کے سلسلہ میں اختلافات پیدا ہوئے جو آج تک چل رہے ہیں۔

جہاں تک اموال زکاۃ، غنیمت اور میراث کی تقسیم کا مسئلہ ہے تو ان کے مصارف متعین ہیں، جس میں کسی اور کی شرکت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے حکام کو آپ کے بعد اس

(۱) بخاری: ۳۱۱۷

کی تقسیم میں وہ دشواری اور پریشانی نہیں پیش آئی جو مال فئے کی تقسیم میں پیدا ہوئی، اور مال فئے میں اختلاف ہی کی وجہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنا حصہ رسول اللہ ﷺ کے ترکہ سے طلب کیا تھا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ:

﴿مَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾[الحشر:٧]

جو کچھ اللہ اپنے رسول کو (دوسری) بستیوں سے بطور فئے دلوادے سو وہ اللہ ہی کا حق ہے، اور رسول کا اور رسول کے عزیزوں کا، یتیموں کا، اور مسکینوں کا، اور مسافروں کا، تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے قبضہ میں نہ آجائے، تو رسول جو کچھ تمہیں دیا کریں، وہ لے لیا کرو اور جس سے روک دیں رک جایا کرو۔ اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے یہ بتایا ہے کہ جو مال بطور فئے رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا ہے اس کے وہ سارے لوگ مستحق ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہوا اور اس کا خمس مذکورہ لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کو عام اور مطلق بیان کیا ہے تاکہ سب کو

شامل ہوجائے ، چنانچہ یہ مصارف خاصہ یعنی خمس والوں پر اور مصارف عامہ یعنی مہاجرین وانصار اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں پر صرف کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کا عمل مذکورہ آیات کی تفسیر وتشریح سمجھی جائے گی۔اسی بنا پر امام احمد کی روایت کے مطابق عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: اس مال کا کوئی بھی زیادہ مستحق نہیں ہے اور خود میں بھی کسی سے زیادہ اس کا حقدار نہیں ہوں اور مسلمانوں کے ہر فرد کا اس میں حق ہے ۔سوائے غلام کے لیکن ہمارے حصے اللہ تعالی کی کتاب کی طرف سے متعین ہوئے ہیں ،جس کی تقسیم رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے فرمائی ہے۔چنانچہ اسلام میں آدمی کی قربانی اور بہادری کا اعتبار ہوگا اور اس کی قدامت کا اعتبار ہوگا ، اس کی مالداری کا اعتبار ہوگا اس کی ضرورت کا اعتبار ہوگا اللہ کی قسم !اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی میں رہنے والے چرواہے کو بھی اس میں سے حصہ ملے گا۔(۱)

جن مسلمانوں کو فئے کی آیت کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے ان ہی مسلمانوں کا خمس کی آیت کے میں بھی ذکر ہوا ہے لیکن مہاجرین اور انصار اور ان کے اتباع کو خمس کی آیت میں دخل نہیں کیونکہ وہ فئے کے مستحق بنائے گئے ہیں اور خمس پانے والوں کے دو حصے

(۱) مسند احمد: ۱/۴۲، اس کی سند ضعیف ہے۔

ہوتے ہیں، ایک خمس کا خاص حصہ، دوسرا فیئے کا عام حصہ۔اسی طرح یہ دونوں حصوں میں دخل رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فئی کو جن لوگوں میں تقسیم فرمایا،اس میں ان کی ضرورت، منفعت، قدامت اور قربانی وغیرہ کو مدنظر رکھا، اور اس کی تقسیم میں میراث، وصیت اور دوسری املاک کی تقسیم کا انداز وطریقہ کارنہیں اختیار فرمایا۔اسی طرح مال خمس کو ان کے مستحقین کو دیا جائے گا اور فیئے کو بھی صرف اسی کے حقداروں کو دیا جائے گا جس کا سورہ حشر کی آیت میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالی نے خمس اور فیئے کے مستحقین کو ایک ہی بتایا ہے، اور ان کو خاص اہمیت اور فوقیت دی ہے اور چونکہ مال غنیمت ان کے مستحقین کے ساتھ خاص ہے،اور دوسرے اس میں شریک نہیں ہو سکتے اس لئے خمس کو خمس کے مستحقین کے ساتھ مخصوص فرمادیا،اور مال فیئے چونکہ خاص نہیں ہے اس کے مستحقین کے ساتھ ساتھ مہاجرین اور انصار اور ان کے اتباع کو بھی اس میں حقدار قرار دے دیا ہے۔اس طرح سے فیئے اور خمس کے مصرف میں برابری ہوگئ۔

رسول اللہ ﷺ اپنا ذاتی حصہ اسلام کی مصالح میں خرچ کرتے تھے اور خمس کے پانچ حصوں میں سے چار حصے اس کے مستحقین میں حسب ضرورت واہمیت تقسیم فرماتے تھے۔

فصل (۹۵)

نبی کریم ﷺ کا ایفائے عہد اور قاصدوں کے ساتھ معاملہ کا طریقہ

جب مسیلمہ کذاب کے قاصد آئے اور کہنے لگے ہم مسیلمہ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر قاصد قتل کئے جاسکتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا''۔(۱)

یہ بھی ثابت ہے کہ جب قریش نے ابورافع کو اپنا قاصد بنا کر آپ کے پاس بھیجا اور ابورافع نے آپ ہی کے پاس رہ جانا چاہا اور قریش کے پاس واپس جانے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان سے فرمایا: ''میں عہد شکنی کرنا نہیں چاہتا اور نہ قاصدوں کو روک سکتا ہوں۔ (اب) تم اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ اور اگر وہ بات (اسلام) جواب تمہارے دل میں ہے قائم رہے تو واپس آجاؤ۔(۲)

احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کی پابندی کرتے ہوئے آپ نے ابو جندل کو قریش کے حوالہ کر دیا تھا۔(۳) لیکن جب عورتیں آئیں تو ان کے دینے سے آپ نے انکار کر دیا۔ چنانچہ جب ایک عورت سبیعہ اسلمی مسلمان ہو کر آئیں تو ان کا شوہر

---

(۱) ابوداود:۲۷۶۱

(۲) ابوداود:۲۷۵۸

(۳) بخاری:۲۷۳۱

واپس لینے آیا اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا﴾[الممتحنة: ١٠]

مسلمانو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آجائیں تو تم ان کے ایمان کی جانچ کرلو (یوں تو) اللہ ان کے ایمان کو بہتر جانتا ہے، پس اگر تم ان کو مومن سمجھو تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو کیونکہ یہ عورتیں نہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لئے حلال ہیں اور جو کچھ کافروں نے ان پر خرچ کیا ہے وہ ان کو ادا کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے قسم لی کہ صرف اسلام کی وجہ سے انہوں نے گھر چھوڑا ہے اور خاندان میں کسی جرم اور شوہر سے عداوت وغیرہ کی وجہ سے انہوں نے ہجرت نہیں کی ہے۔ان باتوں پر انہوں نے قسم کھالی۔آپ ﷺ نے ان کے شوہر کو ان کا مہر واپس کردیا اور اس خاتون کو واپس نہیں کیا۔(۱)

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

(۱) الإصابة لابن حجر: ۵۲۱

الخَائِنِينَ﴾[الأنفال:۵۸]

اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ (وہ عہد) ان کی طرف اسی طرح واپس کر دیں، بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جس شخص کا کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو تو اس کی کوئی گرہ نہ کھولے اور نہ بند کرے یہاں تک کہ اس کی مدت پوری کر لے یا برابری میں اس معاہدہ کو ختم کر دے''۔(۱) امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا ''مسلمانوں کی جان برابر ہے، ان کے معاہدوں کی پاسداری ان کے ہر فرد کی جانب سے ہوگی''۔(۲)

(۱) ترمذی: ۱۵۸۰، اس کی سند جید ہے۔

(۲) ابن ماجہ: ۲۶۵۹، اس کی سند حسن ہے۔

فصل (۹۶)

نبی کریم ﷺ کا غیر مسلموں کو امان اور پناہ دینے میں اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ان آدمیوں کو امان عطا فرمائی جنہیں آپ کی چچازاد بہن ام ہانی نے پناہ دی تھی۔(۱)

نیز آپ سے ثابت ہے کہ: ''آپ نے ابوالعاص بن ربیع کو امان عطا فرمائی جب آپ کی صاحبزادی زینب نے انہیں پناہ دی تھی، اور فرمایا کہ مسلمانوں کا ادنی آدمی پناہ دے سکتا ہے''۔(۲) دوسری حدیث میں یہ اضافہ ہے ''اور دور والا بھی ان کا شریک ہوگا''۔(۳)

یہ کل چار مسئلے ہیں: جن میں سے ایک یہ ہے کہ: ''مسلمان بحیثیت مجموعی ایک جسم کی طرح دوسروں کے مقابلہ میں متحد اور متفق ہیں'' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو کسی طرح کا اہم عہدہ وغیرہ نہیں دیا جاسکتا۔

حدیث کے ان لفظوں ''دور والا بھی ان کا شریک ہوگا'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر

(۱) بخاری: ۳۵۷

(۲) سلسلہ صحیحہ للألبانی: ۲۴۴۹

(۳) مسند احمد: ۲/ ۳۶۵

کوئی مسلمانوں کا لشکر اپنی طاقت وقوت کی وجہ سے فتحیاب ہو کر مال غنیمت حاصل کرے تو دوسرے دور پڑاؤ ڈالے ہوئے فوجیوں کو بھی اس میں حصہ ملے گا، کیونکہ اس میں ان کی بھی قربانیوں کا دخل ہے۔اسی طرح فئے کا وہ مال جو بیت المال میں آئے گا، اس میں بھی دور والے فوجیوں کا حصہ لگایا جائے گا، اگر چہ وہ قریب والے فوجیوں کی فتوحات کی وجہ سے حاصل ہوا ہو۔

فصل (۹۷)

نبی کریم ﷺ کا غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا طریقہ

نبی کریم ﷺ نے نجران اور ایلہ کے باشندوں سے جزیہ لیا جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے، اور اہل دومۃ الجندل سے جزیہ لیا جن میں اکثر عرب تھے، نیز مجوسیوں اور یمن کے یہودیوں سے بھی جزیہ قبول کیا لیکن عرب کے مشرکوں سے جزیہ لینا ثابت نہیں۔

امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ جزیہ سوائے مذکورہ تین گروہوں کے کسی اور سے قبول نہیں کیا جاسکتا، یعنی یہود، نصاری اور مجوس ان تین کے علاوہ جو لوگ ہیں ان سے یا اسلام قبول کیا جائے گا یا قتل کر دیئے جائیں گے۔

ایک دوسری جماعت کا قول ہے کہ جو قوم بھی جزیہ دے اسے قبول کر لیا جائے گا۔ اہل کتاب (یہود و نصاری) سے اس لئے کہ قرآن کا حکم ہے۔ مجوس سے اس لئے کہ سنت سے ثابت ہے اور دوسری قوموں سے اس لئے کہ وہ بھی ان سے ملحق مانی جائیں گی، کیونکہ مجوسی مشرک ہیں۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے اگر ان سے جزیہ لینا جائز ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام مشرکوں سے خواہ وہ مجوسی ہوں یا کوئی اور، جزیہ قبول کر لیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے بت پرستوں سے جزیہ اس لئے نہیں لیا کہ وہ سب کے سب آیت جزیہ کے نزول سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔

بعض گروہوں کے کفر کا دوسرے گروہ کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور سنگین ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، بلکہ بت پرستوں کا کفر اگر دیکھا جائے تو مجوسیوں کے مقابلہ میں ہلکا ہے اور غور کیجئے تو بت پرستوں اور آتش پرستوں کے درمیان فرق بھی کیا ہے؟ اور اگر ہے تو مجوسیوں کا کفر بت پرستوں کے مقابلہ میں زیادہ غلیظ اور سخت ہے۔ اور بت پرست توحید ربوبیت کا اقرار کرتے ہیں، وہ مانتے ہیں کہ خالق کائنات اللہ واحد کے سوا کوئی نہیں، وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا تقرب الٰہی کے لئے کرتے ہیں، انہیں خالق کائنات نہیں مانتے، نہ یہ مانتے ہیں کہ عالم کے دو خدا ہیں۔ ایک خالق خیر ہے، دوسرا خالق شر ہی، جیسا کہ مجوسی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح نہ وہ ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ شادی جائز سمجھتے ہیں بلکہ وہ بقیہ دین ابراہیمی پر قائم ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس صحیفے اور شریعت تھی، لیکن مجوسی ان کے پاس سرے سے کوئی آسمانی کتاب ہی نہیں، نہ وہ انبیاء میں سے کسی نبی کے دین کے پیروکار ہیں۔ ان کے عقائد و شرائع میں کوئی ایسا اثر نہیں پایا جاتا جس سے معلوم ہو کہ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب یا شریعت تھی جو اٹھالی گئی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اہل ہجر اور دوسرے بادشاہوں کے پاس خطوط لکھ کر انہیں اسلام یا جزیہ کی دعوت دی۔اس میں عرب اور غیر عرب کی کوئی تفریق نہیں فرمائی تھی۔

اب رہی جزیہ کی رقم کی مقدار اور تعداد تو نبی کریم ﷺ نے جب معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو حکم فرمایا کہ ''ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کی قیمت کی یمنی چادر جزیہ میں لیں''۔

بعد میں عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقدار میں اضافہ کر کے چار دینار سونے والوں پر اور چالیس درہم چاندی والوں پر سالانہ مقرر کر دیا۔یہ فرق یا اضافہ اس لئے ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اہل یمن کی معیشت کی کمزوری کا علم تھا،اور عمر رضی اللہ عنہ اہل شام کی مالداری سے واقف تھے۔

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے معاہدہ کو ختم کئے بغیر قریش کے ساتھ جنگ کو جائز قرار دیا،کیونکہ خود قریش نے عہد شکنی کرتے ہوئے اپنے ان حلیفوں کا ساتھ دیا جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حلیفوں پر حملہ کر دیا تھا اور ان پر ظلم وزیادتی کی تھی۔ایسی صورت حال میں آپ نے ان کی مدد کرنے والے قریش کو جنگجو تصور کر کے معاہدہ توڑ دیا تھا اور ان سے جنگ آزما ہوئے تھے۔

فصل (۹۸)

نبی کریم ﷺ کا نکاح کے متعلق اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ نے شادی شدہ زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ”نکاح کرو کیونکہ کثرت امت سے میں قوموں پر فخر کروں گا“۔ مزید فرمایا: ”نکاح میری سنت ہے جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے، وہ میری جماعت سے نہیں“۔

فرمایا: ”اے نوجوانو! جو تم میں نکاح کر سکتا ہے، نکاح کرے، کیونکہ نکاح نظر اور نفس دونوں کو محفوظ رکھتا ہے اور جسے اس کی قدرت نہ ہو اسے چاہیئے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ اس کے لئے ڈھال ہے“ اور فرمایا: دنیا سراسر عیش ہے اور دنیا کی سب سے بڑی عیش والی چیز صالح بیوی ہے“۔

صحیحین میں ہے کہ ”عورت سے شادی یا تو اس کے مال کی وجہ سے کی جاتی ہے، یا عزت وجاہ کی وجہ سے یا حسن وجمال کی وجہ سے یا دین کی وجہ سے، تم دیندار بیوی پا کر بازی لے جاؤ“۔

حدیث میں ہے کہ: ”آپ سے سوال کیا گیا، سب سے بہترین عورت کون سی ہے؟ فرمایا ”وہ جو اپنے شوہر کی نظر میں بھلی معلوم ہو۔ اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہو، اور

اپنے مال ونفس میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کرتی ہو،،۔آپ کا دستور تھا کہ اولاد پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرنے کی ترغیب دیتے۔فرمایا:''محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو''۔

عورت کی اجازت: یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس ثیبہ کا نکاح باطل کردیا تھا جس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف نکاح کردیا تھا۔(۱) سنن میں ہے کہ:

''ایک کنواری لڑکی کے باپ نے لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی کردی، وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے اسے اختیار دے دیا کہ چاہے تو نکاح رکھے یا رد کردے''۔(۲)

حدیث میں ہے کہ:''کنواری عورت کا نکاح بغیر اس کی اجازت کے نہ کیا جائے۔اور اس کی اجازت خاموشی ہے''۔(۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ:''یتیم لڑکی کا عقد اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد یتیمی کا اعتبار نہیں''(۴) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم

---

(۱) بخاری:۵۱۳۸

(۲) ابوداود:۲۰۹۶، اس کی سند جید ہے۔

(۳) بخاری:۵۱۳۶ ومسلم:۱۴۱۹

(۴) ابوداود:۲۸۷۳

لڑکی کا نکاح جائز ہے، اسی کا قرآن سے بھی پتہ چلتا ہے۔

ولی کی اجازت: سنن میں مذکور ہے: (ولی کے بغیر نکاح نہیں)(۱) اور اسی میں مذکور ہے: (کوئی عورت اپنا نکاح خود نہ کرلے اس لئے کہ زانیہ عورت اپنا نکاح خود کرلیتی ہے)(۲) اور کسی عورت کا نکاح دو ولی نے الگ الگ جگہوں پر کروادیا تو رسول اللہ ﷺ نے پہلے ولی کے حق میں فیصلہ کیا، ایک آدمی نے بغیر مہر متعین کئے ایک عورت سے نکاح کرلیا اور اس سے خلوت سے پہلے ہی وہ انتقال کرگیا، آپ نے فیصلہ فرمایا کہ اس عورت کو اس کے خاندان کی خواتین کا مہر دیا جائے اور اس میں کمی بیشی نہ کی جائے اور وہ اس کی میراث پائے گی اور اس پر چار مہینے اور دس دن کی عدت ہوگی۔(۳) اور ترمذی کی روایت ہے کہ آپ نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا فلاں عورت کے ساتھ میں تمہارا نکاح کردوں؟ اس نے حامی بھری تو آپ نے عورت سے پوچھا کہ فلاں شخص سے نکاح کرنے کے لئے کیا تم راضی ہو؟ اس کے ہاں کہنے پر آپ نے ان دونوں کا نکاح کردیا، اس نے کوئی مہر متعین نہیں کیا اور مباشرت کرلی اور پھر انتقال کرگیا تو آپ نے اس کے خیبر کا حصہ بطور مہر اس عورت کو دے دیا۔(۴)

(۱) ترمذی: ۱۱۰۱، یہ حدیث اپنے شواہد کے ساتھ قوی ہے۔

(۲) ابن ماجہ: ۱۸۸۲، یہ ضعیف ہے۔

(۳) ابوداود: ۲۱۱۴، اس کی سند حسن ہے۔

(۴) ابوداود: ۲۱۱۷

مذکورہ احادیث سے درج ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں:

۱-بغیر مہر کی تعیین کے نکاح جائز ہے۔

۲-بغیر مہر مقرر کیئے ہوئے صحبت وخلوت جائز ہے۔

۳-مہر مثل کا تعین موت سے بھی ہوگا خواہ دخول ہو یا نہ ہو۔

۴-وفات کے بعد عدت میں بیٹھنا ضروری ہے، خواہ دخول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یہی ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ اور علماء عراق کا مسلک ہے۔

۵-طرفین کی جانب سے ایک ہی شخص ولی بن سکتا ہے اور صرف یہ کہنا کافی ہے کہ میں فلاں مرد کا فلاں عورت سے نکاح کر دیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے چار سے زائد بیویاں رکھنے والوں کو جب وہ اسلام لے آئے حکم فرمایا کہ ان میں سے صرف چار عورتوں کا انتخاب کرلیں اور بقیہ کو چھوڑ دیں۔اسی طرح ایک شخص اسلام لایا اور اس کے تصرف میں دو بہنیں تھیں۔اس سے آپ نے فرمایا کہ دونوں میں سے ایک کو جسے چاہو رکھ لو اور دوسری کو علیحدہ کردو۔

ان دونوں روایتوں سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ حالت کفر وشرک کا نکاح صحیح ہے، مسلمان ہونے والے شخص کو اختیار ہے کہ ان بیویوں میں سے کسی کو بھی اختیار کرلے چاہے وہ پہلی ہو یا بعد کی ہو اور یہی جمہور کا قول ہے۔

امام ترمذی نے حدیث کو ذکر کر کے حسن کہا ہے جس میں یہ ہے کہ: ”جب کوئی غلام اپنے

آقا کی مرضی کے بغیر شادی کرلے تو وہ بدکردار ہے"۔

" وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَأَحْكَمُ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ"

مختصرزادالمعاد

تالیف

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوھاب

رحمه الله تعالى

باللغة الأردية